"وہ ہمارا مسئلہ ہے، تمہارا نہیں۔" اس لڑکے نے اس سے کہا اور پھر آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں سے گلاسز کھینچ لیے۔

"اپنے جاگرز اُتار دو۔" سالار نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"جاگرز کس لئے؟" اس بار اس لڑکے نے جواب دینے کے بجائے پوری قوت سے ایک تھپڑ سالار کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ چند لمحوں کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔

"دوبارہ کوئی سوال مت کرنا، جاگرز اتار دو۔"

سالار خشمگیں نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ دوسرے لڑکے نے اس پر تانے ہوئے ریوالور کے چیمبر کو ایک بار جتانے والے انداز میں حرکت دی۔ پہلے لڑکے نے ایک اور تھپڑ اس بار سالار کے دوسرے گال پر دے مارا۔

"اب دیکھو اس طرح جاگرز اتار دو۔" اس نے تنخی سے کہا۔ سالار نے اس بار اس کی طرف دیکھے بغیر نیچے جھک کر آہستہ آہستہ اپنے دونوں جاگرز اتار دیئے۔ اب اس کے پیروں میں صرف جرابیں رہ گئی تھیں۔

"اپنی شرٹ اُتار دو۔" سالار ایک بار پھر اعتراض کرنا چاہتا تھا مگر وہ دوبارہ تھپڑ کھانا نہیں چاہتا تھا۔ اگر ان دونوں کے پاس ریوالور نہ ہوتے تو وہ جسمانی طور پر ان سے بہت بہتر تھا اور یقیناً اس وقت ان کی ٹھکائی کر رہا ہوتا، مگر ان کے پاس ریوالورز کی موجودگی نے یک دم ہی اسے ان کے سامنے بے بس کر دیا تھا۔ اس نے اپنی شرٹ اُتار کر اس لڑکے کی طرف بڑھائی۔

"نیچے پھینکو۔" اس لڑکے نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ سالار نے شرٹ نیچے پھینک دی۔ اس لڑکے نے اپنے بائیں ہاتھ کو جیب میں ڈال کر کوئی چیز نکالی۔ وہ پلاسٹک کی باریک ڈوری کا ایک گچھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی سالار کی سمجھ میں آگیا کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بے اختیار پریشان ہوا، شام ہو رہی تھی، کچھ ہی دیر میں وہاں اندھیرا چھا جاتا اور وہ وہاں سے رہائی کس طرح حاصل کرتا۔

"دیکھو، مجھے باندھو مت، میں کسی کو پتہ نہیں بتاؤں گا۔ تم میرا بیگ اور میری کار لے جاؤ۔" اس نے اس بار مدافعانہ انداز میں کہا۔

اس لڑکے نے کچھ بھی کہے بغیر پوری قوت سے اس کے پیٹ میں ایک گھونسہ مارا۔ سالار درد سے دہرا ہو گیا۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی تھی۔

"ہمیں کوئی مشورہ نہیں۔"

اس لڑکے نے جیسے اسے یاد کروایا اور زور سے ایک طرف دھکیلا۔ درد سے بلبلاتے ہوئے سالار نے اندھوں کی طرح اس کی پیروی کی۔ ایک درخت کے تنے کے ساتھ بٹھا کر اس لڑکے نے

بڑی مہارت کے ساتھ اس کے دونوں بازوؤں کو پیچھے سے تنے کے پیچھے لے جا کر اس کی کلائیوں پر وہ ڈوری لپیٹنا شروع کر دی۔ دوسرا لڑکا سالار سے ذرا فاصلے پر اطمینان سے ادھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے سالار پر ریوالور تانے رہا۔

اس کے ہاتھوں کو اچھی طرح باندھنے کے بعد اس لڑکے نے سامنے آکر اس کے پیروں کی جرابیں اُتاریں اور پھر فرسٹ ایڈ کٹ میں موجود قینچی سے اس نے سالار کی شرٹ کی پٹیاں کاٹنی شروع کر دیں۔ ان میں سے کچھ پٹیوں کو اس نے ایک بار پھر بڑی مہارت کے ساتھ اس کے ٹخنوں کے گرد لپیٹ کر گرہ لگا دی پھر اس نے ٹشو کا پیکٹ کھولا اور اس میں موجود سارے ٹشو باہر نکال لئے۔

"منہ کھولو۔" سالار جانتا تھا، وہ اب کیا کرنے والا ہے۔ وہ جتنی گالیاں اسے دل میں دے سکتا تھا اس وقت دے رہا تھا۔ اس لڑکے نے یکے بعد دیگرے وہ سارے ٹشو اس کے منہ میں ٹھونس دیئے اور پھر شرٹ کی واحد بچ جانے والی پٹی کو گھوڑے کی لگام کی طرح اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے درخت کے تنے کے پیچھے اسے باندھ دیا۔

دوسرا لڑکا اب اطمینان سے بیگ بند کر رہا تھا، پھر چند منٹوں کے بعد وہ دونوں وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ ان کے وہاں سے جاتے ہی سالار نے اپنے آپ کو آزاد کرنے کی کوشش شروع کر دی، مگر جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ اس لڑکے نے بڑی مہارت کے ساتھ اسے باندھا تھا، وہ صرف ہلنے جلنے کی کوشش سے خود کو آزاد نہیں کر سکتا تھا، نہ ہی ڈوری ڈھیلی کر سکتا تھا۔ وہ ڈوری اس کے حرکت کرنے پر اس کے گوشت کے اندر دھنستی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی حالت اس وقت بے حد خراب ہو رہی تھی۔ وہ نہ کسی کو آواز دے سکتا تھا نہ کسی دوسرے طریقے سے خود اپنی طرف کسی کو متوجہ کر سکتا تھا۔

اس کے اردگرد قد آدم جھاڑیاں تھیں اور شام کے ڈھلتے سایوں میں ان جھاڑیوں میں اس کی طرف کسی کا متوجہ ہو جانا کوئی معجزہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے جسم پر اس وقت لباس کے نام پر صرف گھٹنوں سے کچھ نیچے تک لٹکنے والی برمودا شارٹس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا اور شام ہونے کے ساتھ ساتھ خنکی بڑھ رہی تھی۔ گھر میں کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ہائکنگ کے لئے یہاں آیا ہوا ہے اور جب گھر نہ پہنچنے پر اس کی تلاش شروع ہوگی تب بھی یہاں اس تاریکی میں درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان بندھے ہوئے اس کے وجود تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

آدھ گھنٹے کی جدوجہد کے بعد جب اپنے پیروں کے گرد موجود پٹیوں کو ڈھیلا کرنے اور پھر انہیں کھولنے میں کامیاب ہوا، اس وقت سورج مکمل غروب ہو چکا تھا اگر چاند نہ نکلا ہوتا تو شاید وہ اپنے ہاتھ پاؤں اور اردگرد کے ماحول کو بھی نہ دیکھ پاتا۔ اِکا دُکا گزرنے والی گاڑیوں اور لوگوں کا شور اب نہ

ہونے کے برابر تھا۔ اس کے ارد گرد جھینگروں کی آوازیں گونج رہی تھیں اور وہ گردن سے کمر تک اپنی پشت پر درخت کے تنے کی وجہ سے آنے والی رگڑ اور خراشوں کو بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔ درخت کے دوسری طرف اس کے ہاتھوں کی کلائیوں میں موجود ڈوری اب اس کے گوشت میں اتری ہوئی تھی۔ وہ ہاتھوں کو مزید حرکت دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ کلائیوں سے اٹھتی ٹیسیں برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔

اس کے منہ کے اندر موجود ٹشوز اب گل چکے تھے اور ان کے گلنے کی وجہ سے وہ منہ میں لگام کی طرح کسی ہوئی پٹی کو حرکت دینے لگا تھا مگر وہ منہ سے آواز نکالنے میں اب بھی بری طرح ناکام تھا کیونکہ وہ ان گلے ہوئے ٹشوز کو نہ نگل سکتا تھا، نہ اگل سکتا تھا۔ وہ اتنے زیادہ تھے کہ وہ انہیں چیونگم کی طرح چبانے میں بھی ناکام تھا۔

اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو رہی تھی۔ وہ صبح تک اس حالت میں وہاں یقیناً ٹھٹھر کر مر جاتا اگر خوف یا کسی زہریلے کیڑے کے کاٹنے سے نہ مرتا تو۔ اس کے جسم پر اب چھوٹے چھوٹے کیڑے رینگ رہے تھے اور بار بار وہ اسے کاٹ رہے تھے۔ وہ اپنی برہنہ ٹانگوں پر چلنے اور کاٹنے والے کیڑوں کو جھٹک رہا تھا مگر باقی جسم پر رینگنے والے کیڑوں کو جھٹکنے میں ناکام تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ ان چھوٹے کیڑوں کے بعد اسے اور کن کیڑوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور اگر وہاں بچھو اور سانپ ہوئے تو

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی حالت مزید خراب ہو رہی تھی۔ "آخر یہ سب میرے ساتھ کیوں ہوا ہے؟ آخر میں نے کیا کیا ہے؟" وہ بے چارگی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ "اور میں یہاں مر گیا تو ؟ تو میری تو لاش تک دوبارہ کسی کو نہیں ملے گی۔ کیڑے مکوڑے اور جانور مجھے کھا جائیں گے۔"

اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ ایک عجیب طرح کے خوف نے اسے اپنی گرفت میں لیا۔ تو کیا میں اس طرح مروں گا، یہاں اس حالت میں بے لباس بے نشان گمراہوں کو پتا تک نہیں ہوگا میرے بارے میں۔ کیا میرا انجام یہ ہونا ہے اس کے دل کی دھڑکن رکنے لگی۔ اسے اپنی موت سے یک دم خوف آیا اتنا خوف کہ اسے سانس لینا مشکل لگنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے موت اس کے سامنے اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ہو۔ اس کے انتظار میں۔ یہ دیکھنے کہ وہ کس طرح سسک سسک کر مرتا ہے۔

وہ درد کی پروا کئے بغیر ایک بار پھر اپنی کلائیوں کی ڈوری کو توڑنے یا ڈھیلی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے بازو شل ہونے لگے۔

چند منٹ بعد اس نے ایک بار پھر اپنی جدوجہد چھوڑ دی اور اس وقت اسے احساس ہوا کہ اس کے منہ کی پٹی ڈھیلی ہو گئی تھی، وہ گردن کو ہلاتے ہوئے اسے منہ سے نکال سکتا تھا۔ اس کے بعد اس نے

ٹشوز نکال دیئے تھے۔ اگلے کئی منٹ وہ گہرے سانس لیتا رہا پھر وہ بلند آواز میں اپنی مدد کے لئے آوازیں دینے لگا۔ اتنی بلند آواز میں جتنی وہ کوشش کر سکتا تھا۔

اس کا انداز بالکل ہذیانی تھا۔ آدھے گھنٹے تک مسلسل آوازیں دیتے رہنے کے بعد اس کی ہمت اور گلا دونوں جواب دے گئے۔ اس کا سانس پھول رہا تھا، یوں جیسے وہ کئی میل دوڑتا رہا ہو مگر اب بھی کوئی اس کی مدد کے لئے نہیں آیا تھا۔ کلائی کے زخم اب اس کے لئے ناقابل برداشت ہو رہے تھے اور کیڑے اب اس کے چہرے اور گردن پر بھی کاٹ رہے تھے۔ وہ نہیں جانتا یک دم اسے کیا ہوا۔ بس وہ بلند آواز میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ زندگی میں پہلی بار بری طرح رو رہا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار اسے اپنی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا اور اس وقت درخت کے اس تنے کے ساتھ بندھے سسکتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ مرنا نہیں چاہتا ہے۔ وہ موت سے اسی طرح خوفزدہ ہو رہا تھا، جس طرح نیو ہیون میں ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتا وہ کتنی دیر اسی طرح بے بسی کے عالم میں بلند آواز میں روتا رہا پھر اس کے آنسو خشک ہونے لگے۔ شاید وہ اتنا تھک چکا تھا کہ اب رونا بھی اس کے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ نڈھال سا ہو کر اس نے درخت کے تنے سے سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے کندھوں اور بازوؤں میں اتنا درد ہو رہا تھا کہ اسے لگ رہا تھا وہ کچھ دیر میں مفلوج ہو جائیں گے پھر وہ کبھی انہیں حرکت نہیں دے سکے گا۔

"میں نے کبھی کسی کے ساتھ اس طرح نہیں کیا پھر میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہوا۔" اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہنے لگے۔

"سالار! میرے لئے پہلے ہی بہت پرابلمز ہیں، تم اس میں اضافہ نہ کرو، میری زندگی بہت مشکل ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اور مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ کم از کم تم تو میری پوزیشن کو سمجھو، میری مشکلات کو مت بڑھاؤ۔" درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے سالار نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ نیچے بہت نیچے، بہت دور اسلام آباد کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

"میں تمہارے مسائل میں اضافہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں؟ میں ؟ مائی ڈیئر امامہ! میں تو تمہاری ہمدردی میں گھل رہا ہوں۔ تمہارے مسائل ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم خود سوچو، میرے ساتھ رہ کر تم کتنی اچھی اور محفوظ زندگی گزار سکتی ہو۔" سالار نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔

"سالار! مجھے طلاق دے دو۔" بھرائی ہوئی لجاجت آمیز آواز۔

"سویٹ ہارٹ! تم کورٹ میں جا کر لے لو۔ جیسا کہ تم کہہ چکی ہو۔"

وہ اب چپ چاپ خود سے بہت دور نظر آنے والی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی اس کے سامنے جیسے آئینہ لے کر کھڑا ہو گیا تھا جس میں وہ اپنا عکس دیکھ سکتا تھا اور اپنے ساتھ ساتھ کسی اور کا بھی۔

"میں نے امامہ کے ساتھ صرف مذاق کیا تھا۔" وہ بڑبڑایا۔

"میں ... میں اسے کوئی تکلیف پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔" اسے اپنے الفاظ کھوکھلے لگے۔

وہ پتا نہیں کس کو وضاحت دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ اسی طرح اسلام آباد کی روشنیوں کو دیکھتا رہا پھر اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔

"میں مانتا ہوں، مجھ سے کچھ غلطیاں ہو گئیں۔"

اس بار اس کی آواز بھرائی ہوئی سرگوشی تھی۔ "میں نے جانتے بوجھتے اس کے لئے مسائل کھڑے کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے دھوکا دیا مگر مجھ سے غلطی ہو گئی اور مجھے پچھتاوا ابھی ہے۔ میں جانتا ہوں میرے طلاق نہ دینے سے اور جلال کے بارے میں جھوٹ بول دینے سے اسے بہت زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ مجھے واقعی پچھتاوا ہے اس سب کے لئے مگر اس کے علاوہ تو میں نے کسی اور کو کبھی دھوکا نہیں دیا، کسی کے لئے پریشانی کھڑی نہیں کی۔"

وہ ایک بار پھر رونے لگا۔

"میرے خدا ... اگر ایک بار میں یہاں سے بچ گیا، میں یہاں سے نکل گیا تو میں امامہ کو ڈھونڈوں گا، میں اسے طلاق دے دوں گا، میں دوبارہ کبھی اسے تنگ نہیں کروں گا۔ میں جلال کے بارے میں بھی اسے سچ بتا دوں گا۔ بس ایک بار آپ مجھے یہاں سے جانے دیں۔"

وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ امامہ نے اس کے طلاق نہ دینے سے انکار پر کیا محسوس کیا ہوگا۔ شاید اسی طرح اس نے بھی اپنے ہاتھ بندھے ہوئے محسوس کئے ہوں گے جس طرح وہ کر رہا تھا۔

وہاں بیٹھے ہوئے پہلی بار وہ امامہ کی بے بسی، خوف اور تکلیف کو محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے جلال انصر کی شادی کے بارے میں اس سے جھوٹ بولا تھا اور اس کے جھوٹ پر امامہ کے چہرے کا تاثر اسے اب بھی یاد تھا۔ اس وقت وہ اس تاثر سے بے حد محظوظ ہوا تھا۔ وہ اسلام آباد سے لاہور تک تقریباً پوری رات روتی رہی تھی اور وہ بے حد مسرور تھا۔

وہ اس وقت اس کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ اس اندھیری رات میں اس گاڑی میں سفر کرتے ہوئے اسے اپنے آگے اور پیچھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہوگا۔ واحد پناہ گاہ، جس کو وہ سوچ کر نکلی تھی وہ جلال انصر کا گھر تھا اور سالار سکندر نے اسے وہاں جانے نہیں دیا تھا۔ وہ رات کے اس پہر وہاں اعصاب میں اترنے والی تاریکی میں بیٹھ کر ان اندیشوں اور خوف کا اندازہ کر سکتا تھا جو اس رات امامہ کو ڈرا رہے تھے۔

"مجھے افسوس ہے، مجھے واقعی افسوس ہے لیکن ... لیکن میں کیا کر سکتا ہوں۔ اگر ... اگر وہ مجھے

دوبارہ ملی تو میں اس سے ایکسکیوز کر لوں گا، میں جس حد تک ممکن ہوا اس کی مدد کروں گا مگر اس وقت ... اس وقت تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر ... اگر میں نے کبھی ... کبھی کوئی نیکی کی ہے تو مجھے اس کے بدلے یہاں سے رہائی دلا دے۔ او گاڈ پلیز ... پلیز ... پلیز۔" اس نے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اپنی نیکیاں گننے کی کوشش کی جنہیں وہ گنوا سکے۔ اس وقت پہلی بار اس پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ اس نے زندگی میں اب تک کوئی نیکی نہیں کی تھی۔ کوئی نیکی جسے وہ اس وقت اللہ کے سامنے پیش کر کے اس کے بدلے میں رہائی مانگتا۔ ایک اور خوف نے پھر اس کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی خیرات نہیں کی تھی، وہ اس پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ وہ ہوٹلز اور ریسٹورنٹس میں ٹپ خوش دلی سے دیا کرتا تھا، مگر کبھی کسی فقیر کے ہاتھ پھیلانے پر اس نے اسے کچھ نہیں دیا تھا۔

اسکول کالج میں مختلف کاموں کے لئے جب فنڈ جمع ہوتے تب بھی وہ ٹکٹس خریدنے یا بیچنے سے صاف انکار کر دیتا۔

"میں چیریٹی پر یقین نہیں کرتا۔" اس کی زبان پر روکھے انداز میں صرف ایک ہی جملہ ہوتا تھا۔

"میرے پاس اتنی فالتو رقم نہیں ہے کہ میں ہر جگہ لٹاتا پھروں۔" اس کا یہ رویہ نیو ہیون میں بھی جاری رہا تھا۔ یہ سب صرف چیریٹی تک ہی محدود نہیں تھا۔ وہ چیریٹی کے علاوہ بھی کسی کی مدد کرنے پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اسے کوئی ایسا لمحہ یاد نہیں آیا، جب اس نے کسی کی مدد کی ہو، صرف امامہ کی مدد کی تھی اور اس مدد کے بعد اس نے جو کچھ کیا تھا اس کے بعد وہ اسے نیکی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ عبادت کرنے کا بھی عادی نہیں تھا۔ شاید بچپن میں اس نے چند بار سکندر کے ساتھ عید کی نماز پڑھی ہو مگر وہ بھی عبادت سے زیادہ ایک رسم تھی۔ اسے نیو ہیون میں وہ رات یاد آئی جب وہ عشاء کی نماز ادھوری چھوڑ کر بھاگ آیا تھا اور اس کے ساتھ اسے اس hooker کو دیئے ہوئے ۵۰ ڈالر بھی یاد آئے۔ شاید وہ واحد موقع تھا جب اسے کسی پر ترس آیا تھا۔ وہ مستقل اپنے ذہن کو اپنی کسی نیکی کی تلاش میں کھنگالتا رہا مگر ناکام رہا۔

اور پھر اسے اپنے گناہ یاد آنے لگے۔ کیا تھا جو وہ نہیں کر چکا تھا۔ اس کے آنسو، گڑگڑانا، رونا سب کچھ یک دم ختم ہو گیا۔ حساب کتاب بالکل صاف تھا۔ وہ اگر آج اس حالت میں مر جاتا تو اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہوتی۔ بائیس سال کی عمر میں وہاں بیٹھے کئی گھنٹے صرف کرنے پر بھی جس شخص کو اپنی کوئی نیکی یاد نہ آئے جبکہ اس شخص کا آئی کیو لیول ۱۵۰+ ہو اور اس کی میموری فوٹو گرافک ... وہ شخص اللہ سے یہ چاہتا ہو کہ اسے اس کی کسی نیکی کے بدلے اس آزمائش سے رہا کر دیا جائے جس میں وہ پھنس گیا ہے۔

"What is next to ecstasy?"

اس نے نیو ہیون میں کوکین پیتے ہوئے ایک بار اپنے دوست سے پوچھا تھا، وہ بھی کوکین لے رہا تھا۔

"more ecstasy" اس نے کہا تھا۔ اس نے کوکین لیتے ہوئے اسے دیکھا۔

There is no end to ecstasy. It is preceded by pleasure and followed by more ecstasy.

وہ نشے کی حالت میں اس سے کہہ رہا تھا۔ سالار مطمئن نہیں ہوا۔

No, it does end. What happens when it ends? When it really ends?

اس کے دوست نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

You know it yourself, don't you? You have been through it off and on.

سالار جواب دینے کے بجائے دوبارہ کوکین لینے لگا تھا۔

اس کی کلائیوں کے گوشت میں اترتی ڈوری اسے اب جواب دے رہی تھی۔ "pain" (درد)۔

"What is next to pain?"

اس نے مضحکہ خیز لہجے میں اس رات امامہ ہاشم سے پوچھا تھا۔

"Nothingness."

رسی نما کوئی چیز لہراتے ہوئے اس کے جسم پر گری تھی۔ اس کے سر، چہرے، گردن، سینے، پیٹ اور وہاں سے تیز رفتاری سے رینگتی ہوئی اتر گئی۔ سالار نے کانپتے جسم کے ساتھ اپنی چیخ روکی تھی۔ وہ کوئی سانپ تھا جو اسے کاٹے بغیر چلا گیا تھا۔ اس کا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔ اس کا جسم اب جاڑے کے مریض کی طرح تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"Nothingness" آواز بالکل صاف تھی۔

"And what is next to nothingness?"

تحقیر آمیز آواز اور مسکراہٹ اس کی تھی۔

"Hell."

اس نے یہی کہا تھا۔ وہ پچھلے آٹھ گھنٹے سے وہاں بندھا ہوا تھا۔ اس ویرانے، اس تاریکی، اس وحشت ناک تنہائی میں۔ وہ پورا ایک گھنٹہ حلق کے بل پوری قوت سے مدد کے لئے پکارتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا حلق آواز نکالنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

وہ Nothingness سے Hell ان دونوں کے بیچ کہیں معلق تھا یا شاید Nothingness میں داخل ہونے والا تھا اور Hell تک پہنچنے والا تھا۔

"تمہیں خوف نہیں آتا یہ پوچھتے ہوئے کہ Hell کے بعد آگے کیا آئے گا؟ دوزخ کے بعد آگے کیا آ سکتا ہے؟ انسان کے معتوب اور مغضوب ہو جانے کے بعد باقی بچتا ہی کیا ہے جسے جاننے کا تمہیں اشتیاق ہے؟"

سالار نے وحشت بھری نظروں سے ارد گرد دیکھا۔ وہ کیا تھا، قبر یا دوزخ یا زندگی میں اس کا ایک منظر...... بھوک، پیاس، بے بسی، بے یاری و مددگاری، جسم پر چلتے کیڑے جنہیں وہ خود کو کاٹنے سے روک تک نہیں پا رہا تھا۔ مفلوج ہوتے ہوئے ہاتھ پاؤں، پشت اور ہاتھوں کی کلائیوں پر لمحہ بہ لمحہ بڑھتے ہوئے زخم خوف تھا یا دہشت، پتا نہیں کیا تھا مگر وہ بلند آواز میں پاگلوں کی طرح چیخیں مارنے لگا تھا۔ اس کی چیخیں دور دور تک فضا میں گونج رہی تھیں۔ ہذیانی اور جنونی انداز میں بلند کی جانے والی بے مقصد اور خوفناک چیخیں۔ اس نے زندگی میں اس طرح کا خوف کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ کبھی بھی نہیں۔ اسے اپنے ارد گرد عجیب سے بھوت چلتے پھرتے نظر آنے لگے تھے۔

اسے لگ رہا تھا اس کے دماغ کی رگ پھٹنے والی ہے یا پھر نروس بریک ڈاؤن، پھر اس کی چیخیں آہستہ آہستہ دم توڑتی گئیں۔ اس کا گلا پھر بند ہو گیا تھا۔ اب صرف سرسراہٹیں تھیں جو اسے سنائی دے رہی تھیں۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ اب مر رہا ہے۔ اس کا ہارٹ فیل ہو رہا ہے یا پھر وہ اپنا ذہنی توازن کھو دینے والا ہے اور اسی وقت اچانک تنے کے پیچھے بندھی ہوئی کلائیوں کی ڈوری ڈھیلی ہو گئی۔ ہوش و حواس کھوتے ہوئے اس کے اعصاب نے ایک بار پھر جھٹکا لیا۔

اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ ڈوری اور ڈھیلی ہوتی گئی۔ شاید مسلسل تنے کی رگڑ لگتے لگتے درمیان سے ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے ہاتھوں کو کچھ اور حرکت دی اور تب اسے احساس ہوا کہ وہ درخت کے تنے سے آزاد ہو چکا تھا۔

اس نے بے یقینی کے عالم میں اپنے بازوؤں کو سیدھا کیا۔ درد کی تیز لہریں اس کے بازوؤں سے گزریں۔

"کیا میں، میں بچ گیا ہوں؟"

اس نے بے یقینی سے اندھیرے میں اپنے بازوؤں اور ہاتھوں کے ہیولے دیکھتے ہوئے سوچا۔

"کیوں؟ کس لئے؟" ماؤف ہوتے ہوئے ذہن کے ساتھ اس نے اپنی گردن کے گرد موجود اس پٹی کو اتارا جو پہلے اس کے منہ کے گرد باندھی گئی تھی، بازوؤں کو دی گئی معمولی حرکت سے اس کے منہ سے کراہ نکلی تھی۔ اس کے بازوؤں میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ اتنی تکلیف کہ اسے لگ رہا تھا وہ دوبارہ کبھی اپنے بازو استعمال نہیں کر سکے گا۔ اس کی ٹانگیں بھی سن ہو رہی تھیں۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ وہ لڑکھڑا کر بازوؤں کے بل زمین پر گرا۔ ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ اس نے دوسری کوشش ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل کی۔ اس بار وہ کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ دونوں لڑکے اس کے جاگرز اور گھڑی بھی لے جا چکے تھے۔ اس کی جرابیں وہیں کہیں پڑی تھیں۔ وہ اندھیرے میں انہیں ٹٹول کر پہن سکتا تھا مگر بازوؤں اور ہاتھوں کو استعمال میں لانا پڑتا اور وہ

اس وقت یہ کام کرنے کے قابل نہیں تھا نہ جسمانی طور پر، نہ ذہنی طور پر۔

وہ اس وقت صرف وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ہر قیمت پر، اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا۔ جھاڑیوں سے اُلجھتا خراشیں لیتا، وہ کسی نہ کسی طرح اس راستے پر آ گیا تھا جس راستے سے وہ وہ لوگ اسے وہاں لے آئے تھے اور پھر ننگے پاؤں اس نے پیچ کا سفر طے کیا۔ اس کے پیروں میں پتھر اور کنکریاں چبھ رہی تھیں مگر وہ جس ذہنی اور جسمانی اذیت کا شکار تھا اس کے سامنے یہ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کیا وقت ہوا تھا مگر اسے یہ اندازہ تھا کہ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ اسے نیچے آنے میں کتنا وقت لگا اور اس نے یہ سفر کس طرح طے کیا۔ وہ نہیں جانتا اسے صرف یہ یاد تھا کہ وہ پورے راستے بلند آواز سے روتا رہا تھا۔

اسلام آباد کی سڑکوں پر آ کر اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں بھی اس نے اپنے حلیے کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی تھمیں رکنے کی خواہش کی نہ ہی کسی کی مدد لینے کی۔ وہ اسی طرح روتا ہوا لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اس سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر چلتا رہا۔

وہ پولیس کی ایک پٹرولنگ کار تھی جس نے سب سے پہلے اسے دیکھا اور اس کے پاس آ کر رک گئی اندر موجود کانسٹیبل اس کے سامنے نیچے اُترے اور اسے روک لیا۔ وہ پہلی بار ہوش و حواس میں آیا تھا مگر اس وقت بھی وہ اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں پر قابو پانے میں ناکام ہو رہا تھا وہ لوگ اب اس سے کچھ پوچھ رہے تھے، مگر وہ کیا جواب دیتا۔

اگلے پندرہ منٹ میں وہ ایک ہاسپٹل میں تھا جہاں اسے فرسٹ ایڈ دی گئی۔ وہ اس سے اس کے گھر کا پتا پوچھ رہے تھے مگر اس کا گلا بند تھا۔ وہ انہیں کچھ بھی بتانے کے قابل نہیں تھا۔ سوجے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ اس نے ایک کاغذ پر اپنے گھر کا فون نمبر اور ایڈریس گھسیٹ دیا۔

"ابھی اور کتنی دیر اسے یہاں رکھنا پڑے گا؟"

"زیادہ دیر نہیں جیسے ہی ہوش آتا ہے ہم دوبارہ چیک اپ کریں گے، پھر ڈسچارج کر دیں گے زیادہ شدید قسم کی انجریز نہیں ہیں۔ بس گھر میں کچھ دن تک مکمل طور پر ریسٹ کرنا پڑے گا۔"

اس کا ذہن لاشعور سے شعور کا سفر طے کر رہا تھا۔ پہلے جو صرف بے معنی آوازیں تھیں۔ اب وہ انہیں مفہوم پہنا رہا تھا۔ آوازوں کو پہچان رہا تھا ان میں سے ایک آواز سکندر عثمان کی تھی۔ دوسری یقیناً کسی ڈاکٹر کی۔ سالار نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں یک دم چندھیا گئی تھیں۔ کمرے میں بہت تیز روشنی تھی یا کم از کم اسے ایسا ہی لگا تھا وہ ان کے فیملی ڈاکٹر کا پرائیویٹ کلینک تھا۔ وہ ایک بار پہلے بھی یہاں ایسے ہی ایک کمرے میں رہ چکا تھا اور یہ پہچاننے کے لئے ایک نظر ہی کافی تھی اس کا ذہن بالکل صحیح کام کر رہا تھا۔

جسم کے مختلف حصوں میں ہونے والے درد کا احساس اسے پھر ہونے لگا تھا۔ اس کے باوجود کہ اب وہ ایک بہت نرم اور آرام دہ بستر میں تھا۔

اس کے جسم پر وہ لباس نہیں تھا جو اس نے اس سرکاری ہاسپٹل میں پہنا تھا، جہاں اسے لے جایا گیا تھا۔ وہ ایک اور لباس میں ملبوس تھا اور یقیناً اس کے جسم کو پانی کی مدد سے صاف بھی کیا گیا تھا کیونکہ اسے آدھے بازوؤں والی شرٹ سے جھانکتے اپنے بازوؤں پر کہیں بھی مٹی یا گرد نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کی کلائیوں کے گرد پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور اس کے بازوؤں پر چھوٹے چھوٹے بہت سے نشانات تھے۔ بازو اور ہاتھ سوجے ہوئے تھے۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ ایسے ہی بہت سے نشانات اس کے چہرے اور جسم کے دوسرے حصوں پر بھی ہوں گے۔ اسے اپنی ایک آنکھ بھی سوجی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور اس کے جبڑے بھی دکھ رہے تھے مگر اس سے بھی زیادہ برا حال گلے کا تھا۔ اس کے بازو میں ایک ڈرپ لگی ہوئی تھی جو اب تقریباً ختم ہونے والی تھی۔

پہلی بار اس کو ہوش میں ڈاکٹر نے ہی دیکھا تھا۔ وہ ان کا فیملی ڈاکٹر نہیں تھا۔ شاید اس کے ساتھ کام کرنے والا کوئی اور فزیشن تھا۔ اس نے سکندر کو اس کی طرف متوجہ کیا۔

"ہوش آ گیا ہے؟" سالار نے ایک صوفے پر بیٹھی طیبہ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا مگر سکندر آگے نہیں آئے تھے۔ ڈاکٹر اب اس کے پاس آ کر اس کی نبض چیک کر رہا تھا۔

"اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

سالار جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکل سکی۔ وہ صرف منہ کھول کر رہ گیا۔ ڈاکٹر نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا، سالار نے تکیے پر رکھا ہوا اپنا سر نفی میں ہلایا۔ "بولنے کی کوشش کرو۔" ڈاکٹر شاید پہلے ہی اس کے گلے کے پرابلم کے بارے میں جانتا تھا۔ سالار نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ ڈاکٹر نے نرس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹرے سے ایک ٹارچ نما آلہ اُٹھایا۔

"منہ کھولیں۔" سالار نے دکھتے جبڑوں کے ساتھ اپنا منہ کھول دیا۔ ڈاکٹر کچھ دیر اس کے حلق کا معائنہ کرتا رہا پھر اس نے ٹارچ بند کر دی۔

"گلے کا تفصیلی چیک اپ کرنا پڑے گا۔" اس نے مڑ کر سکندر عثمان کو بتایا پھر اس نے ایک رائٹنگ پیڈ اور پین سالار کی طرف بڑھایا۔ نرس تب تک اس کے بازو میں لگی ڈرپ اُتار چکی تھی۔

"اٹھ کر بیٹھو اور بتاؤ کیا ہوا ہے۔ گلے کو؟" اسے اٹھ کر بیٹھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ نرس نے تکیہ اس کے پیچھے رکھ دیا تھا وہ رائٹنگ پیڈ ہاتھ میں لئے سوچتا رہا۔

"کیا ہوا تھا؟ گلے کو، جسم کو، دماغ کو۔" وہ کچھ بھی لکھنے کے قابل نہیں تھا۔ سوجی ہوئی انگلیوں میں پکڑے پین کو وہ دیکھتا رہا۔ اسے یاد تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اسے اپنی وہ چیخیں یاد آ رہی تھیں

جنہوں نے اسے اب بولنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ کیا لکھا جائے یہ کہ مجھے ایک پہاڑ پر ساری چیزیں چھین کر باندھ دیا گیا تھا یا پھر یہ کہ مجھے چند گھنٹوں کے لئے زندہ قبر میں اتار دیا گیا تھا تاکہ مجھے میرے سوالوں کا جواب مل جائے۔

"What is next to ecstasy?"۔

وہ سفید صاف کاغذ کو دیکھتا رہا پھر اس نے مختصر سی تحریر میں اپنے ساتھ ہونے والا واقعہ تحریر کر دیا۔ ڈاکٹر نے رائٹنگ پیڈ کھینچ کر ایک نظر ان سات آٹھ جملوں پر ڈالی اور پھر اسے سکندر عثمان کی طرف بڑھا دیا۔

"آپ کو چاہئے کہ فوری طور پر پولیس سے رابطہ کریں، تاکہ کار برآمد کی جاسکے، پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔ پتا نہیں وہ گاڑی کو کہیں سے کہاں لے جا چکے ہوں گے۔" ڈاکٹر نے ہمدردانہ انداز میں سکندر کو مشورہ دیا۔ سکندر نے رائٹنگ پیڈ پر ایک نظر ڈالی۔

"ہاں، میں پولیس سے کانٹیکٹ کرتا ہوں۔" پھر کچھ دیر ان دونوں کے درمیان اس کے چیک اپ کے سلسلے میں بات ہوتی رہی پھر ڈاکٹر نرس کے ہمراہ باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی سکندر عثمان نے ہاتھ میں پکڑا ہوا رائٹنگ پیڈ سالار کے سینے پر دے مارا۔

"یہ جھوٹ کا پلندہ اپنے پاس رکھو تم کیا سمجھتے ہو کہ اب میں تمہاری کسی بات پر اعتبار کروں گا۔ نہیں کبھی نہیں۔"

سکندر بے حد مشتعل تھے۔

"یہ بھی تمہارا کوئی نیا ایڈونچر ہوگا۔ خودکشی کی کوئی نئی کوشش۔"

وہ کہنا چاہتا تھا۔ "فار گاڈ سیک ایسا نہیں ہے۔" مگر وہ گونگوں کی طرح ان کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"میں کیا کہوں ڈاکٹر سے کہ اس کو عادت ہے ایسے تماشوں اور ایسی حرکتوں کی، یہ پیدا ہی ان کاموں کے لئے ہوا ہے۔"

سالار نے سکندر عثمان کو کبھی اس حد تک مشتعل نہیں دیکھا تھا، شاید وہ واقعی اب اس سے تنگ آ چکے تھے۔ طیبہ خاموشی سے پاس کھڑی تھیں۔

"ہر سال ایک نیا تماشا، ایک نئی مصیبت، آخر تمہیں پیدا کر کے کیا گناہ کر بیٹھے ہیں ہم۔"

سکندر عثمان کو یقین تھا یہ بھی اس کے کسی نئے ایڈونچر کا حصہ تھا جو لڑکا چار بار خود کو مارنے کی کوشش کر سکتا تھا اس کے ہاتھ پاؤں پر موجود ان زخموں کو کوئی ڈکیتی قرار نہیں دے سکتا تھا وہ بھی اس صورت میں جب اس واقعے کا کوئی گواہ نہیں تھا۔

سالار کو "شیر آیا، شیر آیا" والی کہانی یاد آئی۔ بعض کہانیاں واقعی سچی ہوتی ہیں۔ وہ بار بار جھوٹ

بول کر اب اپنا اعتبار گنوا چکا تھا۔ شاید وہ سب کچھ ہی گنوا چکا تھا۔ اپنی عزت، خود اعتمادی، غرور، فخر، ہر چیز وہ کسی پاتال میں پھینک گیا تھا۔

"کوئی نیا ڈرامہ کئے بہت دن گزر گئے تھے تمہیں تو تم نے سوچا ماں باپ کو محروم کیوں رکھوں، انہیں خوار اور ذلیل کئے بڑا عرصہ ہو گیا ہے۔ اب نئی تکلیف دینی چاہئے۔"

"ہو سکتا ہے سکندر! یہ ٹھیک کہہ رہا ہو۔ آپ پولیس کو گاڑی کے بارے میں اطلاع تو دیں۔"

اب طیبہ رائٹنگ پیڈ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنے کے بعد سکندر سے کہہ رہی تھیں۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟ کبھی آج تک ٹھیک کہا ہے اس نے۔ مجھے اس کے کہے ہوئے ایک لفظ پر بھی یقین نہیں ہے۔

تمہارا یہ بیٹا کسی دن مجھے اپنی کسی حرکت کی وجہ سے پھانسی پر چڑھا دے گا اور تم کہہ رہی ہو کہ پولیس کو اطلاع دوں، اپنا مذاق بنواؤں۔ کار کے ساتھ بھی کچھ نہ کچھ کیا ہو گا اس نے، بیچ دی ہو گی کسی کو، یا کہیں پھینک آیا ہو گا۔"

وہ اب اسے واقعی گالیاں دے رہے تھے۔ اس نے کبھی انہیں گالیاں دیتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ وہ صرف ڈانٹا کرتے تھے اور وہ ان کی ڈانٹ پر بھی مشتعل ہو جاتا تھا۔ چاروں بھائیوں میں وہ واحد تھا جو ماں باپ کی ڈانٹ سننے کا بھی روادار نہیں تھا اور اس سے بات کرتے ہوئے سکندر بہت محتاط ہوا کرتے تھے کیونکہ وہ کسی بھی بات پر مشتعل ہو جایا کرتا تھا، مگر آج پہلی دفعہ سالار کو ان کی گالیوں پر بھی غصہ نہیں آیا تھا۔

وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس نے انہیں کس حد تک زچ کر دیا ہے۔ وہ پہلی بار اس بیڈ پر بیٹھے اپنے ماں باپ کی حالت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیا چیز تھی جو انہوں نے اسے نہیں دی تھی۔ اس کے منہ سے نکلنے سے پہلے وہ اس کی فرمائش پوری کر دینے کے عادی تھے اور وہ اس کے بدلے میں انہیں کیا دیتا رہا تھا۔ کیا دے رہا تھا، ذہنی اذیت، پریشانی، تکلیف، اس کے علاوہ اس کے بہن بھائیوں میں سے کسی نے ان کے لئے کوئی پریشانی نہیں کھڑی کی تھی۔ صرف ایک وہ تھا جو......

"کسی دن تمہاری وجہ سے ہم دونوں کو خودکشی کرنی پڑے گی۔ تمہیں تب ہی سکون ملے گا، صرف تب ہی چین آئے گا تمہیں۔"

پچھلی رات اس پہاڑ پر اس طرح بندھے ہوئے اسے پہلی بار ان کی یاد آئی تھی۔ پہلی بار اسے پتا چلا تھا کہ اسے ان کی کتنی ضرورت تھی، وہ ان کے بغیر کیا کرے گا، اس کے لئے ان کے علاوہ کون پریشان ہو گا۔

اسے سکندر کے لفظوں سے زندگی میں پہلی بار کوئی بے عزتی محسوس نہیں ہو رہی تھی وہ ہمیشہ سے سکندر کے زیادہ قریب رہا تھا اور اس کے سب سے زیادہ جھگڑے بھی ان ہی کے ساتھ ہوتے رہے تھے۔

"میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں دوبارہ کبھی تمہاری شکل تک نہ دیکھوں۔ تمہیں دوبارہ وہیں پھنکوا دوں جس جگہ کے بارے میں تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"اب بس کرو سکندر۔" طیبہ نے ان کو ٹوکا۔

"میں بس کروں ــــ یہ کیوں بس نہیں کرتا، کبھی تو ترس کھا لے یہ ہم لوگوں پر اور اپنی حرکتیں چھوڑ دے۔ کیا اس پر یہ فرض کر کے اسے زمین پر اتارا گیا تھا کہ یہ ہماری زندگی عذاب بنا دے۔"

سکندر طیبہ کی بات پر مزید مشتعل ہو گئے۔

"ابھی وہ پولیس والے بیان لینے آ جائیں گے۔ جنہوں نے اسے سڑک پر پکڑا تھا۔ یہ کیا اس چیز کریں گے ان کے سامنے کہ اس بے چارے کو کسی نے لوٹ لیا ہے۔ اچھا تو یہ ہوتا کہ اس بار واقعی کوئی اسے لوٹتا اور اسے پہاڑ پر سے نیچے پھینکتا تاکہ میری جان چھوٹ جاتی۔"

سالار بے اختیار سسکنے لگا۔ سکندر اور طیبہ بھونچکا رہ گئے، وہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑے رو رہا تھا۔ وہ زندگی میں پہلی بار اسے روتا دیکھ رہے تھے اور وہ بھی ہاتھ جوڑے، وہ کیا کر رہا تھا؟ کیا چاہ رہا تھا؟ کیا ہار رہا تھا؟ سکندر عثمان بالکل ساکت تھے، طیبہ اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئیں، انہوں نے سالار کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے تھپکنے کی کوشش کی۔ وہ بچوں کی طرح ان کے ساتھ لپٹ گیا۔

اس کی ہچکی کی طرف کھڑے سکندر عثمان کو اچانک احساس ہوا کہ شاید اس بار وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ شاید اس کے ساتھ واقعی کوئی حادثہ ہوا تھا۔ وہ طیبہ کے ساتھ لپٹا ننھے بچوں کی طرح ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ طیبہ اسے چپ کرواتے کرواتے خود بھی رونے لگیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر تو کیا بڑی بڑی باتوں پر بھی رونے کا عادی نہیں تھا، پھر آج کیا ہوا تھا کہ اس کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔

اس سے دور کھڑے سکندر عثمان کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

"اگر یہ ساری رات واقعی وہاں بندھا رہا تھا تو ... ؟"

وہ ساری رات اس کے انتظار میں جاگتے رہے تھے اور بگڑتے رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ گاڑی لے کر پھر کہیں لاہور یا کہیں اور آوارہ گردی کے لئے چلا گیا ہوگا۔ انہیں تشویش ہو رہی تھی مگر وہ سالار سکندر کی حرکتوں سے واقف تھے۔ اس لئے تشویش سے زیادہ غصہ تھا اور ڈھائی تین بجے کے قریب وہ سونے کے لئے چلے گئے تھے جب انہیں فون پر پولیس کی طرف سے یہ اطلاع ملی۔

وہ ہاسپٹل پہنچے تھے اور انہوں نے اسے وہاں بہت ابتر حالت میں دیکھا تھا مگر وہ یہ یقین کرنے پر تیار نہیں تھے کہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ ہوا تھا۔ وہ جانتے تھے وہ خود کو اذیت پہنچاتا رہا تھا جو شخص اپنی کلائی کاٹ لے۔ ون وے کو توڑتے ہوئے ٹریفک کی بھیڑ میں اپنی بائیک دے مارے۔ سلیپنگ پلز لے لے۔ اپنے آپ کو باندھ کر پانی میں الٹا کود جائے۔ اس کے لئے ایک بار پھر اپنی یہ حالت کرنا کیا مشکل تھا۔

اس کا جسم کیڑوں کے کاٹنے کے نشانات سے جگہ جگہ بھرا ہوا تھا۔ بعض جگہوں پر نیلاہٹ تھی۔ اس کے پیر بھی بری طرح سے زخمی تھے۔ ہاتھوں کی کلائیوں، گردن اور پشت کا بھی یہی حال تھا اور اس کے جبڑوں پر بھی خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود سکندر عثمان کو یقین تھا کہ یہ سب کچھ اس کی اپنی کارستانی ہی ہوگی۔

شاید اس وقت وہ بولنے کے قابل ہوتا اور وضاحتیں پیش کرتا تو وہ کبھی بھی اس پر یقین نہ کرتے مگر اسے اس طرح ہچکیوں کے ساتھ روتے دیکھ کر انہیں یقین آنے لگا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا تھا۔

وہ کمرے سے باہر نکل گئے اور انہوں نے موبائل پر پولیس سے رابطہ کیا۔ ایک گھنٹے کے بعد انہیں پتا چل گیا کہ سرخ رنگ کی ایک اسپورٹس کار پہلے ہی پکڑی جا چکی ہے اور اس کے ساتھ دو لڑکے بھی۔ پولیس نے انہیں ایک معمول کی چیکنگ کے دوران لائسنس اور گاڑی کے کاغذات نہ ہونے پر گھبرا جانے پر پکڑا تھا۔ انہوں نے ابھی تک یہ نہیں بتایا تھا کہ انہوں نے گاڑی کہیں سے چھینی تھی، وہ صرف یہی کہتے رہے کہ وہ گاڑی انہیں کہیں ملی تھی اور وہ صرف شوق اور تجسس سے مجبور ہو کر چلانے لگے تھے۔ پولیس کے پاس ابھی تک کسی گاڑی کی ایف آئی آر بھی درج نہیں کروائی گئی تھی اس لئے ان کے بیان کی تصدیق مشکل ہو گئی تھی۔

مگر سکندر عثمان کی ایف آئی آر کے کچھ دیر بعد ہی انہیں کار کے بارے میں پتا چل گیا تھا۔ اب وہ صحیح معنوں میں سالار کے بارے میں تشویش کا شکار ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆

سکندر اور طیبہ سالار کو اس رات واپس نہیں لے کر آئے، وہ اس رات ہاسپٹل میں ہی رہا۔ اگلے دن اس کے جسم کا درد اور سوجن میں کافی کمی واقع ہو چکی تھی۔ وہ دونوں گیارہ بجے کے قریب اسے گھر لے آئے۔ اس سے پہلے پولیس کے دو اہلکاروں نے اس سے ایک لمبا چوڑا تحریری بیان لیا تھا۔

سکندر اور طیبہ کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پہلی بار اس نے اپنی کھڑکیوں پر لگی ہوئی مختلف ماڈلز کی ان نیوڈ تصویروں کو دیکھا اسے بے اختیار شرم آئی۔ طیبہ اور سکندر بہت بار اس کے کمرے میں آتے رہتے تھے اور وہ تصویریں ان کے لئے کوئی نئی یا قابل اعتراض چیز نہیں تھیں۔

"تم اب آرام کرو۔ میں نے تمہارے فریج میں پھل اور جوس رکھوا دیا ہے۔ بھوک لگے تو نکال کر کھا لینا یا پھر ملازم کو بلوا لینا۔ وہ نکال دے گا۔"

طیبہ نے اس سے کہا۔ وہ اپنے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر اس کے پاس رہے پھر کھڑکی کے پردے برابر کر کے اسے سونے کی تاکید کرتے ہوئے چلے گئے۔ وہ ان کے باہر نکلتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک کیا۔ کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر اس نے بہت تیزی سے

ان پر لگی ہوئی تمام تصویروں کو اتارنا شروع کر دیا۔ پوسٹر، تصویریں، کٹ آؤٹ۔ اس نے چند منٹ میں پورا کمرہ صاف کر دیا تھا، واش روم میں جا کر اس نے باتھ ٹب میں انہیں پھینک دیا۔

واش روم کی لائٹ جلانے پر اس کی نظر اپنے چہرے پر پڑی تھی۔ وہ بری طرح سوجا ہوا اور نیلا ہو رہا تھا، وہ ایسے ہی چہرے کی توقع کر رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر واش روم سے نکل آیا۔ اس کے کمرے میں پورنوگرافی کے بہت سے میگزین بھی پڑے تھے۔ وہ انہیں اٹھا لایا۔ اس نے انہیں بھی باتھ ٹب میں پھینک دیا، پھر وہ باری باری اپنے ریک میں پڑی ہوئی گندی ویڈیوز اٹھا کر اس میں سے ٹیپ نکالنے لگا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اس کا کارپٹ ٹیپ کے ڈھیر سے بھرا ہوا تھا۔

اس نے وہیں موجود تمام ویڈیوز کو ضائع کر دیا اور ٹیپ کے اس ڈھیر کو اٹھا کر باتھ ٹب میں پھینک دیا اور لائٹر کے ساتھ اس نے انہیں آگ لگا دی۔ ایک چنگاری بھڑکی تھی اور تصویروں اور ٹیپ کا وہ ڈھیر جلنے لگا تھا اس نے ایگزاسٹ آن کر دیا۔ باتھ روم کی کھڑکیاں کھول دیں وہ اس ڈھیر کو اس لئے جلا رہا تھا کیونکہ وہ اس آگ سے بچنا چاہتا تھا جو دوزخ میں اسے اپنی لپٹوں میں لے لیتی۔

"آگ کی لپٹیں تصویروں اور ٹیپ کے اس ڈھیر کو کھا رہی تھیں۔ یوں جیسے وہ صرف آگ کے لئے ہی بنائی گئی تھیں۔

وہ پلکیں جھپکے بغیر باتھ ٹب میں آگ کے اس ڈھیر کو دیکھ رہا تھا یوں جیسے وہ اس وقت کسی دوزخ کے کنارے کھڑا تھا۔ ایک رات پہلے اس پہاڑی پر اس حالت میں اسلام آباد کی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ وہ اس کی زندگی کی آخری رات تھی اور وہ اس کے بعد دوبارہ کبھی ان روشنیوں کو نہیں دیکھ سکے گا۔

اس نے ہذیانی حالت میں گلا پھاڑ کر چیختے ہوئے بار بار کہا تھا "ایک بار، صرف ایک بار، مجھے ایک موقع دیں۔ صرف ایک موقع، میں دوبارہ گناہ کے پاس تک نہیں جاؤں گا۔ میں کبھی گناہ کے پاس نہیں جاؤں گا۔" اسے یہ موقع دے دیا گیا تھا اب اس وعدے کو پورا کرنے کا وقت تھا۔ آگ نے ان سب کاغذوں کو راکھ بنا دیا تھا جب آگ بجھ گئی تو اس نے پانی کھول کر پائپ کے ساتھ اس راکھ کو بہانا شروع کر دیا۔

سالار پلٹ کر دوبارہ واش بیسن کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اس کے گلے میں موجود سونے کی چین کو وہ لوگ اتار کر لے گئے تھے مگر اس کے کان کی لو میں موجود ڈائمنڈ ٹاپس وہیں تھا۔ وہ پلاٹینم میں جڑا ہوا تھا اور ان لوگوں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ شاید ان کا خیال ہو کہ وہ کوئی معمولی پتھر یا پھر زرقون ہو گا یا پھر شاید اس کے لمبے کھلے بالوں کی وجہ سے اس کے کان کی لو چھپی رہی ہو گی۔

وہ کچھ دیر آئینے میں خود کو دیکھتا رہا پھر اس نے کان کی لو میں موجود وہ ٹاپس اتار کر واش بیسن کے

پاس رکھ دیا۔ شیونگ کٹ میں موجود کلپر اس نے نکالا اور اپنے بال کاٹنے لگا۔ بڑی بے رحمی اور بے دردی کے ساتھ۔ واش بیسن میں بہتا ہوا پانی ان بالوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جا رہا تھا۔

ریزر نکال کر اس نے شیو کرنی شروع کر دی۔ وہ جیسے اپنی تمام نشانیوں سے پیچھا چھڑا رہا تھا۔ شیو کرنے کے بعد اس نے اپنے کپڑے نکالے اپنے ہاتھوں پر بندھی پٹیاں کھولیں اور شاور کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ پورا ایک گھنٹہ اپنے پورے جسم کے ایک ایک حصے کو کلمہ پڑھ پڑھ کر صاف کرتا رہا۔ یوں جیسے وہ آج پہلی بار اسلام سے متعارف ہوا ہو۔ پہلی بار مسلمان ہوا ہو۔

واش روم سے باہر آ کر اس نے فریج میں رکھے سیب کے چند ٹکڑے کھائے اور پھر سونے کے لئے لیٹ گیا۔ دوبارہ اس کی آنکھ الارم سے کھلی جسے اس نے سونے سے پہلے لگایا تھا، دو بج رہے تھے۔

☆ ... ☆ ... ☆

"مائی گاڈ۔ سالار! یہ اپنے بالوں کو کیا کیا ہے تم نے؟" طیبہ اسے دیکھتے ہی کچھ دیر کے لئے بھول گئیں کہ وہ بولنے کے قابل نہیں تھا۔ سالار نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر ان کے سامنے کر دیا۔

"میں مارکیٹ جانا چاہتا ہوں۔" اس پر لکھا ہوا تھا۔

"کس لئے؟" طیبہ نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

"تم ابھی ٹھیک نہیں ہوئے ہو۔ کچھ گھنٹے ہوئے ہیں تمہیں ہاسپٹل سے آئے اور تم ایک بار پھر آوارہ گردی کے لئے نکلنا چاہتے ہو۔" طیبہ نے اسے قدرے نرم آواز میں جھڑکا۔

"ممی! میں کچھ کتابیں خریدنا چاہتا ہوں۔" سالار نے ایک بار پھر کاغذ پر لکھا "میں آوارہ گردی کرنے کے لئے نہیں جا رہا۔"

طیبہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ "تم ڈرائیور کے ساتھ چلے جاؤ۔" سالار نے سر ہلا دیا۔

☆ ... ☆ ☆

وہ جس وقت مارکیٹ کی پارکنگ میں گاڑی سے اترا شام ہو چکی تھی۔ مارکیٹ کی روشنیاں وہاں جیسے رنگ و نور کا ایک سیلاب لے آئی تھیں۔ وہ جگہ جگہ پھرتے لڑکے لڑکیوں کو دیکھ سکتا تھا۔ مغربی ملبوسات میں ملبوس بے فکری اور لاپروائی سے قہقہے لگاتے ہوئے اسے زندگی میں پہلی بار اس جگہ سے وحشت ہوئی تھی، وہی وحشت جو وہ اڑتالیس گھنٹے پہلے مارگلہ کی ان پہاڑیوں پر محسوس کرتا رہا تھا۔ وہ ان ہی لڑکوں میں سے ایک تھا لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے والا۔ بلند و بانگ قہقہے لگانے والا، فضول اور بے ہودہ باتیں کرنے والا، اپنا سر نیچے کئے وہ کسی بھی چیز پر دھیان دیئے بغیر سامنے نظر آنے والی بک شاپ میں چلا آیا۔

اپنی جیب سے کاغذ نکال کر اس نے دکاندار کو اپنی مطلوبہ کتابوں کے بارے میں بتایا۔ وہ قرآن

پاک کا ایک ترجمہ اور نماز کے بارے میں کچھ دوسری کتابیں خریدنا چاہتا تھا۔ دکاندار نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ وہ سالار کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ وہاں سے پورنوگرافی کے غیر ملکی میگزینز اور سڈنی شیلڈن اور ہیرلڈ روبنز سمیت چند دوسرے انگلش ناول لکھنے والوں کے ہر نئے ناول کو خریدنے کا عادی تھا۔

سالار اس کی نظروں کے استعجاب کو سمجھتا تھا۔ وہ اس سے نظریں ملانے کے بجائے صرف کاؤنٹر کو دیکھتا رہا۔ وہ آدمی کسی سیلز مین کو ہدایات دیتا رہا پھر اس نے سالار سے کہا۔

"آپ بڑے دن بعد آئے۔ کہیں گئے ہوئے تھے؟"

"اسٹڈیز کے لئے باہر۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے سامنے پڑے ہوئے کاغذ پر لکھا۔

"اور یہ گلے کو کیا ہوا؟"

"بس ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے لکھا۔

سیلز مین قرآن پاک کا ترجمہ اور دوسری مطلوبہ کتابیں لے آیا۔

"ہاں! یہ اسلامی کتابوں کا آج کل بڑا ٹرینڈ چل پڑا ہوا ہے۔ لوگ بہت پڑھنے لگے ہیں، بڑی اچھی بات ہے۔ خاص طور پر باہر جا کر تو ضرور پڑھنا چاہئے۔" دکاندار نے بڑے کاروباری انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ سالار نے کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنے سامنے پڑی کتابوں پر ایک نظر دوڑانے لگا۔

چند لمحوں کے بعد اس کے دائیں ہاتھ قرآن پاک کے ترجمے کے ساتھ کاؤنٹر پر خالی جگہ پر شاپ کیپر نے اس کے سامنے پورنوگرافی کے کچھ نئے میگزینز رکھ دیئے۔ کتابوں کو دیکھتے دیکھتے اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

"یہ نئے آئے ہیں میں نے سوچا آپ کو دکھا دوں۔ ہو سکتا ہے آپ خریدنا پسند کریں۔"

سالار نے ایک نظر قرآن پاک کے ترجمے کو دیکھا دوسری نظر چند انچ دور پڑے ان میگزینز کو دیکھا۔ غصے کی ایک لہر کی اس کے اندر اٹھی تھی۔ کیوں؟ وہ نہیں جانتا تھا۔ اپنے بائیں ہاتھ سے ان میگزینز کو اٹھا کر وہ جتنی دور اس شاپ کے اندر پھینک سکتا تھا اس نے پھینک دیئے۔ چند لمحوں کے لئے پوری شاپ میں خاموشی چھا گئی۔

سیلز مین ہکا بکا کھڑا تھا۔ "بل" سالار نے کاغذ پر گھسیٹا اور سرخ چہرے کے ساتھ اس سیلز مین کی آنکھوں کے سامنے اس کاغذ کو کیا۔ سیلز مین نے کچھ بھی کہے بغیر اپنے سامنے پڑے کمپیوٹر پر ان کتابوں کا بل بنانا شروع کر دیا جو اس کے سامنے رکھی تھیں۔

چند منٹوں میں سالار نے بل ادا کیا اور کتابیں اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"ایڈیٹ ... دکان سے باہر نکلتے ہوئے اس نے کاؤنٹر کے پاس کھڑی ایک لڑکی کا تبصرہ سنا، مخاطب کون تھا اس نے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ جانتا تھا وہ تبصرہ اسی پر کیا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ ہفتے بعد اس کی آواز بحال ہو گئی تھی۔ اگرچہ ابھی اس کی آواز بالکل بیٹھی ہوئی تھی مگر وہ بولنے کے قابل ہو گیا تھا اور ان دو ہفتوں میں وہ روح کی دریافت میں مصروف رہا۔ وہ زندگی میں پہلی بار یہ کام کر رہا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار اسے یہ احساس ہوا تھا کہ روح بھی کوئی وجود رکھتی تھی اور اگر روح کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو جائے تو وہ زندگی میں پہلی بار خاموشی کے ایک لمبے پیریڈ میں داخل ہوا تھا۔ بولنا نہیں، سنتا ، صرف سننا بھی بعض دفعہ بہت اہم ہوتا ہے اس کا ادراک اسے پہلی بار ہو رہا تھا۔

اسے زندگی میں رات سے کبھی خوف نہیں آیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد اسے رات سے بے تحاشا خوف آنے لگا تھا۔ وہ کمرے کی لائٹ آن کر کے سوتا تھا۔ اس نے پولیس کسٹڈی میں ان دونوں لڑکوں کو پہچان لیا تھا، مگر وہ پولیس کے ساتھ اس جگہ پر جانے کے لئے تیار نہیں ہوا تھا جہاں اس شام وہ اسے باندھ کر چھوڑ گئے تھے۔ وہ دوبارہ کسی ذہنی پراگندگی کا شکار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی اتنی بے خواب راتیں نہیں گزاری تھیں مگر اب یہ ہو رہا تھا کہ وہ سلیپنگ پلز لئے بغیر سونے میں کامیاب نہیں ہوتا تھا اور بعض دفعہ جب وہ سلیپنگ پلز نہ لیتا تو وہ ساری رات جاگتے ہوئے گزار دیتا، اس نے نیو ہیون میں بھی ایسے ہی چند ہفتے گزارے تھے۔ اتنے ہی تکلیف دہ اور اذیت ناک مگر تب صرف الجھن اور اضطراب تھا یا شاید کسی حد تک پچھتاوا۔

مگر اب وہ ایک تیسری کیفیت سے گزر رہا تھا خوف سے، وہ اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس رات اسے کس چیز سے زیادہ خوف آیا تھا۔ موت سے، قبر سے، یا پھر دوزخ سے۔

امامہ نے کہا تھا ecstasy کے بعد pain ہوتی ہے۔ موت pain تھی۔

اس نے کہا تھا pain کے بعد nothingness ہو گی۔

قبر nothingness تھی۔

امامہ نے کہا تھا nothingness کے بعد hell آ جائے گا۔

وہ وہاں تک پہنچنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس ecstasy سے بچنا چاہتا تھا، جو اسے pain سے hell کا سفر کرنے پر مجبور کر دیتی۔

"اگر مجھے ان سب چیزوں کا پتا نہیں تھا تو امامہ کو کیسے پتا تھا۔ وہ میری ہی عمر کی ہے۔ وہ میرے جیسے خاندان سے تعلق رکھتی ہے، پھر اس کے پاس ان سوالوں کے جواب کیسے آ گئے؟" وہ حیران ہوتے ہوئے سوچنے لگتا۔ آسائشیں تو اس کے پاس بھی ویسی ہی تھیں جیسی میرے پاس تھیں پھر اس میں اور مجھ میں کیا فرق تھا وہ جس مکتبہ فکر سے تھی وہ کون ہوتے ہیں اور وہ کیوں اس مکتبہ فکر سے منسلک رہنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے پہلی بار اس کے بارے میں تفصیلی طور پر پڑھا۔ اس کی الجھنوں میں اضافہ ہوا، ختم نبوت پر

اختلاف کیا تو یہ تم ایشو ہے کہ ایک لڑکی اس طرح اپنا گھر چھوڑ کر چلی جائے۔

"میں نے اسجد سے اس لئے شادی نہیں کی کیونکہ وہ ختم نبوت ﷺ پر یقین نہیں رکھتا۔ تم سمجھتے ہو میں تمہارے جیسے انسان کے ساتھ زندگی گزارنے پر تیار ہو جاؤں گی۔ ایک ایسے شخص کے ساتھ جو ختم نبوت ﷺ پر یقین رکھتا ہے اور پھر بھی گناہ کرتا ہے جو ہر وہ کام کرتا ہے جس سے میرے پیغمبر ﷺ نے منع فرمایا۔ میں اگر حضرت محمد ﷺ پر یقین نہ رکھنے والے سے شادی نہیں کروں گی تو میں آپ ﷺ کی نافرمانی کرنے والے کے ساتھ بھی زندگی نہیں گزاروں گی۔"

اسے امامہ ہاشم کا ہر لفظ یاد تھا۔ وہ مفہوم پر پہلی بار غور کر رہا تھا۔

"تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔"

اس نے بہت بار سالار سے یہ جملہ کہا تھا۔ اتنی بار کہ وہ اس جملے سے چڑنے لگا تھا۔ آخر وہ یہ بات کہہ کر اس پر کیا جتانا چاہتی تھی یہ کہ وہ کوئی بہت بڑی ایکٹر یا پارسا تھی اور وہ اس سے بہت کمتر

اب وہ سوچ رہا تھا وہ بالکل ٹھیک کہتی تھی۔ وہ واقعی تب کچھ بھی سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ کیچڑ میں رہنے والا کیڑا یہ کیسے جان سکتا تھا کہ وہ کس گندگی میں رہتا ہے۔ اسے اپنے بجائے دوسرے گندگی میں لپٹے اور گندگی میں رہتے نظر آتے ہیں۔ وہ بھی تب گندگی میں ہی تھا۔

"مجھے تمہاری آنکھوں سے، تمہارے کھلے گریبان سے گھن آتی ہے۔" اسے پہلی بار اب ان دونوں چیزوں سے گھن آئی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہونے پر یہ جملہ کسی بز ورڈ (buz word) کی طرح کئی ماہ تک اس کے کانوں میں گونجتا رہا۔ وہ ہر بار اسے ذہن سے جھٹکتے کچھ مشغول ہوتا اپنے کام میں مصروف ہو جاتا مگر اب پہلی بار اس نے محسوس کیا تھا کہ اسے خود بھی اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی۔ وہ اپنا گریبان بند رکھنے لگا تھا۔ اپنی آنکھوں کو جھکانے لگا۔ وہ آئینے میں بھی خود اپنی آنکھوں میں دیکھنے سے کترانے لگا تھا۔

اس نے کبھی کسی سے یہ نہیں سنا تھا کہ کسی کو اس کی آنکھوں اس کی نظروں سے گھن آئی تھی۔ خاص طور پر کسی لڑکی کو۔

یہ اس کی آنکھیں نہیں ان آنکھوں میں جھلکنے والا تاثر تھا جس سے امامہ ہاشم کو گھن آئی تھی۔ امامہ ہاشم سے پہلے کسی لڑکی نے اس تاثر کو شناخت نہیں کیا تھا۔

وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والی لڑکیوں کی کمپنی میں رہتا تھا اور وہ ایسی ہی لڑکیوں کو پسند کرتا تھا۔ امامہ ہاشم نے کبھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کی تھی وہ اس کے چہرے کو دیکھتی اور اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر نظر ہٹا لیتی یا پھر کسی اور چیز کو دیکھنے لگتی۔ سالار کو خوش فہمی تھی کہ وہ اس سے نظریں اس لئے چرا رہی تھی کیونکہ اس کی آنکھیں بہت پرکشش تھیں۔

اسے پہلی بار اس کے منہ سے فون پر یہ سن کر شاک لگا تھا کہ اسے اس کی آنکھوں سے گھن آتی تھی۔

"آنکھیں روح کی کھڑکیاں ہوتی ہیں؟" اس نے کہیں پڑھا تھا تو کیا میری آنکھیں میرے اندر چھپی گندگی کو دکھانا شروع ہو گئی تھیں۔ اسے تعجب نہیں ہوا۔ ایسا ہی تھا مگر اس گندگی کو دیکھنے کے لئے سامنے والے کا پاک ہونا ضروری تھا اور امامہ ہاشم پاک تھی۔

☆ ☆ ☆

"آپ اب مجھے کچھ بھی نہ سمجھائیں۔ آپ کو اب مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔"

سالار نے سکندر سے آنکھیں ملائے بغیر کہا۔

وہ دوبارہ [illegible] جا رہا تھا اور جانے سے پہلے سکندر نے ہمیشہ کی طرح اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ وہی پرانی نصیحتیں کسی موہوم سی آس اور امید میں ایک بار پھر اس کے کانوں میں ٹھونسنے کی کوشش کی تھی مگر اس بار ان کے بات شروع کرتے ہی سالار نے انہیں شاید زندگی میں پہلی دفعہ یقین دہانی کروائی تھی اور زندگی میں پہلی بار سکندر عثمان کو اس کے الفاظ پر یقین آیا تھا۔

وہ اس حادثے کے بعد اس میں آنے والی تبدیلیوں کو واضح طور دیکھ رہے تھے۔ وہ پہلے والا سالار نہیں رہا تھا، اس کی زندگی ہی تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کا حلیہ، اس کا انداز سب کچھ اس کے اندر کے شعلے کو جیسے کسی نے پھونک مار کر بجھا دیا تھا۔ صحیح ہوا تھا یا غلط، یہ تبدیلیاں اچھی تھیں یا بری۔ خود سکندر عثمان ابھی اس پر کوئی رائے دینے کے قابل نہیں ہوئے تھے مگر انہیں یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ اس میں کوئی بہت بڑی تبدیلی آئی تھی۔ انہیں یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس نے زندگی میں پہلی بار چوٹ کھائی تھی اور زندگی میں پہلی بار پڑنے والی چوٹ، بڑے بڑوں کو رلا دیتی ہے وہ تو پھر اکیس بائیس سال کا لڑکا تھا۔

زندگی میں بعض دفعہ ہمیں پتا نہیں چلتا کہ ہم تاریکی سے باہر آ گئے ہیں یا تاریکی میں داخل ہوئے ہیں۔ اندھیرے میں سمت کا پتا نہیں چلتا مگر آسمان اور زمین کا پتا ضرور چل جاتا ہے۔ ہر حال میں چلتا ہے۔ سر اٹھانے پر آسمان ہی ہوتا ہے۔ نظر آئے نہ آئے۔ سر جھکانے پر زمین ہی ہوتی ہے، دکھائی دے نہ دے مگر زندگی میں سفر کرنے کے لئے صرف چار سمتوں ہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ دائیں، بائیں، آگے، پیچھے پانچویں سمت پیروں کے نیچے ہوتی ہے۔ وہاں زمین نہ ہو تو پاتال آ جاتا ہے۔ پاتال میں پہنچنے کے بعد کسی سمت کی ضرورت نہیں رہتی۔

چھٹی سمت سر سے اوپر ہوتی ہے۔ وہاں جایا ہی نہیں جا سکتا۔ وہاں اللہ ہوتا ہے۔ آنکھوں سے نظر نہ آنے والا مگر دل کی ہر دھڑکن، خون کی ہر گردش، ہر آنے جانے والے سانس، حلق سے اترنے والے ہر نوالے کے ساتھ محسوس ہونے والا، وہ فوٹو گرافک میموری، وہ ۱۵۰+ آئی کیو لیول اسے اب عذاب لگ

رہا تھا۔ وہ سب کچھ بھولنا چاہتا تھا۔ وہ سب جو وہ کرتا رہا، وہ کچھ بھی بھلانے کے قابل نہیں تھا۔ کوئی اس سے اس کی تکلیف پوچھتا۔

☆ ☆ ☆

نیو ہیون واپس آنے کے بعد اس نے زندگی کے ایک نئے سفر کو شروع کیا تھا۔

اس رات اس جنگل کے ہولناک اندھیرے اور تنہائی میں اس درخت کے ساتھ بندھے بلکتے ہوئے کیے گئے تمام وعدے اسے یاد تھے۔

وہ سب سے بالکل الگ تھلگ رہنے لگا تھا۔ معمولی سے رابطے اور تعلق کے بھی بغیر۔

"مجھے تم سے نہیں ملنا۔"

وہ سائیکو تو ہمیشہ سے ہی تھا مگر اس حد تک ہو جائے گا اس کے ساتھیوں میں سے کسی کو بھی اس کی توقع نہیں تھی۔ چند ہفتے اس کے بارے میں اس کا گروپ چہ میگوئیاں کرتا رہا پھر یہ چہ میگوئیاں اعتراضات اور تبصروں میں تبدیل ہو گئیں اور اس کے بعد طنزیہ جملوں اور ناپسندیدگی میں پھر سب اپنی اپنی زندگی میں مصروف ہو گئے۔ سالار سکندر کسی کی زندگی کا مرکز اور محور نہیں تھا نہ دوسرا کوئی اس کی زندگی کا۔

اس نے نیو ہیون میں پہنچنے کے بعد جو چند کام کئے تھے اس میں جلال انصر سے ملاقات کی کوشش بھی کی تھی۔ وہ پاکستان سے واپس آتے ہوئے اس کے گھر سے امریکہ میں اس کا ایڈریس لے آیا تھا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اس کا ایک کزن بھی اسی ہاسپٹل میں کام کر رہا تھا جہاں جلال کام کر رہا تھا۔ باقی کا کام بہت آسان ثابت ہوا۔ ضرورت سے زیادہ آسان۔

وہ اس سے ایک بار مل کر اس سے معذرت کرنا چاہتا تھا۔ اسے ان تمام جھوٹوں کے بارے میں بتا دینا چاہتا تھا جو وہ اس سے امامہ کے بارے میں اور امامہ سے اس کے بارے میں بولتا رہا تھا۔ وہ ان دونوں کے تعلق میں اپنے رول کے لئے شرمندہ تھا۔ وہ اس کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ وہ جلال انصر تک پہنچ چکا تھا اور وہ امامہ ہاشم تک پہنچنا چاہتا تھا۔

وہ جلال انصر کے ساتھ ہاسپٹل کے کیفے ٹیریا میں بیٹھا ہوا تھا۔ جلال انصر کے چہرے پر بے حد سنجیدگی تھی اور اس کے ماتھے پر پڑے ہوئے بل اس کی ناراضی کو ظاہر کر رہے تھے۔

سالار چند دن پہلے ہی وہاں پہنچا تھا اور جلال انصر اسے اپنے سامنے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس نے جلال سے چند منٹ مانگے تھے۔ وہ دو گھنٹے انتظار کروانے کے بعد بالآخر کیفے ٹیریا میں آ گیا تھا۔

"سب سے پہلے تو میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تم نے مجھے ڈھونڈا کیسے؟" اس نے آپ جناب کے تمام تکلفات کو برطرف رکھتے ہوئے ٹیبل پر بیٹھتے ہی سالار سے کہا۔

"یہ اہم نہیں ہے۔"

"یہ بہت اہم ہے۔ اگر تم واقعی یہ چاہتے ہو کہ میں کچھ دیر تمہارے ساتھ یہاں گزاروں تو مجھے بتانا چاہئے کہ تم نے مجھے کیسے ڈھونڈا؟"

"میں نے اپنے کزن سے مدد لی ہے۔ وہ ایک ڈاکٹر ہے اور اس شہر میں بہت عرصے سے کام کر رہا ہے۔ میں یہ نہیں جانتا اس نے آپ کو کیسے ڈھونڈا ہے۔ میں نے صرف اس کو آپ کا نام اور کچھ دوسری معلومات دی تھیں۔" سالار نے کہا۔

"لنچ ؟" جلال نے بڑے رسمی انداز میں کہا، وہ ٹیبل پر آتے ہوئے اپنا لنچ ٹرے ساتھ لے کر آیا تھا۔

"نہیں، میں نہیں کھاؤں گا۔" سالار نے شکریے کے ساتھ معذرت کر لی۔

جلال نے کندھے اچکائے اور کھانا شروع کر دیا۔

"کس معاملے میں بات کرنا چاہتے تھے تم مجھ سے؟"

"میں آپ کو چند حقائق سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔"

جلال نے اپنی بھنویں اچکائیں۔ "حقائق؟"

"میں آپ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔ میں امامہ کا دوست نہیں تھا۔ وہ میرے دوست کی بہن تھی، صرف میری نیکسٹ ڈور neighbour" جلال نے کھانا جاری رکھا۔

"میری اس سے معمولی جان پہچان تھی۔ وہ بھی صرف اس لئے کیونکہ ایک بار اس نے مجھے فرسٹ ایڈ دے کر میری جان بچائی تھی۔ وہ مجھے پسند نہیں کرتی تھی خود میں بھی اسے پسند نہیں کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ میں نے آپ پر یوں ظاہر کیا جیسے وہ میری بہت گہری دوست تھی۔ میں آپ دونوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنا چاہتا تھا۔"

جلال سنجیدگی سے اس کی بات سنتے ہوئے کھانا کھاتا رہا۔

"اس کے بعد جب امامہ گھر سے نکل کر آپ کے پاس آنا چاہتی تھی تو میں نے اس سے جھوٹ بولا۔ آپ کی شادی کے بارے میں۔"

اس بار جلال کھانا کھاتے کھاتے رک گیا۔ "میں نے اس سے کہا کہ آپ شادی کر چکے ہیں۔ وہ آپ کے پاس اسی لئے نہیں آئی تھی۔ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ میں نے بہت نامناسب حرکت کی ہے مگر اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔ امامہ سے میرا کوئی رابطہ نہیں تھا مگر یہ ایک اتفاق ہے کہ آپ سے میرا رابطہ ہو گیا۔ میں آپ سے ایکسکیوز کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں تمہاری معذرت قبول کرتا ہوں مگر میں نہیں سمجھتا کہ تمہاری وجہ سے میرے اور امامہ کے درمیان کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی۔ میں پہلے ہی اس سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔" جلال نے بڑی

صاف گوئی سے کہا۔

"وہ آپ سے بہت محبت کرتی تھی۔" سالار نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ہاں میں جانتا ہوں مگر شادی وغیرہ میں صرف محبت تو نہیں دیکھی جاتی اور بھی بہت کچھ دیکھا جاتا ہے۔" جلال بہت حقیقت پسندانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"جلال! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ اس سے شادی کر لیں۔"

"پہلی بات یہ کہ میرا اس کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے اور دوسری بات یہ کہ میرا اس کے ساتھ رابطہ ہو تا بھی تب بھی میں اس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔"

"اس کو آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔" سالار نے کہا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ اسے میرے سہارے کی ضرورت ہے۔ اب تو بہت عرصہ گزر چکا ہے اب تک وہ کوئی نہ کوئی سہارا تلاش کر چکی ہوگی۔" جلال نے اطمینان سے کہا۔

"ہو سکتا ہے اس نے ایسا نہ کیا ہو۔ وہ ابھی بھی آپ کا انتظار کر رہی ہو۔"

"میں اس طرح کے امکانات پر غور کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میرے لئے اپنے کیریئر کی اس اسٹیج پر شادی کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ بھی اس سے۔"

"کیوں ؟"

"اس کیوں کا جواب میں تمہیں کیوں دوں۔ تمہارا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اس سے کیوں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ میں تب ہی اسے بتا چکا ہوں اور اتنے عرصے کے بعد تم دوبارہ آکر پھر وہی پنڈورا باکس کھولنے کی کوشش کر رہے ہو۔" جلال نے قدرے ناراضی سے کہا۔

"میں صرف اس نقصان کی تلافی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، جو میری وجہ سے آپ دونوں کا ہوا۔" سالار نے نرمی سے کہا۔

"میرا کوئی نقصان نہیں ہوا اور امامہ کا بھی نہیں ہوا ہوگا۔ تم ضرورت سے زیادہ حساس ہو رہے ہو۔" جلال نے سالاد کے چند ٹکڑے منہ میں ڈالتے ہوئے اطمینان سے کہا۔ سالار اسے دیکھتا رہا۔ وہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ وہ اسے اپنی بات کیسے سمجھائے۔

"میں اس کو ڈھونڈنے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "مگر میں اسے ڈھونڈنا نہیں چاہتا۔ شادی مجھے اس سے نہیں کرنی تو پھر ڈھونڈنے کا فائدہ۔"

سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔ "آپ جانتے ہیں اس نے کس لئے گھر چھوڑا تھا؟"

"میرے لئے بہرحال نہیں چھوڑا تھا۔" جلال نے بات کاٹی۔

"آپ کے لئے نہیں چھوڑا تھا، مگر جن وجوہات کی بنا پر چھوڑا تھا کیا ایک مسلمان کے طور پر آپ

کو اس کی مدد نہیں کرنی چاہئے جب کہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ لڑکی آپ سے بہت محبت کرتی ہے۔ آپ سے بہت انسپائرڈ ہے۔"

"میں دنیا میں کوئی واحد مسلمان نہیں ہوں اور نہ ہی مجھ پر یہ فرض کر دیا گیا ہے کہ میں اس کی مدد ضرور کروں۔ میری ایک ہی زندگی ہے اور میں اسے کسی دوسرے کی وجہ سے تو خراب نہیں کر سکتا اور پھر تم بھی مسلمان ہو، تم کیوں نہیں شادی کر لیتے اس سے؟ میں نے تو تب بھی تم سے کہا تھا کہ تم اس سے شادی کر لو۔ تم ویسے بھی اس کے لئے نرم گوشہ رکھتے ہو۔"

جلال انصر نے قدرے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔ سالار اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ وہ اسے بتا نہیں سکتا تھا کہ وہ اس سے شادی کر چکا ہے۔

"شادی ؟ وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔" اس نے کہا۔

"میں اس سلسلے میں اسے سمجھا سکتا ہوں۔ تم میرا اس سے رابطہ کروا دو تو میں اسے تم سے شادی پر تیار کرا لوں گا۔ اچھے آدمی ہو تم اور خاندان وغیرہ بھی ٹھیک ہی ہوگا تمہارا۔ کار تو ڈیڑھ سال پہلے بھی بڑی شاندار رکھی ہوئی تھی تم نے۔ اس کا مطلب ہے روپیہ وغیرہ ہوگا تمہارے پاس۔ ویسے یہاں کس لئے ہو؟"

"ایم بی اے کر رہا ہوں۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ جاب تمہیں مل جائے گی۔ روپیہ ویسے بھی تمہارے پاس ہے۔ لڑکیوں کو اور کیا چاہئے۔ امامہ تو ویسے بھی تمہیں جانتی ہے۔" جلال نے چٹکی بجاتے مسئلہ حل کیا تھا۔

"سارا مسئلہ تو اسی "جانتے" نے ہی پیدا کیا ہے۔ وہ مجھے ضرورت سے زیادہ جانتی ہے۔" سالار نے جلال کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

"وہ آپ سے محبت کرتی ہے۔" سالار نے جیسے اسے یاد دلایا۔

"اب اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ لڑکیاں کچھ زیادہ جذباتی ہوتی ہیں اس معاملے میں۔" جلال نے قدرے بیزاری سے کہا۔

"یہ ون سائیڈڈ افیئر تو نہیں ہوگا۔ آپ کسی نہ کسی حد تک اس میں انوالو تو ضرور ہوں گے۔" سالار نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں تھوڑا بہت انوالو تھا، مگر وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ ترجیحات بھی بدلتی رہتی ہیں انسان کی۔"

"اگر آپ کو وقت اور حالات کے ساتھ اپنی ترجیحات بدلنی تھیں تو آپ کو اس کے بارے میں امامہ کو انوالو ہوتے ہوئے ہی بتا دینا چاہئے تھا۔ کم از کم اس سے یہ ہوتا کہ وہ آپ سے مدد کی توقع رکھتی نہ

ہی آپ پر اس قدر انحصار کرتی۔ میں امید کرتا ہوں آپ یہ تو نہیں کہیں گے کہ آپ نے اس سے شادی کے حوالے سے کبھی کوئی بات یا وعدہ کیا ہی نہیں تھا۔"

جلال کچھ کہنے کے بجائے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"تم مجھے کیا جتانے اور بتانے کی کوشش کر رہے ہو؟" اس نے چند لمحوں کے بعد اکھڑے ہوئے انداز میں اس سے کہا۔

"اس نے جب مجھ سے پہلی بار رابطہ کیا تھا تو آپ کا فون نمبر اور ایڈریس دے کر اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے پوچھوں آپ نے اپنے پیرنٹس سے شادی کی بات کر لی ہے۔ میں نے اسے اپنا فون دیا تھا کہ وہ آپ سے یہ بات خود پوچھ لے۔ یقیناً اسلام آباد آنے سے پہلے آپ نے اس سے یہ کہا ہوگا کہ آپ اس سے شادی کے لئے اپنے پیرنٹس سے بات کریں گے۔ آپ نے یقیناً پہلے محبت وغیرہ کے اظہار کے بعد اسے پرپوز کیا ہوگا۔"

جلال نے کچھ برہمی سے اس کی بات کاٹی۔ "میں نے اسے پرپوز نہیں کیا تھا۔ اس نے مجھے پرپوز کیا تھا۔"

"مان لیتا ہوں اس نے پرپوز کیا۔ آپ نے کیا کیا؟ انکار کر دیا؟" وہ چیلنج کرنے والے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"انکار نہیں کیا ہوگا۔" سالار عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

"اس نے مجھے بتایا تھا کہ آپ نعت بہت اچھی پڑھتے ہیں اور آپ کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی بہت محبت ہے۔ آپ کو بھی بتایا ہوگا اس نے کہ وہ آپ سے محبت کیوں کرتی تھی مگر آپ سے مل کر اور آپ کو جان کر مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ آپ نعت بہت اچھی پڑھتے ہوں گے مگر جہاں تک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کا تعلق ہے میں نہیں سمجھتا وہ آپ کو ہے۔ میں خود کوئی بہت اچھا آدمی نہیں ہوں اور محبت کے بارے میں زیادہ بات نہیں کر سکتا۔ خاص طور پر اللہ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کے بارے میں مگر اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ جو شخص اللہ یا اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے یا لوگوں کو یہ امپریشن دیتا پھرتا ہے وہ مدد کے لئے پھیلے ہوئے ہاتھ کو نہیں جھٹک سکتا نہ ہی وہ کسی کو دھوکا اور فریب دے گا۔" سالار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اور میں تو آپ سے ریکویسٹ کر رہا ہوں اس کی مدد کے لئے۔ ہو سکتا ہے اس نے بھی ڈیڑھ سال پہلے کی ہو پھر بھی اگر آپ انکار پر مصر ہیں تو میں یا کوئی آپ کو مجبور تو نہیں کر سکتا مگر آپ سے مل کر اور آپ سے بات کر کے مجھے بہت مایوسی ہوئی۔"

اس نے الوداعی مصافحہ کے لئے جلال کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جلال نے اپنا ہاتھ نہیں بڑھایا، وہ

تمسخر بھرے انداز میں ماتھے پر بل لئے اسے دیکھتا رہا۔

"خدا حافظ۔" سالار نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ جلال اسی انداز میں اسے جاتا دیکھتا رہا اور پھر اس نے خود کلامی کی۔ "It's really an idiot's world out there۔"

وہ دوبارہ لنچ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کا موڈ بے حد آف ہو رہا تھا۔

☆ ☆...☆

جلال انصر سے ملاقات کے بعد وہ اپنے احساسات کو کوئی نام دینے میں ناکام ہو رہا تھا۔ کیا اسے اپنے پچھتاوے سے آزاد ہو جانا چاہئے؟ کیونکہ جلال نے یہ کہا تھا کہ سالار بیچ میں نہ آتا تو بھی وہ امامہ سے شادی نہیں کرتا اور جلال انصر سے بات کرنے کے بعد اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ امامہ کے لئے اس کے احساسات میں کوئی گہرائی نہیں تھی مگر یہ شاید اس کے لئے بہت سے نئے سوال پیدا کر رہا تھا۔ وہ جلال سے آج ملا تھا۔ ڈیڑھ سال پہلے اس نے جلال کے ساتھ اس طرح بات کی ہوتی تو شاید اس پر ہونے والا اثر مختلف ہوتا۔ تب امامہ کے لئے اس کے احساسات کا پیمانہ مختلف ہوتا اور شاید ڈیڑھ سال پہلے وہ امامہ کے بارے میں اس بے حسی کا مظاہرہ نہ کرتا جس کا مظاہرہ اس نے آج کیا تھا۔ وہ ایک ذہنی رو میں اپنے کندھوں سے بوجھ ہٹا ہوا محسوس کرتا اور اگلی ذہنی رو اسے پھر الجھن کا شکار کر دیتی۔

☆ ☆...☆

ایم بی اے کا دوسرا سال بہت پرسکون گزرا تھا۔ پڑھائی کے علاوہ اس کی زندگی میں اور کوئی سرگرمی نہیں رہی تھی۔ وہ کیمپس پر صرف ڈسکشنز میں ہی اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ گفتگو کرتا یا پھر گروپ پروجیکٹس کے سلسلے میں ان کے ساتھ وقت گزارتا۔ باقی کا سارا وقت وہ لائبریری میں گزار دیتا۔ ویک اینڈ پر اس کی واحد سرگرمی اسلامک سینٹر جانا تھا جہاں وہ ایک عرب سے قرآن پاک تلاوت کرنا سیکھا کرتا تھا پھر وہ قرآن پاک کے ان اسباق کو دہرایا کرتا پھر اسی عرب سے اس نے عربی زبان سیکھنا شروع کر دی۔

خالد عبدالرحمان نامی وہ عرب بنیادی طور پر ایک میڈیکل ٹیکنیشن تھا اور ایک ہاسپٹل سے وابستہ تھا۔ وہ ویک اینڈ پر وہاں آ کر عربی زبان اور قرآن پاک کی کلاسز لیا کرتا تھا۔ وہ اس کام کا کوئی معاوضہ نہیں لیا کرتا تھا بلکہ اسلامک سینٹر کی لائبریری میں موجود کتابوں کی ایک بڑی تعداد بھی اسی کے دوستوں اور رشتہ داروں کی طرف سے ہی عطیہ کی گئی تھی۔

قرآن پاک کی ان ہی کلاسز کے دوران ایک دن اس نے سالار سے کہا۔

"تم قرآن پاک حفظ کیوں نہیں کرتے؟" سالار اس کے اس تجویز نما سوال پر کچھ دیر حیرانی سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔

"میں... میں کیسے کر سکتا ہوں؟"

"کیوں... تم کیوں نہیں کر سکتے؟" خالد نے جواباً اس سے پوچھا۔

"یہ بہت مشکل ہے اور پھر میرے جیسا آدمی۔ نہیں میں نہیں کر سکتا۔" سالار نے چند لمحوں کے بعد کہا۔

"تمہارا ذہن بہت اچھا ہے بلکہ میں اگر یہ کہوں کہ میں نے اپنی آج تک کی زندگی میں تم سے زیادہ ذہین آدمی نہیں دیکھا جتنی تیز رفتاری سے تم نے اتنے مختصر عرصہ میں اتنی چھوٹی بڑی سورتیں یاد کی ہیں کوئی اور نہیں کر سکا اور جتنی تیز رفتاری سے تم عربی سیکھ رہے ہو میں اس پر بھی حیران ہوں جب ذہن اس قدر زرخیز ہو اور دنیا کی ہر چیز سیکھ لینے اور یاد رکھنے کی خواہش ہو تو قرآن پاک کیوں نہیں۔ تمہارے ذہن پر اللہ کا بھی حق ہے۔" خالد نے کہا۔

"آپ میری بات نہیں سمجھے۔ مجھے سیکھنے پر کوئی اعتراض نہیں مگر یہ بہت مشکل ہے۔ میں اس عمر میں یہ نہیں سیکھ سکتا۔" سالار نے وضاحت کی۔

"جب کہ میرا خیال ہے کہ تمہیں قرآن پاک حفظ کرنے میں بہت آسانی ہوگی۔ تم ایک بار اسے حفظ کرنا شروع کرو۔ میں کسی اور کے بارے میں تو یہ دعویٰ نہ کرتا مگر تمہارے بارے میں، میں اعتماد سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم نہ صرف بہت آسانی سے اسے حفظ کر لو گے بلکہ بہت کم عرصے میں..."

سالار نے اس دن اس موضوع کے بارے میں مزید کوئی بات نہیں کی۔

مگر اس رات اپنے اپارٹمنٹ پر واپس آنے کے بعد وہ خالد عبدالرحمن کی باتوں کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ اس کا خیال تھا خالد عبدالرحمان دوبارہ اس کے بارے میں اس سے بات نہیں کرے گا۔ مگر اگلے ہفتے خالد عبدالرحمان نے ایک بار پھر اس سے یہی سوال کیا۔

سالار بہت دیر چپ چاپ اسے دیکھتا رہا پھر اس نے مدھم آواز میں خالد سے کہا۔

"مجھے خوف آتا ہے۔"

"کس چیز سے؟"

"قرآن پاک حفظ کرنے سے؟" خالد نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

سالار نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیوں...؟" وہ بہت دیر خاموش رہا پھر کارپٹ پر اپنی انگلی سے لکیریں کھینچتے اور انہیں دیکھتے ہوئے اس نے خالد سے کہا۔

"میں بہت گناہ کر چکا ہوں، اتنے گناہ کہ مجھے انہیں گننا بھی مشکل ہو جائے گا۔ صغیرہ، کبیرہ ہر گناہ جو انسان سوچ سکتا ہے یا کر سکتا ہے۔ میں اس کتاب کو اپنے سینے یا ذہن میں محفوظ کرنے کا سوچ بھی نہیں

سکتا۔ میرا سینہ اور ذہن پاک تو نہیں ہے۔ میرے جیسے لوگ اسے... اسے حفظ کرنے کے لائق نہیں ہوتے۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

خالد کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ "ابھی بھی گناہ کرتے ہو؟" سالار نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر کس چیز کا خوف ہے تم اگر قرآن پاک کی تلاوت کر سکتے ہو، اپنے ان سارے گناہوں کے باوجود تو پھر اسے حفظ بھی کر سکتے ہو اور پھر تم نے گناہ کیے مگر تم اب گناہ نہیں کرتے۔ یہ کافی ہے۔ اگر اللہ یہ نہیں چاہے گا کہ تم اسے حفظ کرو تو تم اسے حفظ نہیں کر سکو گے چاہے تم لاکھ کوشش کر لو اور اگر تم خوش قسمت ہوئے تو تم اسے حفظ کر لو گے۔" خالد نے چٹکی بجاتے ہوئے جیسے یہ مسئلہ حل کر دیا تھا۔

سالار اس رات جاگتا رہا، آدھی رات کے بعد اس نے پہلا پارہ کھول کر کانپتے ہاتھوں اور زبان کے ساتھ حفظ کرنا شروع کیا۔ اسے حفظ کرتے ہوئے اسے احساس ہونے لگا کہ خالد عبدالرحمان ٹھیک کہتا تھا۔ اسے قرآن پاک کا بہت سا حصہ پہلے ہی یاد تھا۔ خوف کی وہ کیفیت جو اس نے قرآن پاک حفظ کرنا شروع کرتے ہوئے محسوس کی تھی وہ زیادہ دیر نہیں رہی تھی۔ اس کے دل کو کہیں سے استقامت مل رہی تھی۔ کہاں سے؟ کوئی اس کی زبان کی لڑکھڑاہٹ دور کر رہا تھا، کون...؟ کوئی اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ ختم کر رہا تھا کیوں؟!"

فجر کی نماز سے کچھ دیر پہلے وہ اس وقت بے تحاشا رویا جب اس نے پچھلے پانچ گھنٹے میں یاد کیے ہوئے سبق کو پہلی بار مکمل طور پر دہرایا۔ وہ کہیں نہیں اٹکا تھا۔ وہ کچھ نہیں بھولا تھا۔ زیر زبر کی کوئی غلطی نہیں، آخری چند جملوں پر اس کی زبان پہلی بار کپکپانے لگی تھی۔ آخری چند جملے ادا کرتے ہوئے اسے وقت ہوئی تھی کیونکہ وہ اس وقت آنسوؤں سے رو رہا تھا۔

"اگر اللہ یہ چاہے گا اور تم خوش قسمت ہو گے تو تم قرآن پاک حفظ کر لو گے ورنہ کچھ بھی کر لو، نہیں کر پاؤ گے۔" اسے خالد عبدالرحمان کی بات یاد آ رہی تھی۔

فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد اس نے کیسٹ پر اپنی زندگی کے اس پہلے سبق کو ریکارڈ کیا تھا۔ ایک بار پھر اسے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس کی آواز میں پہلے سے زیادہ روانی اور لہجے میں پہلے سے زیادہ فصاحت تھی۔

اس کی زندگی میں ایک نئی چیز شامل ہو گئی تھی۔ اس پر ایک اور احسان کر دیا گیا تھا مگر اس کا ڈپریشن ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ رات کو سلیپنگ پلز کے بغیر نیند کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور سلیپنگ پلز لینے کے باوجود وہ کبھی اپنے کمرے کی لائٹس آف نہیں کر سکا تھا۔ وہ تاریکی سے خوف کھاتا تھا۔

یہ پھر خالد عبدالرحمان ہی تھا جس نے ایک دن اس سے کہا تھا۔ وہ اسے قرآن پاک کا سبق زبانی سنا رہا تھا اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ خالد عبدالرحمان مسلسل اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا

جب اس نے اپنا سبق ختم کیا اور پانی کا گلاس اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگایا تو اس نے خالد کو کہتے سنا۔

"میں نے کل رات تمہیں خواب میں حج کرتے دیکھا ہے۔"

سالار منہ میں لے جانے والا پانی حلق سے اتار نہیں سکا۔ گلاس نیچے رکھتے ہوئے خالد کو دیکھنے لگا۔

"اس سال تمہارا ایم بی اے ہو جائے گا۔ اگلے سال تم حج کر لو۔"

خالد کا لہجہ بہت رسمی تھا۔ سالار نے منہ میں موجود پانی غیر محسوس انداز میں حلق سے نیچے اتار لیا۔ وہ اس دن اس سے کوئی سوال جواب نہیں کر سکا تھا۔ اس کے پاس کوئی سوال تھا ہی نہیں۔

ایم بی اے کے فائنل سمسٹر سے دو ہفتے پہلے اس نے قرآن پاک پہلی بار حفظ کر لیا تھا۔ فائنل سمسٹر کے چار ہفتے کے بعد ساڑھے تیئس سال کی عمر میں اسے اپنی زندگی کا پہلا حج کیا تھا۔ وہاں جاتے ہوئے وہیں سے آتے ہوئے اس کے دل و دماغ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی تکبر، کوئی تفخر، کوئی رشک کچھ بھی نہیں۔ اس کے ساتھ پاکستانی کیمپ میں ساتھ جانے والے شاید وہ لوگ ہوں گے جو خوش قسمت ہوں گے۔ انہیں ان کی نیکیوں کے عوض وہاں بلایا گیا تھا۔ وہ اپنے نامۂ اعمال سے واقف تھا۔ اسے صرف معافی اور وضاحتوں کے لئے بلایا گیا تھا۔ وہ قرآن پاک حفظ کر رہا ہوتا تو حج کرنے کا سوچتا بھی نہیں۔ جو شخص حرم شریف سے دور اللہ کا سامنا کرنے کی ہمت نہ رکھتا ہو اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کعبہ کے سامنے پہنچ کر اللہ کا سامنا کر لے گا وہ ہر جگہ جانے کو تیار ہو جاتا، مگر خانہ کعبہ جانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

مگر خالد عبدالرحمان کے ایک بار کہنے پر اس نے جیسے گھٹنے ٹیکتے ہوئے حج پر جانے کے لئے پیپرز جمع کروا دیئے تھے۔

لوگوں کو حج پر جانے کا موقع تب ملتا تھا جب ان کے پاس گناہ نہیں ہوتے۔ نیکیوں کا ہی انبار ہوتا ہے۔ سالار سکندر کو یہ موقع تب ملا تھا جب اس کے پاس گناہوں کے علاوہ ابھی کچھ بھی نہیں تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ اگر میں گناہ کرنے سے خوف نہیں کھاتا رہا تو پھر اب مجھے اللہ کے سامنے جانے اور معذرت کرنے سے بھی خوف نہیں کھانا چاہئے۔ صرف یہی ہے نا کہ میں وہاں سر نہیں اٹھا سکوں گا۔ نظریں اوپر نہیں کر سکوں گا۔ منہ سے معافی کے علاوہ اور کوئی لفظ نہیں نکال سکوں گا تو ٹھیک ہے مجھے یہ سزا بھی ملنی چاہئے۔ میں تو اس سے زیادہ شرمندگی اور بے عزتی کا مستحق ہوں۔ ہر بار حج پر کوئی نہ کوئی شخص ایسا آتا ہوگا، جس کے پاس گناہوں کے علاوہ اور کچھ ہوگا ہی نہیں۔ اس بار وہ شخص میں سہی، سالار سکندر ہی سہی۔" اس نے سوچا تھا۔

☆ …☆… ☆

گناہ کا بوجھ کیا ہوتا ہے اور آدمی اپنے گناہ کے بوجھ کو کس طرح قیامت کے دن اپنی پشت سے اتار

پھینکنا چاہے گا کس طرح اس سے دور بھاگنا چاہے گا کس طرح اسے دوسرے کے کندھے پر ڈال دینا چاہے گا۔ یہ اس کی سمجھ میں حرم شریف میں پہنچ کر ہی آیا تھا۔ وہاں کھڑے ہو کر وہ اپنے پاس موجود اور آنے والی ساری زندگی کی دولت کے عوض بھی کسی کو وہ گناہ بیچنا چاہتا تو کوئی یہ تجارت نہ کرتا۔ کاش آدمی کسی مال کے عوض اپنے گناہ بیچ سکتا۔ کسی اجرت کے طور پر دوسروں کی نیکیاں مانگنے کا حق رکھتا۔

لاکھوں لوگوں کے اس ہجوم میں دو سفید چادریں اوڑھے کون جانتا تھا سالار سکندر کون تھا؟ اس کا آئی کیو لیول کیا تھا، کسے پروا تھی۔ اس کے پاس کون سی اور کہاں کی ڈگری تھی، کسے ہوش تھا۔ اس نے زندگی کے میدان میں کتنے تعلیمی ریکارڈ توڑے اور بنائے تھے، کسے خبر تھی وہ اپنے ذہن سے کون سے میدان تسخیر کرنے والا تھا، کون رشک کرنے والا تھا۔

وہ وہاں اس ہجوم میں ٹھوکر کھا کر گرتا۔ بھگدڑ میں روندا جاتا۔ اس کے اوپر سے گزرنے والی خلقت میں سے کوئی بھی یہ نہیں سوچتا کہ انہوں نے کیسے دماغ کو کھو دیا تھا۔ کس آئی کیو لیول کے نایاب آدمی کو کس طرح ختم کر دیا تھا۔

اسے دنیا میں اپنی اوقات، اپنی اہمیت کا پتا چل گیا تھا۔ اگر کچھ مغالطہ رہ بھی گیا تھا تو اب ختم ہو گیا تھا۔ اگر کچھ شبہ باقی تھا تو اب دور ہو گیا تھا۔

فخر، تکبر، رشک، انا، خود پسندی، خود ستائشی کے ہر بچے ہوئے ٹکڑے کو نچوڑ کر اس کے اندر سے پھینک دیا گیا تھا۔ وہ ان ہی آلائشوں کو دور کروانے کے لئے وہاں آیا تھا۔

☆ …☆ ☆

ایم بی اے میں اس کی شاندار کامیابی کسی کے لئے بھی حیران کن نہیں تھی۔ اس کے ڈیپارٹمنٹ میں ہر ایک کو پہلے سے ہی اس کا اندازہ تھا۔ اس کے اور اس کے کلاس فیلوز کے پروجیکٹس اور اسائنمنٹس میں اتنا فرق ہوتا تھا کہ اس کے پروفیسرز کو یہ ماننے میں کوئی عار نہیں تھا۔ وہ مقابلے کی اس دوڑ میں دس گز آگے دوڑ رہا تھا اور ایم بی اے کے دوسرے سال میں اس نے اس فاصلے کو اور بڑھا دیا تھا۔

اس نے انٹرن شپ اقوام متحدہ کی ایک ایجنسی میں کی تھی اور اس کا ایم بی اے مکمل ہونے سے پہلے ہی اس ایجنسی کے علاوہ اس کے پاس سات مختلف ملٹی نیشنل کمپنیز کی طرف سے آفرز موجود تھیں۔

"تم اب آگے کیا کرنا چاہتے ہو؟" اس کے رزلٹ کے متعلق جاننے کے بعد سکندر عثمان نے اپنے پاس بلا کر پوچھا تھا۔

"میں واپس امریکہ جا رہا ہوں۔ میں یونائیٹڈ نیشنز کے ساتھ ہی کام کرنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا بزنس شروع کرو یا میرے بزنس میں شامل ہو جاؤ۔" سکندر عثمان نے اس سے کہا۔

"پاپا! میں بزنس نہیں کر سکتا۔ بزنس والا ٹمپرامنٹ نہیں ہے میرا۔ میں جاب کرنا چاہتا ہوں اور میں پاکستان میں رہنا بھی نہیں چاہتا۔" سکندر عثمان حیران ہوئے۔ "تم نے پہلے کبھی ذکر نہیں کیا کہ تم پاکستان میں رہنا نہیں چاہتے۔ تم مستقل طور پر امریکہ میں سیٹل ہونا چاہتے ہو؟"

"پہلے میں نے امریکہ میں سیٹل ہونے کے بارے میں نہیں سوچا تھا لیکن اب میں وہیں رہنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟"

وہ ان سے یہ کہنا نہیں چاہتا تھا کہ پاکستان میں اس کا ڈپریشن بڑھ جاتا ہے۔ وہ مسلسل امامہ کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ وہاں ہر چیز اسے امامہ کی یاد دلاتی تھی۔ اس کے پچھتاوے اور احساس جرم میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

"میں یہاں ایڈجسٹ نہیں ہو سکتا۔" سکندر عثمان کچھ دیر اسے دیکھتے رہے۔

"حالانکہ میرا خیال ہے تم ایڈجسٹ ہو سکتے ہو۔"

سالار جانتا تھا ان کا اشارہ کس طرف تھا مگر وہ خاموش رہا۔

"جاب کرنا چاہتے ہو؟ ٹھیک ہے، چند سال جاب کر لو لیکن اس کے بعد آ کر میرے بزنس کو دیکھو۔ یہ سب کچھ میں تم لوگوں کے لئے ہی اسٹیبلش کر رہا ہوں، دوسروں کے لئے نہیں۔"

وہ کچھ دیر اسے سمجھاتے رہے، سالار خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔

☆ ...... ☆ ☆

ایک ہفتہ کے بعد وہ دوبارہ امریکہ آ گیا تھا اور اس کے چند ہفتے کے بعد اس نے یونیسیف میں جاب شروع کر دی۔ وہ نیو ہیون سے نیو یارک چلا گیا تھا۔ یہ ایک نئی زندگی کا آغاز تھا اور وہاں آنے کے چند ہفتے بعد اسے یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ وہ کبھی فرار حاصل نہیں کر سکتا تھا، وہ اسے وہاں بھی اسی طرح یاد آ رہی تھی، اس کا احساس جرم وہاں بھی اس کا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

وہ سولہ سے اٹھارہ گھنٹے تک کام کرنے لگا۔ وہ ایک دن بھی تین چار گھنٹے سے زیادہ کبھی نہیں سویا اور دن رات کی اس مصروفیت نے اسے بڑی حد تک نارمل کر دیا تھا اگر ایک طرف کام کے اس انبار نے اس کے ڈپریشن میں کمی کی تھی تو دوسری طرف وہ اپنے ادارے کے نمایاں ترین ورکرز میں شمار ہونے لگا تھا۔ یونیسیف کے مختلف پروجیکٹس کے سلسلے میں وہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک جانے لگا۔ غربت اور بیماری کو وہ پہلی دفعہ اپنی آنکھوں سے، اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ رپورٹس اور اخباروں میں چھپنے والے حقائق میں اور ان حقائق کو اپنی تمام ہولناکی کے ساتھ کھلی آنکھ سے دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے اور یہ فرق اسے اس جاب میں ہی سمجھ میں آیا تھا۔ ہر روز بھوکے سونے والے لوگوں کی تعداد کروڑوں

میں تھی۔ ہر رات پیٹ بھر کر ضرورت سے زیادہ کھا لینے والوں کی تعداد بھی کروڑوں میں تھی۔ صرف تین وقت کا کھانا، سر پر چھت اور جسم پر لباس بھی کتنی بڑی نعمتیں تھیں، اسے تب سمجھ میں آیا تھا۔

وہ یونیسیف کی ٹیم کے ساتھ چارٹرڈ طیاروں میں سفر کرتے ہوئے اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا۔ اس نے زندگی میں ایسے کون سے کارنامے انجام دیئے تھے کہ اسے وہ پر آسائش زندگی دی گئی تھی جو وہ گزار رہا تھا اور ان لوگوں سے کیا گناہ ہوئے تھے کہ وہ زندگی کی تمام بنیادی ضروریات سے محروم صرف زندہ رہنے کی خواہش میں خوراک کے ان پیکٹس کے پیچھے بھاگتے پھرتے تھے۔

وہ ساری ساری رات جاگ کر اپنے ادارے کے لئے ممکنہ اسکیمیں اور پلان بناتا رہتا۔ کہاں خوراک کی ڈسٹری بیوشن کیسے ہو سکتی ہے، کیا بہتری لائی جا سکتی ہے، کہاں مزید امداد کی ضرورت ہے، کن علاقوں میں کس طرح کے پروجیکٹس درکار تھے، وہ بعض دفعہ اڑتالیس گھنٹے بغیر سوئے کام کرتا رہتا۔

اس کے بنائے ہوئے پروپوزلز اور رپورٹس تکنیکی لحاظ سے اتنے مربوط ہوتے تھے کہ ان میں کوئی خامی ڈھونڈنا کسی کے لئے ممکن نہیں رہتا تھا اور اس کی یہ خصوصیات، اس کی ساکھ اور نام کو اور بھی مستحکم کرتی جا رہی تھیں اگر مجھے اللہ نے دوسروں سے بہتر ذہن اور صلاحیتیں دی ہیں تو مجھے ان صلاحیتوں کو دوسروں کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ اس طرح استعمال کرنا چاہئے کہ میں دوسروں کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ آسانی لا سکوں، دوسروں کی زندگی کو بہتر کر سکوں۔ وہ کام کرتے ہوئے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچتا تھا۔

یونیسیف کے لئے کام کرنے کے دوران ہی اس نے ایم فل کرنے کا سوچا تھا اور پھر اس نے ایم فل میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ ایوننگ کلاسز کو جوائن کرتے ہوئے اسے قطعاً کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایک بار پھر ضرورت سے زیادہ مصروف کر رہا تھا مگر اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ کام اس کا جنون بن چکا تھا یا شاید اس سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر ایک مشن۔

☆ ...... ☆ ☆

فرقان سے سالار کی پہلی ملاقات امریکہ سے پاکستان آتے ہوئے فلائٹ کے دوران ہوئی۔ وہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ امریکہ میں ڈاکٹرز کی کسی کانفرنس میں شرکت کر کے واپس آ رہا تھا جبکہ سالار سکندر اپنی بہن انیتا کی شادی میں شرکت کے لئے پاکستان آ رہا تھا۔ اس لمبی فلائٹ کے دوران دونوں کے درمیان ابتدائی تعارف کے بعد گفتگو کا سلسلہ تھا نہیں۔

فرقان، عمر میں سالار سے کافی بڑا تھا، وہ پینتیس سال کا تھا لندن سے اسپیشلائزیشن کرنے کے بعد وہ واپس پاکستان آ گیا تھا اور وہاں ایک ہاسپٹل میں کام کر رہا تھا۔ وہ شادی شدہ تھا اور اس کے دو بچے بھی تھے۔ چند گھنٹے آپس میں گفتگو کرتے رہنے کے بعد فرقان اور وہ سونے کی تیاری کرنے لگے۔ سالار نے

معمول کے مطابق اپنے بریف کیس سے سلیپنگ پلز کی ایک گولی پانی کے ساتھ نگل لی۔ فرقان نے اس کی اس تمام کارروائی کو خاموشی سے دیکھا۔ جب اس نے بریف کیس بند کر کے دوبارہ رکھ دیا تو فرقان نے کہا۔

"اکثر لوگ فلائٹ کے دوران سلیپنگ پلز کے بغیر نہیں سو سکتے۔"

سالار نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور کہا۔

"میں سلیپنگ پلز کے بغیر نہیں سو سکتا۔ فلائٹ میں ہوں یا نہ ہوں، اس سے فرق نہیں پڑتا۔"

"سونے میں مشکل پیش آتی ہے؟" فرقان کو ایک دم کچھ تجسس ہوا۔

"مشکل؟" سالار مسکرایا۔ "میں سرے سے سو ہی نہیں سکتا۔ میں سلیپنگ پلز لیتا ہوں اور تین چار گھنٹے سو لیتا ہوں۔"

"انسومنیا؟" فرقان نے پوچھا۔

"شاید میں نے ڈاکٹر سے چیک اپ نہیں کروایا مگر شاید یہ وہی ہے۔" سالار نے قدرے لاپروائی سے کہا۔

"تمہیں چیک اپ کروانا چاہیے تھا اس عمر میں انسومنیا — یہ کوئی بہت صحت مند علامت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے تم کام کے پیچھے جنونی ہو چکے ہو اور اسی وجہ سے تم نے اپنی سونے کی نارمل روٹین کو خراب کر لیا ہے۔"

فرقان اب کسی ڈاکٹر کی طرح بول رہا تھا۔ سالار مسکراتے ہوئے سنتا رہا۔ وہ اسے نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ اگر رات دن مسلسل کام نہ کرے تو وہ اس احساس جرم کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا تھا جسے وہ محسوس کرتا ہے۔ وہ اسے یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ سلیپنگ پلز کے بغیر سونے کی کوشش کرے تو وہ امامہ کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ اس حد تک کہ اسے اپنا سر درد سے پھٹتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔

"کتنے گھنٹے کام کرتے ہو ایک دن میں؟" فرقان اب پوچھ رہا تھا۔

"اٹھارہ گھنٹے، بعض دفعہ بیس۔"

"مائی گڈنیس! اور کب سے؟"

"دو تین سال سے۔"

"اور تب ہی سے نیند کا مسئلہ ہو گیا تمہیں، میں نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ تم نے خود اپنی روٹین خراب کر لی ہے۔" فرقان نے اس سے کہا۔ "ورنہ اتنے گھنٹے کام کرنے والے آدمی کو تو ذہنی تھکن ہی ایک لمبی اور پرسکون نیند سلا دیتی ہے۔"

"یہ میرے ساتھ نہیں ہوتا۔" سالار نے مدھم لہجے میں کہا۔

"یہی تو تمہیں جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ اگر یہ تمہارے ساتھ نہیں ہوتا تو کیوں نہیں ہوتا۔"

سالار اس سے یہ نہیں کہہ سکا کہ وہ وجہ جانتا ہے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد فرقان نے اس سے کہا۔

"میں اگر تمہیں کچھ آیتیں بتاؤں رات کو سونے سے پہلے، تو تم پڑھ سکو گے؟"

"کیوں نہیں پڑھ سکوں گا۔" سالار نے گردن موڑ کر اس سے کہا۔

"نہیں، اصل میں تمہارے اور میرے جیسے لوگ جو زیادہ پڑھ لیتے ہیں اور خاص طور پر تعلیم مغرب میں حاصل کرتے ہیں، وہ ایسی چیزوں پر یقین نہیں رکھتے یا انہیں پریکٹیکل نہیں سمجھتے۔" فرقان نے وضاحت کی۔

"فرقان! میں حافظ قرآن ہوں۔" سالار نے اسی طرح لیٹے ہوئے پرسکون آواز میں کہا۔

فرقان کو جیسے کرنٹ لگا۔

"میں روز رات کو سونے سے پہلے ایک سپارہ پڑھ کر سوتا ہوں، میرے ساتھ یقین یا اعتبار کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" سالار نے بات جاری رکھی۔

"میں بھی حافظ قرآن ہوں۔"

فرقان نے بتایا۔ سالار نے گردن موڑ کر مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ یہ یقیناً ایک خوشگوار اتفاق تھا۔ اگرچہ فرقان نے داڑھی رکھی ہوئی تھی مگر سالار کو پھر بھی یہ اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ وہ حافظ قرآن ہے۔

"پھر تو تمہیں اس طرح کا کوئی مسئلہ ہونا ہی نہیں چاہیے۔ قرآن پاک کی تلاوت کر کے سونے والے انسان کو نیند نہ آئے، یہ مجھے کچھ عجیب لگتا ہے۔"

سالار نے فرقان کو بڑبڑاتے سنا۔ وہ اب اپنے سر اس کو بالکل مفلوج کر رہا تھا۔ نیند اس پر غلبہ پا رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"تمہیں کوئی پریشانی ہے؟" اس نے فرقان کی آواز سنی۔ وہ نیند کی گولیوں کے زیر اثر نہ ہوتا تو مسکرا کر انکار کر دیتا مگر وہ جس حالت میں تھا اس میں وہ انکار نہیں کر سکا۔

"ہاں، مجھے بہت زیادہ پریشانیاں ہیں۔ مجھے سکون نہیں ہے، مجھے لگتا ہے میں مسلسل کسی صحرا میں سفر کر رہا ہوں، پچھتاوے ہیں۔ احساس جرم مجھے چھوڑتے ہی نہیں۔ مجھے — مجھے کسی پیر کامل کی تلاش ہے، جو مجھے اس تکلیف سے نکال دے، جو مجھے میری زندگی کا راستہ دکھا دے۔"

فرقان دم بخود اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ سالار کی آنکھیں بند تھیں، مگر وہ اس کی آنکھوں کے کونوں سے نکلتی نمی کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کی آواز میں بھی بے ربطی اور لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ اس وقت لاشعوری طور

پرسلیپنگ پلز کے زیرِ اثر بول رہا تھا۔

وہ اب خاموش ہو چکا تھا۔ فرقان نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ بہت ہموار انداز میں چلنے والی اس کی سانس بتا رہی تھی کہ وہ نیند میں جا چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

جہاز میں ہونے والی وہ ملاقات وہیں ختم نہیں ہوئی۔ وہ دونوں جاگنے کے بعد بھی آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ فرقان نے سالار سے ان چند جملوں کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ جو اس نے نیند کی آغوش میں جاتے ہوئے بولے تھے۔ خود سالار کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس نے سونے سے پہلے اس سے کچھ کہا تھا اگر کہا تھا تو کیا کہا تھا۔

سفر ختم ہونے سے پہلے ان دونوں نے آپس میں کونٹیکٹ نمبرز اور ایڈریس کا تبادلہ کیا پھر سالار نے اسے انیتا کی شادی پر انوائٹ کیا۔ فرقان نے آنے کا وعدہ کیا مگر سالار کو اس کا یقین نہیں تھا۔ ان دونوں کی فلائٹ کراچی تک تھی پھر سالار کو اسلام آباد کی فلائٹ لینی تھی جبکہ فرقان کو لاہور کی۔ ائیرپورٹ پر فرقان نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ اس سے الوداعی مصافحہ کیا۔

انیتا کی شادی تین دن بعد تھی اور سالار کے پاس ان تین دنوں کے لئے بھی بہت سے کام تھے۔ کچھ شادی کی مصروفیات اور کچھ اس کے اپنے مسئلے۔

وہ اگلے دن شام کو اس وقت حیران ہوا جب فرقان نے اسے فون کیا۔ دس پندرہ منٹ دونوں کی گفتگو ہوتی رہی۔ فون بند کرنے سے پہلے سالار نے ایک بار پھر اسے انیتا کی شادی کے بارے میں یاد دلایا۔

"یہ کوئی یاد دلانے والی بات نہیں ہے، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں ویسے بھی اس ویک اینڈ پر اسلام آباد میں ہی ہوں گا۔" فرقان نے جواباً کہا۔ "وہاں مجھے اپنے گاؤں میں اپنا اسکول دیکھنے بھی جانا ہے۔ اس کی بلڈنگ میں کچھ اضافی تعمیر ہو رہی ہے۔ اسی سلسلے میں تو اسلام آباد میں اس بار میرا قیام کچھ لمبا ہی ہوگا۔" سالار نے اس کی بات کو کچھ دلچسپی سے سنا۔

"گاؤں ... اسکول ... کیا مطلب؟"

"ایک اسکول چلا رہا ہوں میں وہاں، اپنے گاؤں میں۔" فرقان نے اسلام آباد کے نواحی علاقوں میں سے ایک کا نام لیا۔ "بلکہ کئی سالوں سے۔"

"کس لئے؟"

"کس لئے؟" فرقان کو اس کے سوال نے حیران کیا۔ "لوگوں کی مدد کے لئے اور کس لئے۔"

"چیریٹی ورک ہے؟"

"نہیں، چیریٹی ورک نہیں ہے۔ یہ میرا فرض ہے۔ یہ کسی پر کوئی احسان نہیں ہے۔" فرقان نے

بات کرتے کرتے موضوع بدل دیا۔ اسکول کے بارے میں مزید گفتگو نہیں ہوئی اور فون بند ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

فرقان انیتا کی شادی پر واقعی آ گیا تھا۔ وہ خاصی دیر وہاں رکا مگر سالار کو محسوس ہوا کہ وہ کچھ حیران تھا۔

"تمہاری فیملی تو خاصی مغرب زدہ ہے۔"

سالار کو یک دم اس کی الجھن اور حیرانی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

"میرا خیال تھا کہ تمہاری فیملی کچھ کنزرویٹو ہوگی کیونکہ تم نے بتایا تھا کہ تم حافظِ قرآن ہو اور تمہارا لائف اسٹائل مجھے کچھ سادہ سا لگا مگر یہاں آ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ تم اور تمہاری فیملی میں بہت فرق ہے۔" I think you are the odd one out."

وہ اپنے آخری جملے پر خود ہی مسکرایا۔ وہ دونوں اب فرقان کی گاڑی کے قریب پہنچ چکے تھے۔

"میں نے صرف دو سال پہلے قرآن پاک حفظ کیا اور دو تین سال سے ہی میں odd one out ہوا ہوں۔ پہلے میں اپنی فیملی سے بھی زیادہ مغرب زدہ تھا۔" اس نے فرقان کو بتایا۔

"دو سال پہلے قرآن پاک حفظ کیا۔ امریکہ میں اپنی اسٹڈیز کے دوران، مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

فرقان نے بے یقینی سے سر ہلایا۔

"کتنے عرصے میں کیا؟"

"تقریباً آٹھ ماہ میں۔"

فرقان بہت دیر تک کچھ نہیں کہہ سکا، وہ صرف اس کا چہرہ دیکھتا رہا، پھر اس نے ایک گہرا سانس لے کر ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم پر کوئی اللہ کا خاص ہی کرم ہے، ورنہ جو کچھ تم مجھے بتا رہے ہو یہ آسان کام نہیں ہے۔ میں فلائٹ میں بھی تمہارے کارناموں سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ کیونکہ جس عمر میں یونیسکو میں جس سیٹ پر تم کام کر رہے ہو وہ ہر کوئی نہیں کر سکتا۔"

اس نے ایک بار پھر بڑی گرمجوشی کے ساتھ سالار سے ہاتھ ملایا۔ چند لمحوں کے لئے سالار کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوا۔

"اللہ کا خاص کرم! اگر میں اسے یہ بتا دوں کہ میں ساری زندگی کیا کرتا رہا ہوں تو یہ ..." سالار نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے سوچا۔

"تم پرسوں کسی اسکول کی بات کر رہے تھے۔" سالار نے دانستہ طور پر موضوع بدلا۔

"تم اسلام آباد میں کہاں رہتے ہو؟"

"نہیں، میں اسلام آباد میں ہی رہتا ہوں مگر میرا ایک گاؤں ہے۔ آبائی گاؤں، وہاں ہماری کچھ زمین ہے، ایک گھر بھی تھا۔" فرقان اسے تفصیل بتانے لگا۔ "کئی سال پہلے میرے والدین اسلام آباد شفٹ ہو گئے تھے۔ میرے والد نے فیڈرل سروس سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہاں اپنی زمینوں پر ایک اسکول بنا لیا۔ اس گاؤں میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ انہوں نے پرائمری اسکول بنوایا تھا۔ سات آٹھ سال سے میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ اب وہ سیکنڈری اسکول بن چکا ہے۔ چار سال پہلے میں نے وہاں ایک ڈسپنسری بھی بنوائی۔ تم اس ڈسپنسری کو دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے۔ بہت جدید سامان ہے اس میں۔ میرے ایک دوست نے ایک ایمبولینس بھی گفٹ کی ہے اور اب صرف میرے گاؤں کے ہی نہیں بلکہ ارد گرد کے بہت سارے گاؤں کے لوگ بھی اسکول اور ڈسپنسری سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"

سالار اس کی باتیں توجہ سے سن رہا تھا۔

"مگر تم یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو۔ تم ایک سرجن ہو، تم یہ سب کیسے کر لیتے ہو اور اس کے لئے بہت پیسے کی ضرورت ہے۔"

"کیوں کر رہا ہوں، یہ تو میں نے اپنے آپ سے کبھی نہیں پوچھا۔ میرے گاؤں میں اتنی غربت تھی کہ یہ سوال پوچھنے کی مجھے کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ ہم لوگ بچپن میں کبھی کبھار اپنے گاؤں جایا کرتے تھے۔ یہ ہمارے لئے تفریح تھی۔ ہماری حویلی کے علاوہ گاؤں کا کوئی مکان پکا نہیں تھا اور سڑک کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم سب کو یوں لگتا تھا جیسے ہم جنگل میں آ گئے ہیں، اب اگر ہم جانور ہوتے تو ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شیر کی طرح ہم جنگل میں دندناتے پھرتے۔ یہی سوچ کر کہ سب، ہم سب سے مرعوب ہیں اور کوئی بھی ہمارے جیسا نہیں نہ کوئی ہماری طرح رہتا ہے، نہ ہمارے جیسا کھاتا ہے، نہ ہمارے جیسا پہنتا ہے مگر انسان ہو کر یہ برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہمارے ارد گرد کے انسان جانوروں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ہو سکتا ہے کچھ انسانوں کو اس سے خوشی محسوس ہوتی ہو کہ انہیں ہر نعمت میسر ہے اور باقی سب ترس رہے ہیں مگر ہمارا شمار ایسے انسانوں میں نہیں ہوتا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ میرے پاس کوئی جادو کی چھڑی تو تھی نہیں کہ میں اسے ہلاتا اور سب کچھ بدل دیتا۔ نہ ہی بے شمار وسائل۔ تمہیں میں نے بتایا ہے نا کہ میرے والد سول سرونٹ تھے، ایماندار قسم کے سول سرونٹ۔ میں اور میرا بھائی دونوں شروع سے ہی اسکالر شپ پر پڑھتے رہے، اس لئے ہم پر ہمارے والدین کو زیادہ خرچ نہیں کرنا پڑا۔ خود وہ بھی کوئی فضول خرچ نہیں تھے۔ اس لئے تھوڑی بہت بچت ہوتی رہی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد میرے والد نے سوچا کہ لاہور یا اسلام آباد کے کسی گھر میں اخبار پڑھ کر، واک کر کے یا ٹی وی دیکھ کر زندگی گزارنے کے بجائے انہیں اپنے گاؤں جانا چاہئے۔ وہاں کچھ بہتری لانے کی کوشش کرنی چاہئے۔"

وہ دونوں گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے تھے۔

"مشکلات کا تم اندازہ نہیں کر سکتے گاؤں میں نہ بجلی تھی، نہ صاف پانی، کچھ بھی نہیں تھا۔ بابا نے پتا نہیں کہاں کہاں بھاگ کر یہ ساری چیزیں منظور کروائیں۔ جب وہاں پرائمری اسکول بن گیا، ایک سڑک بھی آ گئی، بجلی اور پانی جیسی سہولتیں بھی آ گئیں تو گورنمنٹ کو اچانک وہاں ایک اسکول بنانے کا خیال آیا۔ میرے والدین کی خواہش تھی کہ گورنمنٹ ان کے اسکول کو اپنی زیرِ نگرانی لے لے۔ اس میں اپنے ٹیچرز بھجوائے اور کچھ عرصے کے بعد اس اسکول کو اپ گریڈ کر دے، مگر محکمہ تعلیم کے ساتھ چند رابطوں میں ہی بابا کو اندازہ ہو گیا کہ ایسا ہونے کی صورت میں ان کی ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ بابا وہاں بچوں کو سب کچھ دیتے تھے۔ کتابیں، کاپیاں، یونیفارم اور ایسی کچھ دوسری چیزیں۔ انہوں نے باقاعدہ اس کے لئے فنڈز رکھے ہوئے تھے، مگر تم اندازہ کر سکتے ہو کہ گورنمنٹ کے پاس چلے جانے کے بعد اس اسکول کا کیا حشر ہوتا۔ سب سے پہلے وہ فنڈز جاتے پھر باقی سب کچھ۔ اس لئے بابا خود ہی اس اسکول کو چلاتے رہے۔

محکمہ تعلیم نے وہاں اسکول پھر بھی کھولا مگر وہاں ایک بچہ بھی نہیں گیا پھر بار مان کر انہوں نے وہ اسکول بند کر دیا اور ہمارے اسکول کو اپ گریڈ کر دیا۔ بابا کے کچھ دوستوں نے اس سلسلے میں ان کی مدد کی، اسی طرح اس کی اپ گریڈنگ ہوتی گئی۔ میں ان دنوں لندن میں پڑھتا تھا اور میں روپے بچا بچا کر بھیجا کرتا تھا۔ ابھی بھی ہم اس کو اور ترقی دے رہے ہیں، آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی اپنے بچوں کو ہمارے پاس بھجواتے ہیں۔ میں جب پاکستان واپس آیا تو میں نے وہاں ایک باضابطہ قسم کی ڈسپنسری قائم کی۔ گاؤں کی آبادی بھی اب بہت بڑھ گئی ہے لیکن گاؤں میں غربت ابھی بھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی۔ تعلیم سے اتنا ضرور ہوا ہے کہ گاؤں کے کچھ بچے باہر شہر میں آگے پڑھنے کے لئے جانے لگے ہیں۔ کچھ مختلف ہنر سیکھ رہے ہیں۔ وہ جو غربت کا ایک چکر تھا وہ ختم ہو رہا ہے۔ ان کی یہ نسلیں نہیں تو اگلی نسلیں شاید تمہارے اور میرے جیسے تعلیمی اداروں سے اعلیٰ ڈگریز لے کر نکلیں۔ کون کہہ سکتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں ہر ماہ ایک ویک اینڈ پر گاؤں جاتا ہوں، وہاں دو کمپاؤنڈر ہیں مگر کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ ایک ویک اینڈ پر میں وہاں جاتا ہوں، باقی تین ویک اینڈز پر بھی ہم کسی نہ کسی کو وہاں بھجوا دیتے ہیں پھر میں وہاں ہر تین ماہ بعد ایک میڈیکل کیمپ لگواتا ہوں۔"

"اور اس سب کے لئے روپیہ کہاں سے آتا ہے۔"

"شروع میں تو یہ بابا کا روپیہ تھا۔ ان ہی کی زمین پر اسکول بنا، ان کی گریجویٹی سے اس کی تعمیر ہوئی۔ میری امی نے بھی اپنے پاس موجود رقم سے ان کی مدد کی، پھر بابا کے کچھ دوست بھی مالی امداد

کرنے گئے۔ اس کے بعد میں اور مہران بھی اس میں شامل ہو گئے پھر میرے کچھ دوست بھی۔ میں اپنی انکم کا ایک خاص حصہ ہر ماہ گاؤں بھجوا دیتا ہوں۔ اس سے ڈسپنسری بڑے آرام سے چلتی رہتی ہے۔ جو ڈاکٹرز وہاں مہینے کے تین ویک اینڈز پر جاتے ہیں وہ کچھ چارج نہیں کرتے۔ ان کے لئے یہ سوشل ورک ہے۔ میڈیکل کیمپس بھی اسی طرح کے لگ جاتے ہیں اور اسکول کے پاس اب اپنے اتنے فکسڈ ڈپازٹس ہو چکے ہیں کہ ان سے آنے والی رقم ٹیچرز کی تنخواہ اور دوسرے اخراجات کے لئے کافی ہوتی ہے۔ ہم چند سالوں میں وہیں ٹیکنیکل ایجوکیشن کے لئے بھی کچھ کام کرنا چاہتے ہیں۔"

"تم کب جا رہے ہو وہاں؟"

"میں تو صبح نکل رہا ہوں۔"

"اگر میں تمہارے ساتھ جانا چاہوں؟" سالار نے کہا۔

"موسٹ ویلکم مگر کل تو ولیمہ ہوگا، تم یہاں مصروف ہو گے۔" فرقان نے اسے یاد دلایا۔

"ولیمہ تو رات کو ہے، سارا دن تو میں فارغ ہی ہوں گا۔ کیا رات تک واپس پہنچنا مشکل ہو گا؟"

"نہیں، بالکل بھی نہیں۔ تم بہت آسانی سے واپس پہنچ سکتے ہو۔ صرف صبح کچھ جلدی نکلنا پڑے گا۔ اگر تم واقعی وہاں چند گھنٹے گزارنا چاہتے ہو ورنہ پھر تم واپس آ کر خاصے تھک جاؤ گے۔" فرقان نے اس سے کہا۔

"میں نہیں تھکوں گا، میں یونیسیف کی ٹیمز کے ساتھ کیسے کیسے علاقوں میں کتنا لمبا سفر کرتا رہا ہوں، تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ میں فجر کے بعد تیار رہوں گا، تم مجھے وقت بتا دو۔"

"ساڑھے پانچ۔"

"او کے، تم گھر سے نکلتے ہوئے مجھے ایک بار موبائل پر کال کر لینا اور دو تین بار ہارن دینا یہاں آ کر، میں نکل آؤں گا۔"

اس نے فرقان سے کہا اور پھر خدا حافظ کہتا ہوا اندر مڑ گیا۔

اگلی صبح فرقان ٹھیک ساڑھے پانچ بجے اس کے گیٹ پر ہارن دے رہا تھا اور سالار پہلے ہی باہر تھا۔

"تم واپس پاکستان کیوں آ گئے؟ تم انگلینڈ میں بہت آگے جا سکتے تھے؟" گاڑی شہر سے باہر والی سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ انہیں سفر کرتے آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا، جب سالار نے اچانک اس سے پوچھا۔

"انگلینڈ کو میری ضرورت نہیں تھی، پاکستان کو تھی۔ اس لئے میں پاکستان آ گیا۔" فرقان نے بڑے نارمل انداز میں کہا۔

"وہیں ایک ڈاکٹر فرقان کے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں ایک ڈاکٹر فرقان کے نہ

ہونے سے بہت فرق پڑ جاتا۔ یہاں میری خدمات کی ضرورت ہے۔" اس نے اپنے آخری جملے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"مگر وہیں اتنے سالوں میں تم بہت آگے جا سکتے تھے پھر پروفیشنلی بھی تم بہت کچھ سیکھتے۔ فنانشلی بھی تم اس پروجیکٹ کے لئے زیادہ روپیہ حاصل کر سکتے تھے، جو تم نے شروع کیا ہوا ہے۔ آفٹر آل، پاکستان میں تم اتنے کامیاب نہیں ہو سکتے۔" سالار نے کہا۔

"اگر کامیابی سے تمہاری مراد پاؤنڈز کی تعداد اور سہولتوں سے ہے تو ہاں، دونوں جگہوں کا کوئی مقابلہ نہیں ہے لیکن اگر تمہارا اشارہ نتائج کی طرف ہے تو میں یہیں زیادہ لوگوں کو زندگی بانٹ رہا ہوں جو اطمینان ڈاکٹر اپنے صحت یاب ہونے والے مریض کو دیکھ کر حاصل کرتا ہے تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ انگلینڈ ڈاکٹروں سے بھرا ہوا ہے۔ پاکستان میں ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ میں وہاں رہ کر روپے کا ڈھیر بھی یہاں بھجواتا رہتا تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ جہاں ایک فرد کی کمی ہوتی ہے وہاں اس فرد سے ہی وہ کمی پوری ہوتی ہے۔ روپیہ یا دوسری کوئی چیز اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ میں بہت قانع ہوں سالار! میری پوری فیملی بہت قانع ہے۔ اگر میں نے کوئی چیز سیکھی ہے تو وہ سب سے پہلے میرے اپنے لوگوں کے کام آنی چاہئے۔ میں اپنے لوگوں کو مرتا چھوڑ کر دوسرے لوگوں کی زندگی نہیں بچا سکتا۔ پاکستان میں کچھ بھی صحیح نہیں ہے، سب کچھ خراب ہے، کچھ بھی ٹھیک نہیں، سہولتوں سے خالی ہاسپٹلز اور حد سے زیادہ برا اور کرپٹ ہیلتھ سسٹم۔ جس برائی اور خامی کا سوچو وہ یہاں ہے مگر میں اس جگہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ان لوگوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر میرے ہاتھ میں شفا ہے تو پھر سب سے پہلے یہ شفا میرے اپنے لوگوں کے حصے میں آنی چاہئے۔"

سالار بہت دیر تک کچھ نہیں بول سکا۔ گاڑی میں یک دم خاموشی چھا گئی تھی۔

"تم نے مجھ سے تو یہ سوال پوچھ لیا کہ میں پاکستان کیوں آ گیا، کیا اب میں تم سے یہ سوال پوچھوں کہ تم پاکستان کیوں نہیں آ جاتے؟" فرقان نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں یہاں نہیں رہ سکتا۔" سالار نے بے اختیار کہا۔

"تم پیسے اور سہولتوں کی وجہ سے یہ کہہ رہے ہو؟"

"نہیں، پیسہ یا سہولتیں میرا مسئلہ نہیں ہیں، نہ اب، نہ ہی پہلے کبھی۔ تم میرا فیملی بیک گراؤنڈ جان چکے ہو۔"

"پھر؟"

"پھر ... کچھ بھی نہیں۔ بس میں یہاں نہیں آ سکتا۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

"یہاں تمہاری ضرورت ہے۔"

"کس کو؟"

"اس ملک کو۔"

سالار بے اختیار مسکرایا۔ "میں تمہاری طرح کی حب الوطنی نہیں رکھتا۔ میرے بغیر بھی سب کچھ ٹھیک ہے یہاں۔ ایک ڈاکٹر کی اور بات ہے مگر ایک اکانومسٹ تو کسی کو زندگی اور موت نہیں دے سکتا۔"

باب ٦

"تم جو سروسز وہاں دے رہے ہو، وہ یہاں کے اداروں کو دے سکتے ہو۔ جو کچھ اپنے لیکچرز میں وہاں کی یونیورسٹیز میں سکھا رہے ہو، وہ یہیں کی یونیورسٹیز میں سکھا سکتے ہو۔"

اس کا دل چاہا، وہ فرقان سے کہے کہ وہ یہیں آکر کچھ بھی سکھانے کے قابل نہیں رہ سکے گا، مگر وہ خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔

"تم نے افریقہ کی غربت، بھوک اور بیماری دیکھی ہے۔ تم یہاں کی غربت، بھوک اور بیماری دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔"

"یہاں صورت حال ان ملکوں کی طرح خراب نہیں ہے فرقان! یہاں اتنی پسماندگی نہیں ہے۔"

"اسلام آباد کے جس سیکٹر میں تم پلے بڑھے ہو، وہاں رہ کر ارد گرد کی زندگی کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ تم اسلام آباد کے قریبی گاؤں میں چلے جاؤ تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ یہ ملک کتنا

خوشحال ہے۔"

"فرقان! میں تمہارے اس پروجیکٹ میں کچھ کنٹری بیوشن کرنا چاہتا ہوں۔" سالار نے یک دم بات کا موضوع بدلنا چاہا۔

"سالار! میرے اس پروجیکٹ کو فی الحال کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اگر ایسا کوئی کام کرنا چاہتے ہو تو تم خود ایسے ہی کسی گاؤں میں اس طرح کا کام شروع کرو، تمہارے پاس فنڈز کی کمی نہیں ہوگی۔"

"میرے پاس وقت نہیں ہے، میں امریکہ میں بیٹھ کر یہ سب کچھ نہیں چلا سکتا۔ تم اگر یہ چاہتے ہو تو کسی دوسرے گاؤں میں بھی کوئی اسکول قائم کیا جائے تو میں اسے سپورٹ کرنے کو تیار ہوں۔ میرے لئے ذاتی طور پر وقت دینا مشکل ہے۔"

فرقان اس بار خاموش رہا۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ سالار اب اس کے اس اصرار پر کچھ جھنجلا رہا تھا۔ بات کا موضوع ایک بار پھر فرقان کے گاؤں کی طرف مڑ گیا۔

وہ دن سالار کی زندگی کے یادگار ترین دنوں میں سے ایک تھا۔ وہ اس اسکول کو دیکھ کر واقعی بہت متاثر ہوا تھا مگر اس سے بھی زیادہ متاثر وہ اس ڈسپنسری کو دیکھ کر ہوا تھا جہاں وہ گیا تھا۔ اسے ایک چھوٹا ہاسپٹل کہنا زیادہ بہتر تھا۔ ڈاکٹر کے نہ ہونے کے باوجود وہ بڑے منظم طریقے سے چلایا جا رہا تھا۔ اس دن فرقان کی آمد متوقع تھی اور اس کے انتظار میں مریضوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی فرقان آتے ہی مصروف ہو گیا۔ ہاسپٹل کا احاطہ مریضوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں ہر عمر اور ہر طرح کے مریض تھے۔ نوزائیدہ بچے، عورتیں، بوڑھے، نوجوان۔

سالار احاطے میں لاشعوری طور پر چہل قدمی کرتا رہا۔ وہاں موجود چند لوگوں نے اسے بھی ڈاکٹر سمجھا اور اس کے قریب چلے آئے۔ سالار ان سے بات چیت کرنے لگا۔

زندگی میں پہلی بار وہ کینسر کے ایک اسپیشلسٹ کو ایک فزیشن کے طور پر چیک اپ کرتے اور نسخے لکھتے دیکھ رہا تھا اور اس نے اعتراف کیا۔ اس نے زندگی میں فرقان سے اچھا ڈاکٹر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بے حد پروفیشنل اور بے حد نرم مزاج تھا۔ اس تمام عمل میں اس کے چہرے کی مسکراہٹ ایک لمحہ کے لئے بھی غائب نہیں ہوئی تھی۔ سالار کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ کو کسی چیز کے ساتھ چپکایا ہوا تھا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد اس نے سالار کو ایک آدمی کے ساتھ اسکول بھجوا دیا تھا وہ وہیں اس کے والدین سے ملا۔

وہ اس کی آمد سے پہلے ہی باخبر تھے، یقیناً فرقان نے ان کو فون پر بتا دیا تھا وہ ان کے ساتھ اسکول میں پھرتا رہا۔ اسکول کی عمارت اس کی توقعات کے برعکس بہت وسیع اور بہت اچھی بنی ہوئی تھی۔ اسے وہاں موجود بچوں کی تعداد دیکھ کر بھی حیرت ہو رہی تھی۔

وہاں کچھ گھنٹے رکنے کے بعد وہ ان دونوں کے ساتھ ان کی حویلی میں آ گیا، حویلی کے بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی بے اختیار اس کا دل خوش ہوا تھا۔ اسے اس گاؤں میں اس قسم کے شاندار لان کی توقع نہیں تھی۔ وہاں پودوں کی بھرمار تھی مگر بے ترتیبی نہیں تھی۔

"بہت شاندار لان ہے، بہت آرٹسٹک۔" وہ تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکا۔

"یہ شکیل صاحب کا شوق ہے۔" فرقان کی امی نے کہا۔

"میرا اور نوشین کا۔" فرقان کے والد نے اضافہ کیا۔

"نوشین؟" سالار نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"فرقان کی بیوی ... یہ آرٹسٹک ٹچ اسی کا ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"فرقان نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی فیملی لاہور میں ہوتی ہے۔" سالار کو یاد تھا۔

"ہاں، وہ لوگ لاہور میں ہی ہوتے ہیں مگر فرقان مہینے میں ایک ویک اینڈ یہاں گزارتا ہے پھر وہ اپنی فیملی بھی یہاں لاتا ہے۔ یہ سائیڈز اس کے بچوں کے لئے لگوائی ہیں۔ نوشین بھی ڈاکٹر ہے۔ ابھی بچے چھوٹے ہیں، اس لئے پریکٹس نہیں کرتی مگر جب یہاں آتی ہے تو فرقان کے ساتھ ڈسپنسری جاتی ہے۔ اس بار وہ اپنے بھائی کی شادی میں مصروف تھی، اس لئے فرقان کے ساتھ نہیں آ سکی۔" وہ ادھر ادھر نظریں دوڑاتا ان کی باتیں سنتا رہا۔

وہ ان کے ساتھ لنچ کرنے کے لئے گھر پر آیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ کچھ دیر تک فرقان بھی آ جائے گا مگر جب کھانا شروع ہو گیا تو اس نے فرقان کے بارے میں پوچھا۔

"وہ دوپہر کا کھانا یہاں نہیں کھاتا۔ صرف ایک سینڈوچ اور چائے کا کپ لیتا ہے۔ اس میں بھی پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگتے۔ اس کے پاس مریض اتنے ہوتے ہیں کہ وہ شام تک بالکل فارغ نہیں ہوتا۔ کھانا وہ بالکل بھول جاتا ہے۔"

فرقان کی امی نے اس سے کہا۔ وہ ان کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے کھانا کھانے لگا۔ فرقان کے والد فنانس ڈویژن میں ہی کام کرتے رہے تھے اور بیسویں گریڈ میں ریٹائر ہوئے تھے۔ یہ جان کر کہ سالار کا تعلق بھی فنانس سے ہی تھا۔ ان کے جوش میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ سالار کو ان سے باتیں کرتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا۔ سالار نے ان سے اس اسکول کے حوالے سے بات کی۔

"اسکول کے لئے ہمیں فی الحال کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس خاصے فنڈز ہیں۔ فرقان کا ایک دوست ایک نیا بلاک بھی بنوا رہا ہے بلکہ بن ہی چکا ہے، تم نے تو دیکھا ہی ہے۔ ہاں، تم اگر کچھ کرنا چاہتے ہو تو ڈسپنسری کے لئے کرو۔ ہمیں ایک مستقل ڈاکٹر کی ضرورت ہے اور ہم اس کے لئے ہیلتھ منسٹری میں بہت دفعہ درخواستیں دے چکے ہیں۔ فرقان نے اپنے تعلقات بھی استعمال کئے ہیں مگر

کوئی بھی ڈاکٹر یہاں مستقل طور پر آ کر رہنے کو تیار نہیں اور ہمیں ایک ڈاکٹر کی اشد ضرورت ہے۔ تم نے مریضوں کی تعداد تو دیکھی ہی ہو گی۔ ایک قریبی گاؤں میں ایک ڈسپنسری اور ڈاکٹر ہے۔ مگر ڈاکٹر مستقل چھٹی پر ہے اور اگلا ڈاکٹر بھی آنے سے پہلے ہی چھٹی پر چلا جاتا ہے۔"

"میں اس سلسلے میں جو کچھ کر سکا ضرور کروں گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس اسکول کے لئے بھی کچھ کروں۔ میں واپس جانے کے بعد کوشش کروں گا کہ آپ کو یونیسکو کی طرف سے کسی این جی او کے ذریعے ہر سال کچھ گرانٹ بھی ملتی رہے۔"

"لیکن ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب کچھ جو تم نے دیکھا ہے یہ سب ہم لوگوں نے خود کیا ہے۔ ہماری فیملی نے، رشتہ داروں نے، فیملی فرینڈز نے، میرے واقف کاروں نے، میرے بچوں کے دوستوں نے۔ ہمیں کبھی کسی حکومتی یا بین الاقوامی ایجنسی کی گرانٹ کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ کب تک یونیسکو آ کر ہمارے لوگوں کی بھوک، جہالت اور بیماری ختم کرتی رہے گی۔ جو کام ہم اپنے وسائل سے کر سکتے ہیں وہ ہمیں اپنے وسائل سے ہی کرنے چاہئیں۔"

"میں صرف یہ چاہتا تھا کہ آپ اس پروجیکٹ کو اور بڑھائیں۔" سالار بے اختیار بولتے ہوئے لڑکھڑایا۔

"یہ بہت بڑھ جائے گا، تم بیس ۲۰ سال بعد یہاں آ کر دیکھو گے تو یہ گاؤں تمہیں ایک مختلف گاؤں لگے گا۔ جتنی غربت تم نے آج یہاں دیکھی ہے وہ تب نہیں ہو گی۔ ان کا "کل" آج سے مختلف ہو گا۔"

فرقان کے والد نے بے حد اعتماد سے کہا۔ سالار چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا۔

سہ پہر کے قریب اسے فرقان نے ڈسپنسری سے فون کیا۔ کچھ دیر کی گفتگو کے بعد اس نے سالار سے کہا۔

"اب تمہیں واپس اسلام آباد کے لئے نکل جانا چاہئے۔ میں چاہتا تھا کہ خود تمہیں واپس چھوڑ کر آؤں مگر یہاں بہت رش ہے جو لوگ دوسرے گاؤں سے آتے ہیں اگر میں انہیں آج چیک نہیں کر سکا تو انہیں بہت زحمت ہو گی، اس لئے میں اپنے ڈرائیور کو بھجوا رہا ہوں۔ وہ گاڑی میں تمہیں اسلام آباد چھوڑ آئے گا۔" اس نے پروگرام طے کیا۔

"او کے۔" سالار نے کہا۔

"جانے سے پہلے ڈسپنسری آ کر مجھ سے مل لینا۔" اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

سالار نے ایک بار پھر فرقان کے والدین کے ساتھ چائے پی۔ گاڑی تب تک وہاں آ چکی تھی، پھر وہ وہاں سے گاڑی میں فرقان کے پاس چلا گیا۔ صبح والی بھیڑ اب کم ہو چکی تھی۔ وہاں اب صرف پچیس تیس کے قریب لوگ تھے۔ فرقان ایک بوڑھے آدمی کا معائنہ کر رہا تھا۔ سالار کو دیکھ کر مسکرایا۔

"میں دو منٹ میں انہیں چھوڑ کر آتا ہوں۔"

اس نے مریض سے کہا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سالار کے ساتھ چلتا ہوا وہ باہر گاڑی تک آیا۔

"تم کب تک پاکستان میں ہو؟" اس نے سالار سے پوچھا۔

"ڈیڑھ ہفتہ۔"

"پھر تو دوبارہ ملاقات نہیں ہو سکے گی تم سے کیونکہ میں تو اب اگلے ہی ماہ اسلام آباد اور یہاں آؤں گا لیکن میں تمہیں فون کروں گا، تمہاری فلائٹ کب ہے؟"

سالار نے اس کے سوال کو نظر انداز کیا۔

"ملاقات کیوں نہیں ہو سکتی، میں لاہور آ سکتا ہوں، اگر تم انوائٹ کرو۔" فرقان کچھ حیران انداز میں مسکرایا۔

سالار اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

سالار نہیں جانتا تھا اسے کون سی چیز اس طرح اچانک فرقان کے اتنے قریب لے آئی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ فرقان کو کیوں اتنا پسند کر رہا تھا۔ وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

فرقان کے ساتھ اس کا گاؤں دیکھنے کے چار دن بعد وہ لاہور گیا۔ وہ وہاں ایک دن کے لئے گیا تھا اور اس نے فرقان کو فون پر اس کی اطلاع دی۔ فرقان نے اسے ائیرپورٹ پر پک کرنے اور اپنے ساتھ رہنے کی آفر کی، مگر اس نے انکار کر دیا۔

وہ فرقان سے طے شدہ پروگرام کے مطابق چار بجے کے قریب اس کے گھر پہنچا۔ وہ ایک اچھے علاقے میں ایک عمارت کے گراؤنڈ فلور کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ دروازے کے ساتھ موجود بیل دبا کر وہ خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ اندر سے یک دم کسی بچے کے بھاگنے کی آواز آئی۔ ایک چار پانچ سال کی بچی ڈور چین کی وجہ سے دروازے میں آنے والی جھری سے اس کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے؟" سالار اسے دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرایا تھا مگر اس بچی کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہیں آئی۔ وہ بڑی سنجیدگی سے سالار سے پوچھ رہی تھی۔

"بیٹا! مجھے آپ کے پاپا سے ملنا ہے۔"

اس بچی اور فرقان کے چہرے میں اتنی مماثلت تھی کہ اس کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ فرقان کی بیٹی تھی۔

"پاپا اس وقت کسی سے نہیں ملتے۔" اسے بڑی سنجیدگی سے اطلاع دی گئی۔

"مجھ سے مل لیں گے۔" سالار نے قدرے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ سے کیوں مل لیں گے؟" فوراً جواب آیا۔

"یہ تو میں تمہیں راستے میں ہی بتاؤں گا۔" وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

☆ ☆.....☆

"میں وہاں جا کر کروں گا کیا؟" سالار نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے فرقان سے پوچھا۔

"وہی جو میں کرتا ہوں۔" وہ سگنل پر گاڑی روکتے ہوئے بولا۔

"اور تم وہاں کیا کرتے ہو؟"

"یہ تم وہاں پہنچ کر دیکھ لینا۔"

فرقان اسے کسی ڈاکٹر سبط علی کے پاس لے کر جا رہا تھا جس کے پاس وہ خود بھی جایا کرتا تھا۔ وہ کوئی مذہبی عالم تھے اور سالار کو مذہبی علماء سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ پچھلے چند سالوں میں اتنے مذہبی علماء کے اصلی چہرے دیکھ چکا تھا کہ وہ اب مزید ان جگہوں پر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"فرینکلی اسپیکنگ فرقان! میں اس ٹائپ کا ہوں نہیں جس ٹائپ کا تم مجھے سمجھ رہے ہو۔" اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد فرقان کو مخاطب کیا۔

"کس ٹائپ کے؟" فرقان نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"یہی پیری مریدی یا بیعت وغیرہ یا جو بھی تم سمجھ لو۔" اس نے قدرے صاف گوئی سے کہا۔

"اسی لئے تو میں تمہیں وہاں لے جا رہا ہوں، تمہیں مدد کی ضرورت ہے؟" سالار نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سڑک کو دیکھ رہا تھا۔

"کیسی مدد؟"

"اگر کوئی حافظِ قرآن رات کو ایک پارہ پڑھے اور پھر بھی نیند لانے کے لئے اسے نیند کی گولیاں کھانی پڑیں تو پھر کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ غلط ضرور ہے۔ کئی سال پہلے مجھے بھی ایک بار بہت ڈپریشن ہوا تھا۔ میرا ذہن بھی بہت الجھ گیا تھا پھر کوئی مجھے ڈاکٹر صاحب کے پاس لے کر گیا تھا۔ آٹھ دس سال ہو گئے ہیں مجھے اب وہاں جاتے۔ تم سے مل کر مجھے احساس ہوا کہ تمہیں بھی میری طرح کسی کی مدد کی ضرورت ہے، رہنمائی کی ضرورت ہے۔" فرقان نے نرم لہجے میں کہا۔

"تم کیوں میری مدد کرنا چاہتے ہو؟"

"کیونکہ دین کہتا ہے کہ تم میرے بھائی ہو۔" اس نے موڑ موڑتے ہوئے کہا۔ سالار نے گردن سیدھی کر لی۔ وہ اس سے مزید کیا پوچھتا۔

اسے مذہبی علماء سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہر عالم اپنے فرقے کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملانے میں ماہر تھا۔ ہر عالم کو اپنے علم پر غرور تھا۔ ہر عالم کا لب لباب یہی ہوتا تھا۔ میں اچھا ہوں، باقی سب برے ہیں۔ میں کامل ہوں، باقی سب نامکمل ہیں۔ ہر عالم کو دیکھ کر لگتا اس نے علم کتابوں سے

نہیں، براہ راست وحی کے ذریعے حاصل کیا ہے جس میں غلطی کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اس نے آج تک ایسا عالم نہیں دیکھا تھا جو اپنے اوپر تنقید سنے اور برداشت بھی کرے۔

سالار خود اہلِ سنت مسلک سے تعلق رکھتا تھا مگر جو آخری چیز وہ کسی سے ڈسکس کرنا چاہتا تھا وہ مسلک اور فرقہ تھا اور ان مذہبی علماء کے پاس ڈسکس کرنے کے لئے سب سے پہلی چیز مسلک اور فرقہ ہی تھا۔ ان علماء کے پاس جاتے جاتے وہ رفتہ رفتہ ان سے برگشتہ ہو گیا تھا۔ ان کی پوٹلی میں صرف علم بھرا ہوا تھا، عمل نہیں۔ وہ "غیبت ایک گناہ" پر لمبا چوڑا لیکچر دیتے، قرآنی آیات اور احادیث کے حوالے دیتے اور اگلی ہی سانس میں وہ اپنے کسی ہم عصر عالم کا نام لے کر اس کا مذاق اڑاتے، اس کی علمی جہالت کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔

وہ اپنے پاس آنے والے ہر ایک کا پورا بائیو ڈیٹا جانتے اور پھر اگر وہ بائیو ڈیٹا ان کے کام کا ہوتا تو مطالبوں اور سفارشوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جاتا اور اس بائیو ڈیٹا کو وہ اپنے پاس آنے والوں کو متاثر کرنے کے لئے بھی استعمال کرتے کہ ان کے پاس کس وقت، کون آیا تھا۔ کس طرح کون ان کے علم سے فیض یاب ہوا تھا۔ کون بڑا آدمی ہر وقت ان کی جوتیاں سیدھی کرتے رہنے کو تیار رہتا ہے۔ کس نے انہیں گھر بلایا اور کس طرح خدمت کی۔ وہ اب تک جن عالموں کے پاس ایک بار گیا تھا دوبارہ نہیں گیا اور اب فرقان اسے پھر ایک عالم کے پاس لے کر جا رہا تھا۔

وہ شہر کے اچھے علاقوں میں سے ایک میں جا پہنچے تھے۔ وہ علاقہ اچھا تھا، مگر بہت پوش نہیں تھا۔ اس سڑک پر پہلے بھی بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ فرقان نے بھی ایک مناسب جگہ پر گاڑی سڑک کے کنارے پارک کر دی، پھر وہ گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ سالار نے اس کی پیروی کی۔ تین چار منٹ چلتے رہنے کے بعد وہ ان بنگلوں میں سے ایک نسبتاً سادہ مگر پروقار اور چھوٹے بنگلے کے سامنے پہنچ گئے۔ نیم پلیٹ پر ڈاکٹر سبط علی کا نام تحریر تھا۔ فرقان بلا جھجک اندر داخل ہو گیا۔ سالار نے اس کی پیروی کی۔

بنگلے کے اندر موجود چھوٹے سے لان میں ایک مالی اپنے کام میں مصروف تھا۔ فرقان نے پورچ میں ایک ملازم کے ساتھ دعا سلام کا تبادلہ کیا پھر وہ مزید کچھ آگے چلتا ہوا ایک دروازے کے سامنے پہنچ گیا اور وہاں اس نے اپنا جوتا اتار دیا۔ وہاں پہلے بھی بہت سے جوتے پڑے تھے۔ اندر سے باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سالار نے بھی دیکھا دیکھی اپنے جوتے اتار دیئے۔ سالار نے ایک قدم اس کے پیچھے اندر رکھتے ہوئے ایک ہی نظر میں پورے کمرے کا جائزہ لے لیا۔ وہ ایک کشادہ کمرے میں تھا جس کے فرش پر کارپٹ بچھا ہوا تھا اور بہت سے فلور کشنز بھی پڑے ہوئے تھے۔ کمرے میں فرنیچر کے نام پر صرف چند معمولی سی چیزیں تھیں اور دیواروں پر کچھ قرآنی آیات کیلی گرافی کی صورت میں لگی ہوئی تھیں۔ کمرے میں بیس پچیس کے قریب مرد تھے جو آپس میں گفتگو میں مصروف تھے۔ فرقان نے اندر

"کیونکہ میں ان کا دوست ہوں، آپ انہیں جا کر بتائیں گی کہ سالار انکل آئے ہیں تو وہ مجھ سے مل لیں گے۔" سالار نے نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی مسکراہٹ سے متاثر نہیں ہوئی۔

"لیکن آپ میرے انکل تو نہیں ہیں۔"

سالار کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

"آپ نہ ہنسیں۔" وہ بے اختیار بگڑی۔ سالار پنجوں کے بل اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

"اچھا میں نہیں ہنستا۔" اس نے چہرے کی مسکراہٹ کو چھپایا۔

"آپ اس فراک میں بہت اچھی لگ رہی ہیں۔" وہ اب کچھ قریب سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ اس کی تعریف نے دروازے کی جھری میں سے جھانکتی ہوئی محترمہ کے تاثرات اور موڈ میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔

"لیکن آپ مجھے اچھے نہیں لگے۔"

اس کے جملے سے زیادہ اس کے تاثرات نے سالار کو محظوظ کیا۔ وہ اب کچھ دور سے فلیٹ کے اندر کسی کے قدموں کی آواز سن رہا تھا۔ کوئی دروازے کی طرف ہی آ رہا تھا۔

"کیوں، میں کیوں اچھا نہیں لگا؟" اس نے مسکراتے ہوئے اطمینان سے پوچھا۔

"بس نہیں اچھے لگے۔" اس نے ناگواری سے گردن کو جھٹکا۔

"نام کیا ہے آپ کا؟" وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

"امامہ!" سالار کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے دروازے کی جھری میں سے امامہ کے عقب میں فرقان کو دیکھا۔ وہ امامہ کو اٹھاتے ہوئے دروازہ کھول رہا تھا۔

سالار کھڑا ہو گیا۔ فرقان نہا کر نکلا تھا، اس کے بال گیلے اور بے ترتیب تھے۔ سالار نے مسکرانے کی کوشش کی وہ فوری طور پر کامیاب نہیں ہو سکا۔ فرقان نے اس سے ہاتھ ملایا۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" وہ اس کے ساتھ اندر جاتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں اب ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہے تھے۔

امامہ، فرقان کی گود میں چڑھی ہوئی تھی اور اسے مسلسل کان میں کچھ بتانے کی کوشش کر رہی تھی، جسے فرقان مسلسل نظرانداز کر رہا تھا۔

"انکل سالار سے ملی ہیں آپ!" فرقان نے سالار کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے امامہ سے پوچھا۔ وہ اب خود بھی صوفے پر بیٹھ رہا تھا۔

"یہ مجھے اچھے نہیں لگتے۔" اس نے باپ تک اپنی ناپسندیدگی پہنچائی۔

"بہت بری بات ہے امامہ! ایسے نہیں کہتے۔" فرقان نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔

"آپ انکل کے پاس جائیں اور ان سے ہاتھ ملائیں۔"

اس نے امامہ کو نیچے اتار دیا۔ وہ سالار کی طرف جانے کے بجائے یک دم بھاگتے ہوئے باہر چلی گئی۔

"حیرانی کی بات ہے کہ اسے تم اچھے نہیں لگے، ورنہ اس کو میرا ہر دوست اچھا لگتا ہے۔ آج اس کا موڈ بھی کچھ آف ہے۔" فرقان نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی۔

"یہ نام کا اثر ہے مجھے حیرانی ہوتی اگر اسے میں اچھا لگتا۔" سالار نے سوچا۔

چائے پیتے ہوئے وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے اور باتوں کے دوران سالار نے اس سے کہا۔

"ایک دو ہفتے تک تم لوگوں کی ڈسپنسری میں ڈاکٹر آ جائے گا۔" اس نے سرسری انداز میں کہا۔

"یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔" فرقان یک دم خوش ہوا۔

"اور اس بار وہ ڈاکٹر وہیں رہے گا۔ اگر نہ رہے تو مجھے بتانا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں۔ ڈسپنسری میں ایک ڈاکٹر کی دستیابی سب سے بڑا مسئلہ رہا ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ رکا۔ "وہاں جانے سے پہلے مجھے توقع نہیں تھی کہ تم اور تمہاری فیملی اس کام کو اس اسکیل پر اور اتنے آرگنائزڈ انداز میں کر رہے ہو میں تم لوگوں کے کام سے درحقیقت بہت متاثر ہوا ہوں اور میری آفر ابھی بھی وہی ہے۔ میں اس پروجیکٹ کے سلسلے میں تمہاری مدد کرنا چاہوں گا۔"

اس نے سنجیدگی سے فرقان سے کہا۔

"سالار! میں نے تم سے پہلے بھی کہا ہے کہ میں چاہوں گا، تم اسی طرح کا کوئی پروجیکٹ وہاں کسی دوسرے گاؤں میں شروع کرو۔ تمہارے پاس مجھ سے زیادہ وسائل ہیں اور تم مجھ سے زیادہ اچھے طریقے سے یہ پروجیکٹ چلا سکتے ہو۔"

"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا میرا مسئلہ وقت ہے، میں تمہارے جتنا وقت نہیں دے سکتا اور پھر میں پاکستان میں رہ بھی نہیں سکتا۔ تمہاری طرح میرے فیملی ممبرز بھی اس معاملے میں میری مدد نہیں کر سکتے۔" سالار نے اسے اپنا مسئلہ بتایا۔

"چلو اس پر بعد میں بات کریں گے، ابھی تو تم چائے پیو پھر میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔" فرقان نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟"

داخل ہوتے ہی بلند آواز میں سلام کیا اور پھر چند لوگوں کے ساتھ کچھ خیر مقدمی کلمات کا تبادلہ کیا پھر وہ ایک خالی کونے میں بیٹھ گیا۔

"ڈاکٹر سید سبط علی کہاں ہیں؟" سالار نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے مدھم آواز میں پوچھا۔

"آٹھ بجتے ہی وہ اندر آ جائیں گے، ابھی تو صرف سات پچپن ہوئے ہیں۔" فرقان نے اس سے کہا۔

سالار گردن ہلا کر کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں ہر عمر کے افراد تھے۔ چند ٹین ایج لڑکے، اس کے ہم عمر افراد، فرقان کی عمر کے لوگ، ادھیڑ عمر اور کچھ عمر رسیدہ بھی۔ فرقان اپنی دائیں طرف بیٹھے کسی آدمی کے ساتھ مصروف گفتگو تھا۔

ٹھیک آٹھ بجے اس نے ساٹھ پینسٹھ سال کے ایک آدمی کو ایک اندرونی دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کی توقع کے برعکس وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی بھی استقبال کے لئے احتراماً کھڑا نہیں ہوا۔ آنے والے نے ہی سلام میں پہل کی تھی جس کا جواب وہاں موجود لوگوں نے دیا۔ آنے والے کے احترام میں کھڑا نہ ہونے کے باوجود سالار اب اچانک وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کی نشست کے انداز میں احترام دیکھ رہا تھا۔ وہ سب یک دم بہت چوکنے اور محتاط نظر آنے لگے تھے۔

آنے والے یقیناً ڈاکٹر سید سبط علی تھے۔ وہ کمرے کی ایک دیوار کے سامنے اس مخصوص جگہ پر بیٹھ گئے جنہیں شاید ان ہی کے لئے چھوڑا گیا تھا۔ وہ سفید شلوار قمیض میں ملبوس تھے۔ ان کی رنگت سرخ و سفید تھی اور یقیناً جوانی میں وہ بہت خوبصورت ہوں گے۔ ان کے چہرے پر موجود ڈاڑھی بہت لمبی نہیں تھی مگر بہت گھنی اور نفاست سے تراشی گئی تھی۔ داڑھی مکمل طور پر سفید نہیں ہوئی تھی اور کچھ یہی حال ان کے سر کے بالوں کا بھی تھا۔ سفید اور سیاہ کے امتزاج نے ان کے چہرے اور سر پر موجود بالوں کو بہت باوقار کر دیا تھا۔ وہ وہاں بیٹھ کر دائیں طرف موجود کسی آدمی کا حال دریافت کر رہے تھے۔ شاید وہ کسی بیماری سے اٹھ کر آیا تھا۔ سالار نے چند ہی لمحوں میں ان کے سراپے کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ اور فرقان باقی لوگوں کے عقب میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر سبط علی نے اپنے لیکچر کا آغاز کیا۔ ان کا لب و لہجہ بے حد شائستہ تھا اور انداز دھیما تھا۔ کمرے میں مکمل سکوت تھا، وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی بھی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ سالار کو ان کے ابتدائی چند جملوں سے ہی اندازہ ہو گیا تھا وہ ایک غیر معمولی عالم کے سامنے تھا۔

ڈاکٹر سید سبط علی شکر کے بارے میں بات کر رہے تھے۔

"انسان اپنی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز سے گزرتا ہے۔ کبھی کمال کی بلندیوں کو جا چھوتا ہے، کبھی زوال کی گہرائیوں تک جا پہنچتا ہے۔ ساری زندگی وہ ان ہی دونوں انتہاؤں کے درمیان سفر

کرتا رہتا ہے اور جس راستے پر وہ سفر کرتا ہے، وہ شکر کا ہوتا ہے یا ناشکری کا۔ کچھ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ زوال کی طرف جائیں یا کمال کی طرف، وہ صرف شکر کے راستے پر ہی سفر کرتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو صرف ناشکری کے راستے پر سفر کرتے ہیں، چاہے وہ زوال حاصل کریں یا کمال اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو ان دونوں راستوں پر سفر کرتے ہیں۔ کمال کی طرف جاتے ہوئے شکر کے اور زوال کی طرف جاتے ہوئے ناشکری کے۔ انسان اللہ کی ان گنت مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے۔ اشرف المخلوقات ہے مگر مخلوق ہی ہے۔ وہ اپنے خالق پر کوئی حق نہیں رکھتا، صرف فرض رکھتا ہے۔ وہ زمین پر ایسے کسی تریک ریکارڈ کے ساتھ نہیں اتارا گیا کہ وہ اللہ سے کسی بھی چیز کو اپنا حق سمجھ کر مطالبہ کر سکے مگر اس کے باوجود اس پر اللہ نے اپنی رحمت کا آغاز جنت سے کیا، اس پر نعمتوں کی بارش کر دی گئی اور اس سب کے بدلے اس سے صرف ایک چیز کا مطالبہ کیا گیا شکر کا۔ کیا محسوس کرتے ہیں آپ! اگر آپ کبھی زندگی میں کسی پر کوئی احسان کریں اور وہ شخص اس احسان کو یاد رکھے اور آپ کا احسان مند ہونے کے بجائے آپ کو ان مواقع کی یاد دلائے، جب آپ نے اس پر احسان نہیں کیا تھا یا آپ کو یہ جتائے کہ آپ کا احسان اس کے لئے کافی نہیں تھا۔ اگر آپ اس کے لئے "یہ" کر دیتے یا "وہ" کر دیتے تو زیادہ خوش ہوتا۔ کیا کریں گے آپ ایسے شخص کے ساتھ؟ دوبارہ احسان کرنا تو ایک طرف، آپ تو شاید اس سے تعلق رکھنا تک پسند نہ کریں۔ ہم اللہ کے ساتھ یہی کرتے ہیں۔ اس کی نعمتوں اور رحمتوں پر اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے ہم ان چیزوں کے نہ ملنے پر کڑھتے رہتے ہیں، جنہیں ہم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اللہ پھر بھی رحیم ہے، وہ ہم پر اپنی نعمتیں نازل کرتا رہتا ہے۔ ان کی تعداد میں ہمارے اعمال کے مطابق کمی بیشی کرتا رہتا ہے مگر ان کا سلسلہ کبھی بھی مکمل طور پر منقطع نہیں کرتا۔"

سالار پلکیں جھپکائے بغیر ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"شکر ادا نہ کرنا بھی ایک بیماری ہوتی ہے، ایسی بیماری جو ہمارے دلوں کو روز بروز کشادگی سے تنگی کی طرف لے جاتی ہے جو ہماری زبان پر شکوے کے علاوہ اور کچھ آنے ہی نہیں دیتی۔ اگر ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنے کی عادت نہ ہو تو ہمیں انسانوں کا شکریہ ادا کرنے کی بھی عادت نہیں پڑتی۔ اگر ہمیں خالق کے احسانوں کو یاد رکھنے کی عادت نہ ہو تو ہم کسی مخلوق کے احسان کو بھی یاد رکھنے کی عادت نہیں سیکھ سکتے۔"

سالار نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ناشکری کیا ہوتی ہے، کوئی اس سے زیادہ اچھی طرح نہیں جان سکتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں کھول کر ڈاکٹر سید سبط علی کو دیکھا۔

پورے ایک گھنٹے کے بعد انہوں نے اپنا لیکچر ختم کیا، کچھ لوگوں نے ان سے سوال کئے پھر لوگ باری باری اٹھ کر جانے لگے۔

باہر سڑک پر لوگ اپنی گاڑیوں پر بیٹھ رہے تھے، وہ بھی اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ رات اب

گہری ہو رہی تھی۔ سالار کے کانوں میں ابھی بھی ڈاکٹر سبط علی کی باتیں گونج رہی تھیں۔ فرقان گاڑی اسٹارٹ کر کے واپسی کا سفر شروع کر چکا تھا۔

سات دن پہلے وہ فرقان نامی کسی شخص سے واقف تک نہیں تھا اور سات دن میں اس نے اس کے ساتھ تعلقات کی بہت سی سیڑھیاں طے کر لی تھیں۔ اسے حیرت تھی وہ لوگوں کا عادی نہیں تھا۔ کچھ تعلقات اور روابط اوپر کہیں طے کیے جاتے ہیں۔ کس وقت کون کسے کہاں ..... کس لئے ملے گا اور زندگی میں کیا تبدیلی لے آئے گا یہ سب۔

وہ صرف ایک دن کے لئے لاہور آیا تھا، مگر وہ پاکستان میں اپنے قیام کے باقی دن اسلام آباد کے بجائے لاہور میں ہی رہا اور باقی کے دن وہ ہر روز فرقان کے ساتھ ڈاکٹر سبط علی کے پاس جاتا رہا۔ وہ ایک دن بھی ان سے براہ راست نہیں ملا۔ صرف ان کا لیکچر سنتا اور اٹھ کر آ جاتا۔

ڈاکٹر سبط علی کی زندگی کا بڑا حصہ مختلف یورپی ممالک کی یونیورسٹیز میں اسلامک اسٹڈیز اور اسلامک بینکنگ کی تعلیم دیتے گزرا تھا۔ پچھلے دس بارہ سال سے وہ پاکستان میں یہیں کی ایک یونیورسٹی سے وابستہ تھے اور فرقان تقریباً اتنے ہی عرصہ سے انہیں جانتا تھا۔

جس دن اسے لاہور سے اسلام آباد اور پھر وہاں سے واپس واشنگٹن جانا تھا اس رات پہلی بار وہ لیکچر کے ختم ہونے کے بعد فرقان کے ساتھ وہاں ٹھہر گیا۔ باری باری تمام لوگ کمرے سے نکل رہے تھے۔ ڈاکٹر سبط علی کھڑے تھے اور کچھ لوگوں سے الوداعی مصافحہ کر رہے تھے۔

فرقان اس کے ساتھ ڈاکٹر سبط علی کی طرف بڑھ آیا۔

ڈاکٹر سبط علی کے چہرے پر فرقان کو دیکھ کر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ وہ کمرے میں موجود آخری آدمی کو رخصت کر رہے تھے۔

"کیسے ہیں آپ فرقان صاحب!" انہوں نے فرقان کو مخاطب کیا۔ "بڑے دنوں کے بعد آئے آپ یہاں پر۔"

فرقان نے کوئی وضاحت دی پھر سالار کا تعارف کروایا۔

"یہ سالار سکندر ہیں، میرے دوست ہیں۔"

سالار نے اپنا نام سننے پر انہیں یک دم چونکتے دیکھا اور پھر وہ کچھ حیران ہوئے مگر اگلے ہی لمحہ ان کے چہرے پر ایک بار پھر پہلے والی مسکراہٹ تھی۔ فرقان اب اس کا تفصیلی تعارف کروا رہا تھا۔

"آئیے بیٹھئے۔" ڈاکٹر سبط علی نے فرشی نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ فرقان اور وہ ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے۔ وہ فرقان کے ساتھ اس کے پروجیکٹ کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔ سالار خاموشی سے باری باری ان دونوں کے چہرے دیکھتا رہا۔ گفتگو کے دوران ہی ان کا ملازم اندر

آیا اور انہوں نے اسے کھانا لانے کے لئے کہا۔

ملازم نے اس کمرے میں دسترخوان بچھا کر کھانا لگا دیا۔ فرقان یقیناً پہلے بھی وہاں کئی بار کھانا کھاتا رہا تھا۔

وہ جب ہاتھ دھو کر کھانا کھانے کے لئے واپس کمرے میں پہنچا اور دسترخوان پر بیٹھا تو ڈاکٹر سبط علی نے اچانک اسے مخاطب کیا۔

"آپ مسکراتے نہیں ہیں سالار؟" وہ ان کے سوال سے زیادہ سوال کی نوعیت پر گڑبڑایا۔ کچھ ہونق سا وہ انہیں دیکھتا رہا۔

"اس عمر میں اتنی سنجیدگی تو کوئی بہت مناسب بات نہیں۔" سالار کچھ حیرانی سے مسکرایا۔ پندرہ بیس منٹ کی ملاقات میں وہ یہ کیسے جان گئے تھے کہ وہ مسکرانے کا عادی نہیں رہا تھا۔ وہ فرقان کی طرف دیکھ کر کچھ جھینپا، پھر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ یہ آسان کام ثابت نہیں ہوا۔

"کیا میرا چہرہ میرے ہر احساس کو ظاہر کرنے لگا ہے کہ پہلے فرقان اور اب ڈاکٹر سبط علی مجھ سے میری سنجیدگی کی وجہ جاننا چاہتے ہیں۔" اس نے سوچا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اتنا سنجیدہ نہیں ہوں۔" اس نے ڈاکٹر سبط علی سے زیادہ جیسے خود کو بتایا۔

"ممکن ہے ایسا ہی ہو۔" ڈاکٹر سبط علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کھانے کے بعد دونوں کو رخصت کرنے سے پہلے وہ اندر گئے۔ واپسی پر ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ وہ کتاب انہوں نے سالار کی طرف بڑھا دی۔

"آپ کا تعلق معاشیات سے ہے، کچھ عرصہ پہلے میں نے اسلامی اقتصادیات کے بارے میں یہ کتاب لکھی ہے۔ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ اسے پڑھیں تاکہ آپ کو اسلامی اقتصادی نظام کے بارے میں بھی کچھ واقفیت حاصل ہو۔"

سالار نے کتاب ان کے ہاتھ سے پکڑ لی، کتاب پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اس نے مدھم آواز میں ڈاکٹر سبط علی سے کہا۔

"میں واپس جا کر بھی آپ سے رابطہ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے صرف اقتصادیات کے بارے میں نہیں سیکھنا چاہتا اور بھی بہت کچھ جاننا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر سبط علی نے نرمی سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

☆ ☆ ☆

"ڈاکٹر سبط علی صاحب کے پاس جتنے لوگ بھی آتے ہیں وہ کسی نہ کسی حوالے سے کمیونٹی ورک سے وابستہ ہیں۔ کچھ پہلے ہی اس کام میں انوالو ہوتے ہیں اور جو پہلے نہیں ہوتے وہ بعد میں ہو جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر سبط علی سے پہلی ملاقات کے بعد فرقان نے اسے بتایا۔

"ان کے پاس آنے والے زیادہ تر لوگ بہت کوالیفائیڈ ہیں۔ بڑے بڑے اداروں سے وابستہ ہیں۔ میں بھی اتفاقاً ہی ان کے پاس جانا شروع ہوا۔ لندن میں ایک بار ان کا ایک لیکچر سننے کا اتفاق ہوا پھر پاکستان آنے پر ایک دوست کے توسط سے ان سے ملنے کا موقع ملا اور اس کے بعد سے میں ان کے پاس جا رہا ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے بارے میں میرے نظریات پہلے کی نسبت اب بہت صاف اور واضح ہیں۔ ذہنی طور پر بھی میں پہلے کی نسبت اب زیادہ مضبوط ہو گیا ہوں تم اس پروجیکٹ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ اس پروجیکٹ میں میری بہت زیادہ مدد ڈاکٹر سبط علی کے پاس آنے والے لوگوں نے بھی کی۔ بہت ساری سہولیات انہیں لوگوں نے فراہم کیں اور میں یہاں اس قسم کے پروجیکٹ پر کام کرنے والا واحد نہیں ہوں اور ہم ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے ہیں۔ اس مدد کی نوعیت مختلف ہوتی ہے، مگر مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ ہم اس ملک کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔"

سالار نے اس کے آخری جملے پر عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ "یہ اتنا آسان تو نہیں ہے۔"

"ہاں ہم جانتے ہیں یہ آسان کام نہیں ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں یہ سب ہماری زندگیوں میں نہیں ہوگا مگر ہم وہ بنیاد ضرور فراہم کر دینا چاہتے ہیں، جس پر ہمارے بچے اور ان کے بعد والی نسل تعمیر کرتی رہے۔ وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہ مارتی رہے۔ کم از کم مرتے ہوئے ہم لوگوں کو یہ احساس تو نہیں ہوگا کہ ہم لوگوں نے تماشائیوں جیسی زندگی گزار دی۔ دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح ہم بھی صرف تنقید کرتے رہے۔ خرابیوں پر انگلیاں اٹھاتے رہے۔ اسلام کو صرف مسجد کی حدود تک ہی محدود کر کے بیٹھے رہے۔ اپنے اور دوسروں کی زندگیوں میں ہم نے کوئی تبدیلی لانے کی کوشش نہیں کی۔"

وہ حیرانی سے فرقان کا چہرہ دیکھتا رہا تھا۔ امامہ ہاشم، جلال انصر، سعد کے بعد وہ ایک اور مسلمان کو دیکھ رہا تھا۔ ایک اور پریکٹیکل مسلمان کو، وہ مسلمانوں کی ایک اور قسم سے آگاہ ہو رہا تھا۔ وہ مسلمان جو دین اور دنیا کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے، جو دونوں انتہاؤں کے بیچ کے راستے کو پہچانتے تھے اور اس پر چلنے کا طریقہ جانتے تھے وہ بری طرح الجھا۔

"تم نے میری آفر کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" اس نے فرقان سے کہا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا میں تم سے کیا چاہتا ہوں۔ تمہاری ضرورت ہے اس ملک کو۔ یہاں کے لوگوں کو، یہاں کے اداروں کو، تمہیں یہاں آ کر کام کرنا چاہئے۔"

سالار اس بات پر ہلکے سے ہنسا "تم کبھی اس ٹاپک کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اچھا میں اس پر سوچوں گا۔ پھر تم میری آفر کے بارے میں کیا کہو گے۔"

"میرے گاؤں کے قریب ہی ایک اور گاؤں ہے اسی حالت میں جس حالت میں دس پندرہ

سال پہلے میرا گاؤں تھا۔ میں آج کل کوشش کر رہا تھا کہ کوئی وہاں پر اسکول بنا دے۔ پرائمری اسکول تو گورنمنٹ کا وہاں ہے مگر آگے کچھ نہیں ہے۔ اگر تم وہاں اسکول شروع کر دو تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ میں اور میری فیملی تمہاری غیر موجودگی میں اسے دیکھیں گے۔ ہم اسے قائم کرنے میں بھی تمہاری مدد کریں گے مگر پھر تمہیں خود ہی اسے چلانا ہوگا۔ صرف روپیہ فراہم کر دینا کافی نہیں ہوگا۔" فرقان نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

"کل چل سکتے ہو، میرے ساتھ وہاں؟" سالار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تمہاری تو فلائٹ ہے کل صبح۔"

"نہیں میں دو دن کے بعد چلا جاؤں گا۔ ایک بار میں چلا گیا تو فوری طور پر میرے لئے واپس آنا ممکن نہیں رہے گا اور میں جانے سے پہلے یہ کام شروع کر دینا چاہتا ہوں۔"

اس نے فرقان سے کہا۔ فرقان نے سر ہلا دیا۔

☆ ☆ ☆

وہ اس رات کی فلائٹ سے اسلام آباد گئے اور پھر رات کو ہی فرقان کے گاؤں چلے گئے۔ رات وہاں قیام کرنے کے بعد صبح فجر کے وقت فرقان کے ساتھ وہ اس گاؤں میں گیا۔ دوپہر بارہ بجے تک وہ اس گاؤں کے لوگوں سے ملتے اور وہاں پھرتے رہے۔ وہیں موجود پرائمری اسکول کو دیکھ کر سالار کو یقین نہیں آیا تھا۔ وہ اپنی حالت سے کچھ بھی لگتا تھا مگر اسکول نہیں۔ فرقان کو اس کی طرح کوئی شاک نہیں لگا تھا، وہ وہاں کے حالات سے پہلے ہی بہت اچھی طرح باخبر تھا۔ وہ سال میں تین چار مرتبہ مختلف دیہات میں میڈیکل کیمپس لگوایا کرتا تھا اور وہ دیہات کی زندگی اور وہاں کی حالت سے سالار کی نسبت بہت اچھی طرح واقف تھا۔ فرقان کو شام کی فلائٹ سے واپس لاہور جانا تھا۔ وہ لوگ دو بجے کے قریب وہاں سے اسلام آباد جانے کے لئے روانہ ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

اسکول کے اس پروجیکٹ کو شروع کرنے سے پہلے سکندر عثمان سے اس کی بات ہوئی تھی۔ اس نے مختصر الفاظ میں انہیں اس پروجیکٹ کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ کسی مداخلت کے بغیر اس کی بات سنتے رہے پھر انہوں نے بڑی سنجیدگی سے اس سے کہا۔

"یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو تم؟"

"پاپا! میں اس کام کی ضرورت محسوس کرتا ہوں لوگوں کو..." انہوں نے سالار کی بات کاٹ دی۔

"میں اسکول کی بات نہیں کر رہا۔"

"پھر آپ کس چیز کی بات کر رہے ہیں؟" وہ حیران ہوا۔

"میں تمہارے لائف اسٹائل کی بات کر رہا ہوں۔"

"میرے لائف اسٹائل کو کیا ہوا؟" وہ چونکا۔ سکندر عثمان اسے دیکھتے رہے۔

"تم نے قرآن پاک حفظ کرنے کے بارے میں ہمیں اس وقت بتایا جب تم حفظ کر چکے تھے، اوکے فائن، میں نے کچھ نہیں کہا۔ تم حج پر جانا چاہتے تھے میرے اس سلسلے میں کچھ تحفظات تھے مگر میں نے تمہیں نہیں روکا۔ تم نے ہر طرح کی سوشل لائف ختم کر دی۔ میں نے اعتراض نہیں کیا۔ تم مذہب میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگے، نماز شروع کر دی وہ بھی مسجد میں۔ میں نے پھر بھی کچھ نہیں کہا۔ تم نے بزنس کرنے کے بجائے جاب کرنا چاہی وہ بھی یہاں نہیں امریکہ میں۔ میں نے تمہیں کرنے دی۔ اب تم ایک اسکول کھولنا چاہ رہے ہو۔ اب ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اس تمام معاملے پر کچھ سنجیدگی سے بات کر لیں۔" سکندر عثمان بے حد سنجیدہ تھے۔

"تمہیں اندازہ ہے کہ تمہارا یہ لائف اسٹائل تمہیں ہمارے سوشل سرکل کے لئے ناقابل قبول بنا دے گا۔ پہلے تم ایک انتہا پر تھے اب تم دوسری انتہا پر ہو۔ چھبیس، ستائیس سال کی عمر میں جن کاموں میں تم اپنے آپ کو انوالو کر رہے ہو وہ غیر ضروری ہیں۔ تمہیں اپنے کیریئر پر دھیان دینا چاہئے اور اپنے لائف اسٹائل میں تبدیلی لانی چاہئے۔

ہم جس کلاس سے تعلق رکھتے ہیں وہاں مذہب سے ایسی وابستگی بہت سے مسائل پیدا کر دیتی ہے۔" وہ سر جھکائے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

"اور صرف تمہارے لئے ہی نہیں، ہمارے لئے بھی بہت سے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ تم خود سوچو تم لوگوں کو کیا امپریشن دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ کل کو ہم یا تم خود جب اپنی کلاس کی کسی اچھی فیملی کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہو گے تو تمہاری یہ مذہبی وابستگی تمہارے لئے کتنے مسائل پیدا کرے گی تمہیں اندازہ ہے۔ کوئی بھی فیملی سکندر عثمان کا نام دیکھ کر یا تمہاری کوالیفیکیشنز دیکھ کر اپنی بیٹی کی شادی تم سے نہیں کر دے گی۔ اوپر سے تم نے اس عمر میں سوشل ورک شروع کرنے کی ٹھان لی ہے جب تمہاری عمر کے لوگ اپنے کیریئر کے پیچھے بھاگ رہے ہوتے ہیں تم یو ایس میں بہت سوشل ورک کرتے رہے ہو اتنا کافی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ تم یہ سب کچھ اپنی پرسنل لائف میں بھی شروع کر دو۔ جو پیسہ تم اس اسکول پر اور لوگوں کی زندگیاں بہتر بنانے کے لئے ضائع کرو گے اسے تم اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کرو۔ انہیں آسائشیں دینے کے لئے، ایک آرام دہ لائف اسٹائل دینے کے لئے۔ اپنے آپ پر خرچ کرو، تین سو سال کی زندگی نہیں ہے تمہاری، پھر اتنی سی عمر میں بڑھاپے کو کیوں سوار کر لیا ہے تم نے اپنے اعصاب پر۔ ایک حادثہ ہوا، برا ہوا۔ تم نے سبق سیکھا۔ بہت اچھا کیا۔ بس اتنا کافی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم اس عمر میں تسبیح پکڑ لو۔" وہ رکے۔ "کیا میری بات کو

سمجھ رہے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"پاپا! میں نے تسبیح نہیں پکڑی ہے۔" سالار نے ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

"آپ نے زندگی میں توازن رکھنے کی بات کی میں وہ توازن ہی رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں اپنے کیریئر میں کہاں پر کھڑا ہوں آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ میری کارکردگی سے آپ واقف ہیں۔"

"میں واقف ہوں اور اسی لئے تم سے کہہ رہا ہوں کہ اگر تم اس طرح کی سرگرمیوں میں خود کو انوالو نہ کرو تو تم بہت آگے جا سکتے ہو۔" سکندر نے کہا۔

"میں کہیں نہیں جا سکتا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں یہ سب کچھ چھوڑ دوں تو کیریئر کی کسی ماؤنٹ ایورسٹ تک پہنچ جاؤں گا، تو ایسا نہیں ہے۔" اس نے توقف کیا۔

"تم اپنے مستقبل کے بارے میں بھی سوچو۔ اپنی شادی کے بارے میں، ایسی اپروچ رکھنے پر تم کو کہاں قبول کیا جائے گا۔"

"میں نے سوچا ہے پاپا! میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

سکندر رکے۔

"بچکانہ سوچ ہے۔ ہر ایک یہی کہتا ہے۔ تمہیں تو پتا "ایڈونچر" یاد رکھنا چاہئے۔"

ان کا اشارہ کس طرف تھا وہ جانتا تھا وہ بہت دیر کچھ نہیں کہہ سکا۔ یہ بھی نہیں کہ وہ اس ایڈونچر کی وجہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"مجھے یاد ہے۔" بہت دیر بعد اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"میں آپ کے سوشل سرکل میں بہت پہلے ہی مس فٹ ہو چکا ہوں اور میں یہاں جگہ بنانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ مجھے اس سوشل سرکل میں کوئی نیا تعلق یا رشتہ بھی قائم نہیں کرنا۔

مجھے پروا نہیں کہ لوگ، میرے بہن بھائی، میرا مذاق اڑائیں گے یا مجھ پر ہنسیں گے۔ میں اس سب کے لئے ذہنی طور پر تیار ہوں۔ جہاں تک سوال اس پروجیکٹ کا ہے۔ پاپا مجھے اسے شروع کرنے دیں۔ میرے پاس بہت پیسہ ہے۔ اس پروجیکٹ کو شروع کرنے کے بعد بھی مجھے فٹ پاتھ پر رہنا نہیں پڑے گا۔ کچھ لوگوں کو جسم کی بیماری ہوتی ہے، کچھ کو روح کی۔ جسم کی بیماری کے لئے لوگ ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ روح کی بیماری کے لئے لوگ وہی کرتے ہیں جو میں کر رہا ہوں۔ جو میں کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس پیسے سے سب کچھ خرید سکتا ہوں صرف سکون نہیں خرید سکتا۔ زندگی میں پہلی بار میں سکون حاصل کرنے کے لئے اس پیسے کو انویسٹ کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھے سکون مل جائے۔" سکندر عثمان کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اس سے کیا کہیں۔

☆......☆——☆

واپس واشنگٹن پہنچ کر وہ ایک بار پھر پہلے کی طرح مصروف ہو گیا تھا مگر اس بار فرق یہ تھا کہ وہ مسلسل پاکستان میں فرقان اور ڈاکٹر سبط علی کے ساتھ رابطے میں تھا۔ فرقان اسے اسکول کے بارے میں ہونے والی تفصیلات سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔

یونیسیف میں اس طرح کا کام اس کی جاب کا حصہ تھا۔ اسے اس کام کے لئے بہت اچھا معاوضہ دیا جاتا تھا مگر پاکستان کے اس گاؤں میں اس طرح کے کام کا آغاز اور وہ بھی اپنے وسائل سے۔ چند سال پہلے کے سالار سکندر کو جاننے والے کبھی بھی اس بات پر یقین نہیں کرتے۔ خود اسے بھی یقین نہیں آتا تھا کہ وہ کبھی اس طرح کا کام کرنے کا سوچ سکتا تھا مگر یہ صرف اس پروجیکٹ کے لئے اپنے اکاؤنٹ سے پیسہ نکالتے ہوئے اسے اندازہ ہوا تھا کہ اس کے لئے یہ پروجیکٹ کم از کم مالی لحاظ سے مشکل نہیں تھا۔

پچھلے تین سال میں اس کے اخراجات میں بہت کمی آ گئی تھی۔ بہت ساری وہ چیزیں اس کی زندگی سے نکل گئی تھیں جن پر وہ اندھا دھند پیسہ خرچ کرتا تھا۔ وہ اپنے بینک اکاؤنٹ میں جمع رقم جان کر حیران ہو گیا تھا۔ وہ ایسا شخص نہیں تھا جس سے پیسہ جمع کرنے کی توقع کی جا سکتی۔ ایم فل کے لئے اس کے پاس اسکالرشپ تھا اسے کم از کم اس کے لئے اپنے پاس سے کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس دن اپنے اپارٹمنٹ میں چلتے پھرتے اس نے پہلی بار وہاں موجود تمام چیزوں کو غور سے دیکھا تھا۔ اس کے اپارٹمنٹ میں کہیں بھی کوئی بھی مہنگی چیز نہیں تھی بلکہ سامان بھی بہت محدود تھا۔ اس کا کچن بھی کھانے پینے کی چیزوں سے تقریباً خالی تھا۔ کافی، چائے، دودھ اور اسی طرح کی چند دوسری چیزیں۔ اس کا اپنے اپارٹمنٹ میں بہت کم وقت گزرتا تھا جو وقت گزرتا تھا وہ سونے میں گزرتا۔

یونیسیف میں اپنی جاب پر جاتے ہوئے بھی اس کے پاس پہلے سے موجود کپڑوں اور دوسری اشیاء کا اتنا انبار موجود تھا کہ وہ اس معاملے میں بھی لاپروائی برتتا رہا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے آخری بار اس طرح کی کوئی چیز کب خریدی تھی۔ اپنے ساتھ کام کرنے والوں اور یونیورسٹی میں اپنے کچھ کلاس فیلوز کے علاوہ وہ نیویارک میں کسی کو نہیں جانتا تھا یا پھر دانستہ طور پر اس نے خود کو ایک محدود سرکل میں رکھا تھا اور ان لوگوں کے ساتھ بھی اس کی دوستی بہت رسمی قسم کی تھی۔

واحد چیز جس پر وہ رقم خرچ کرتا رہا تھا، وہ کتابیں تھیں۔ اس لائف اسٹائل کے ساتھ اگر اس کے اکاؤنٹ میں اتنی رقم جمع ہو گئی تھی تو یہ کوئی خلاف توقع بات نہیں تھی۔ آفس، یونیورسٹی، فلیٹ اس کی زندگی کے معمولات میں چوتھی چیز کوئی نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

ایم فل کے دوران سالار نے یونیسیف چھوڑ کر یونیسکو جوائن کر لیا۔

ایم فل کرنے کے بعد سالار کی پوسٹنگ پیرس میں ہو گئی۔ اس سے پہلے وہ ایک فیلڈ آفس میں کام

کر رہا تھا مگر اب اسے یونیسکو کے ہیڈکوارٹرز میں کام کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ وہ گزشتہ سالوں میں وقتاً فوقتاً چھوٹے موٹے پراجیکٹس کے سلسلے میں پیرس جاتا رہا تھا مگر اس بار وہ پہلی دفعہ ایک لمبے عرصے کے لئے وہاں جا رہا تھا۔ ایک آشنا دنیا سے نا آشنا دنیا میں، اس دنیا میں جہاں وہ زبان تک سے واقف نہیں تھا۔ نیویارک میں اس کے بہت سے دوست تھے، یہاں پر ایسا کوئی بھی نہیں تھا جسے وہ بہت اچھی طرح جانتا ہو۔

یونیسیف میں کئے جانے والے ان تھک کام کی طرح وہ یہاں آ کر ایک بار پھر اسی طرح کام کرنے لگا تھا مگر اسلام آباد کے نواحی علاقے میں شروع کیا جانے والا وہ اسکول یہاں بھی اس کے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔ بعض دفعہ اسے حیرت ہوتی کہ اپنی جاب میں تعلیم سے اتنا گہرا تعلق ہونے کے باوجود آخر اسے کبھی فرقان کی طرح وہ اسکول کھولنے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ اگر اس اسکول کے بارے میں وہ کئی سال پہلے سوچ لیتا تو شاید آج یہ اسکول بہت مستحکم بنیادوں پر کھڑا ہوتا۔

"مجھے پاکستان سے زیادہ محبت نہیں ہے، نہ ہی اس کے لئے میں کوئی گہری انسیت رکھتا ہوں۔" اس نے شروع کی ملاقات میں ایک بار فرقان سے کہا تھا۔

"کیوں؟" فرقان نے پوچھا تھا۔

"کیوں کا جواب تو میں نہیں دے سکتا، بس پاکستان کے لئے کوئی خاص احساسات میرے دل میں نہیں ہیں۔" اس نے کندھے اچکا کر کہا تھا۔

"یہ جاننے کے باوجود کہ یہ تمہارا ملک ہے؟"

"ہاں، یہ جاننے کے باوجود۔"

"امریکہ کے لئے خاص احساسات ہیں، امریکہ سے محبت ہے؟" فرقان نے پوچھا۔

"نہیں، اس کے لئے بھی میرے دل میں کچھ نہیں ہے۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

فرقان نے اس بار حیرانی سے اسے دیکھا۔ "دراصل میں وطنیت پر یقین نہیں رکھتا۔" اس نے فرقان کو حیران دیکھ کر وضاحت کی۔

"پھر مجھے ان جگہوں کے لئے محبت پیدا کرنے میں دقت محسوس ہوتی ہے، جہاں میں رہتا ہوں۔ میں کل کسی تیسرے ملک میں رہنے لگوں گا تو امریکہ کو بھی یاد نہیں کروں گا۔"

"تم بڑے عجیب آدمی ہو سالار!" فرقان نے بے اختیار کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی اپنے ملک کے لئے یا اس جگہ کے لئے کوئی خاص احساسات ہی نہ رکھے جہاں وہ رہتا ہے۔"

فرقان کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا مگر اس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ پیرس آنے کے بعد اسے نیویارک کی کوئی چیز یاد نہیں آئی تھی۔ نیو ہیون سے نیویارک آتے ہوئے بھی اسے وہاں ایڈجسٹمنٹ کا

کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ وہ بریانی کی مچھلی تھا۔

☆......☆ ☆

وہ ان دنوں یونائیٹڈ نیشنز کے زیرِ اہتمام ہونے والی کسی ریجنل کانفرنس کے سلسلے میں پاکستان آیا ہوا تھا۔ وہ پرل کانٹی نینٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے وہاں ایک بزنس مینجمنٹ کے ادارے میں کچھ لیکچرز دینے تھے اور فرقان کے ساتھ اپنے اسکول کے سلسلے میں کچھ امور کو بھی طے کرنا تھا۔

وہ لاہور میں اس کے قیام کا تیسرا دن تھا۔ اس نے رات کا کھانا کچھ جلدی کھالیا اور اس کے بعد وہ کسی ضروری کام سے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ شام کے ساڑھے سات ہو رہے تھے۔ مال روڈ پر جاتے ہوئے اچانک اس کی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ ڈرائیور گاڑی سے اُتر کر ٹائر کو دیکھنے لگا۔ چند منٹوں کے بعد اس نے سالار کی کھڑکی کے پاس آکر کہا۔

"سر! گاڑی میں دوسرا ٹائر موجود نہیں ہے۔ میں آپ کے لیے کوئی ٹیکسی لاتا ہوں۔ آپ اس پر چلے جائیں۔" سالار نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"نہیں، میں خود ٹیکسی روک لیتا ہوں۔" وہ کہتا ہوا اتر گیا۔ کچھ دور ایک پارکنگ میں کچھ ٹیکسیاں نظر آ رہی تھیں۔ سالار کا رُخ اسی طرف تھا جب ایک کار نے یک دم اس کے پاس آکر بریک لگائی۔ گاڑی سامنے سے آئی تھی اور اس کے رُکنے پر سالار نے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اس میں بیٹھے شخص کو ایک نظر میں ہی پہچان لیا۔

وہ ناکف تھا۔ وہ اب گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سے اُتر رہا تھا۔ لاہور میں کچھ سال پہلے اس کی سرگرمیوں کا وہ ایک مرکزی کردار تھا۔ ناکف اور اکمل۔ وہ ان ہی دونوں کے ساتھ اپنا زیادہ وقت گزارا کرتا تھا اور اس سے سالار کی دوبارہ ملاقات کئی سالوں کے بعد ہو رہی تھی۔ وہ ان سب کو چھوڑ چکا تھا۔ پاکستان یا لاہور آنے پر بھی اس نے کبھی ان کے ساتھ رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان لوگوں نے پچھلے کئی سالوں میں بار بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر ان کی ان کوششوں کے باوجود سالار ان سے بچنے کی کوششوں میں کامیاب رہا تھا۔

اور اب اتنے سالوں کے بعد وہ یک دم اس طرح اچانک اس کے سامنے آ گیا تھا۔ سالار کے اعصاب یک دم تن گئے۔ ناکف بڑے جوش و خروش کے عالم میں اس کی طرف بڑھا۔

"سالار! مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ تم ہو کہاں غائب تھے اتنے سالوں سے؟ تم تو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گئے تھے۔ کہاں تھے یار! اور اب یہاں کیا کر رہے ہو۔ حلیہ ہی بدل لیا ہے، کہاں گئے وہ بال، لاہور میں کب آئے ہو، آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟"

اس نے یکے بعد دیگرے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ اس نے سالار کے انداز میں جھلکنے والی

سرد مہری پر غور نہیں کیا تھا۔ سالار کے جواب دینے سے پہلے ہی ناکف نے دوبارہ پوچھا۔

"یہاں مال پر کیا کر رہے ہو؟"

"گاڑی خراب ہو گئی تھی، میں ٹیکسی کی طرف جا رہا تھا۔" سالار نے کہا۔

"کہاں جا رہے ہو، میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔" ناکف نے بے تکلفی سے کہا۔

"نہیں، میں چلا جاتا ہوں۔ ٹیکسی پاس ہی ہے۔" سالار نے تیزی سے کہا۔

ناکف نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔

"چلو اندر بیٹھو۔" اس نے بازو پکڑ کر کھینچ لیا۔ سالار سٹپٹایا لیکن اس کی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اس کا موڈ اب بہت خراب ہونے لگا تھا۔

"تم تو اسٹیٹس پڑھنے چلے گئے تھے اور پھر مجھے پتا چلا کہ تم نے وہاں جاب کر لی ہے پھر اچانک پاکستان کیسے؟" ناکف نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا چھٹیاں گزارنے آئے ہو؟"

"ہاں!" سالار نے مختصراً کہا۔ وہ اس طرح اس سے جان چھڑا سکتا تھا۔

"کیا کر رہے ہو آج کل؟" ناکف نے گاڑی چلاتے ہوئے پوچھا۔

"یونائیٹڈ نیشنز کی ایک ایجنسی میں کام کر رہا ہوں۔"

"یہاں لاہور میں کہاں ٹھہرے ہو؟"

"پی سی میں۔"

"ارے پی سی میں کیوں ٹھہرے ہو، میرے پاس آتے یا مجھے فون کرتے۔ کب آئے یہاں؟" ناکف نے کہا۔

"کل۔"

"بس تو پھر تم میرے ساتھ، میرے گھر رہو گے۔ ضرورت نہیں ہے ہوٹل میں رہنے کی۔"

"نہیں، میں کل صبح اسلام آباد واپس جا رہا ہوں۔" سالار نے روانی سے جھوٹ بولا۔ وہ ناکف سے ہر قیمت پر جان چھڑا لینا چاہتا تھا۔ اسے اس سے الجھن ہو رہی تھی یا پھر شاید یہ اس کے ساتھ گزارا جانے والا ماضی تھا جو اسے تکلیف میں مبتلا کر رہا تھا۔

"اگر کل اسلام آباد واپس جا رہے ہو تو پھر آج میرے ساتھ رہو۔ کھانا کھاؤ میرے ساتھ گھر چل کر۔" ناکف نے آفر کی۔

"کھانا میں دس منٹ پہلے ہی کھا کر نکلا ہوں۔"

"پھر بھی میرے ساتھ گھر چلو۔ تمہیں اپنی بیوی سے ملواؤں گا۔"

"شادی ہو گئی تمہاری؟"

"ہاں، تین سال ہوئے۔" ناکف نے کہا۔ پھر پوچھا۔

"اور تم... تم نے شادی کر لی؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"بس کچھ مصروفیت تھی، اس لئے۔" سالار نے کہا۔

"گڈ! ابھی آزاد ہی پھر رہے ہو۔" ناکف نے ایک گہرا سانس لیا۔ "خوش قسمت ہو۔" سالار نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ ناکف نے اس سے بات کرتے ہوئے گلوو کمپارٹمنٹ کھول کر اندر سے ایک کیسٹ نکالنی چاہی۔ اس کا دھیان ذرا بھٹکا اور کیسٹ نکالتے نکالتے گلوو کمپارٹمنٹ سے بہت سی چیزیں سالار کی گود اور نیچے اس کے پیروں میں گر پڑیں۔

"too bad" ناکف نے بے اختیار کہا۔ سالار جھک کر چیزیں اٹھانے لگا۔ ناکف نے گاڑی کے اندر کی لائٹ جلا دی۔ وہ ان چیزوں کو سمیٹ کر گلوو کمپارٹمنٹ میں رکھنے لگا تھا جب وہ ٹھٹک گیا کسی نے اس کے جسم میں جیسے کرنٹ سا دوڑا دیا۔ گلوو کمپارٹمنٹ کے ایک کونے میں وہ ایئررنگز پڑے تھے۔ سالار کے ہاتھوں میں بے اختیار لرزش آ گئی۔ بایاں ہاتھ بڑھا کر اس نے ان ایئررنگز کو باہر نکال لیا۔ وہ اب اس کے ہاتھ کی ہتھیلی پر گاڑی کے اندر جلتی روشنی میں چمک رہے تھے۔ وہ بے یقینی کے عالم میں انہیں دیکھ رہا تھا۔

بہت سال پہلے اس نے ان ایئررنگز کو کسی کے کانوں میں دیکھا تھا۔ ایک بار... دو بار... تین بار... چوتھی بار وہ انہیں اب دیکھ رہا تھا۔ اسے کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ امامہ ہاشم کے ایئررنگز تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے کاغذ پر ان کا ڈیزائن اتار سکتا تھا۔ ہر پیچ و خم کو... ناکف نے اس کی ہتھیلی سے وہ ایئررنگز اٹھا لئے۔ کسی نے جیسے سالار کا سکتہ توڑ دیا تھا۔ ناکف ان ایئررنگز کو ایک بار پھر گلوو کمپارٹمنٹ میں رکھ رہا تھا۔

"یہ ایئررنگز..." وہ اٹکتے ہوئے بولا۔ "یہ تمہاری بیوی کے ہیں؟" سالار نے اپنے سوال کو مکمل کیا۔

"بیوی کے؟" ناکف ہنسا۔ "کم آن یار! بیوی کے ہوتے تو میں یہاں رکھتا۔" سالار پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔

"پھر؟" اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"یار ہے ایک گرل فرینڈ میری۔ پچھلی رات میرے ساتھ تھی۔ یہ ایئررنگز میرے بیڈ روم میں چھوڑ گئی۔ کچھ ایمرجنسی میں ہی جانا پڑا اسے کیونکہ رہ جو واپس آ گئی تھی۔ میں نے یہ ایئررنگز لا کر گاڑی میں رکھ دیئے کیونکہ آج میرا اس کی طرف جانے کا ارادہ ہے۔" ناکف بڑی بے تکلفی سے اسے بتا رہا تھا۔

"گرل فرینڈ؟" سالار کے حلق میں جیسے پھندا لگا۔

"ہاں، گرل فرینڈ۔ ریڈ لائٹ ایریا ہی کی ایک لڑکی ہے۔ اب ادھر ڈیفنس میں شفٹ ہو گئی ہے۔"

"کیا... کیا نام ہے اس کا۔" امامہ ریڈ لائٹ ایریا کی لڑکی تو کبھی نہیں ہو سکتی۔ یقیناً مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس نے ناکف کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

"صنوبر۔" ناکف نے اس کا نام بتایا۔ سالار نے چہرہ موڑ کر ہاتھ میں پکڑی چیزیں گلوو کمپارٹمنٹ میں رکھ کر اسے بند کر دیا۔ اسے واقعی غلط فہمی ہوئی تھی۔ ناکف گاڑی کی لائٹ آف کر چکا تھا۔ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر سالار نے گہرا سانس لیا۔

"مگر یہ اس کا اصلی نام نہیں ہے۔" ناکف نے بات جاری رکھی۔ "اصلی نام اس کا امامہ ہے۔" سالار کے کانوں میں کوئی دھماکہ ہوا تھا یا پھر یہ پگھلا ہوا سیسہ تھا جو کسی نے اس کے کانوں میں انڈیل دیا تھا۔

ناکف اب اسٹیئرنگ پر تھوڑا آگے جھکے ہونٹوں میں دبا سگریٹ لائٹر سے جلا رہا تھا۔

"تم نے... تم نے...... کیا کہا؟" سالار کی آواز میں لرزش تھی۔

"کیا کہا؟" ناکف نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اسے دیکھا۔

"نام بتا رہے تھے تم اس کا؟"

"ہاں، امامہ... تم جانتے ہو اسے؟" ناکف نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ سالار کو دیکھا۔ کھڑکی کا شیشہ اب نے کھول دیا تھا۔ سالار یک ٹک اسے دیکھتا رہا یوں جیسے وہ ناکف کو پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ایئررنگز اب اس کی مٹھی کی گرفت میں تھے۔

"میں کیا پوچھ رہا ہوں یار! تم جانتے ہو اسے؟"

ناکف نے ہونٹوں سے سگریٹ انگلیوں میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

"میں... میں..." سالار نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔ اپنی آواز اسے کسی کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔ ریڈ لائٹ ایریا وہ آخری جگہ تھی جہاں اس نے کبھی امامہ کے ہونے کا تصور کیا تھا۔

گاڑی کے اندر جلنے والی روشنی میں ناکف نے بہت غور سے دیکھا۔ اس کے زرد پڑتے ہوئے چہرے کو، اس کے ہاتھ کی بند مٹھی کو، اس کے کپکپاتے ہونٹوں کو، اس کے بے ربط، بے معنی لفظوں کو۔ ناکف مسکرا دیا۔ اس نے اس کے کندھے پر تسلی آمیز انداز میں تھپکی دی۔

"ڈونٹ وری یار! کیوں گھبرا رہے ہو، وہ صرف گرل فرینڈ ہے میری۔ اگر تمہارے اور اس کے درمیان بھی کچھ ہے تو کوئی بات نہیں، ہم تو پہلے بھی بہت کچھ شیئر کیا کرتے تھے، یاد ہے تمہیں۔" ناکف نے قہقہہ لگایا پھر اس نے یار دو میں تسلی دی۔

"یہ تو پھر لڑکی ہے۔"

مال روڈ پر کتنا رش تھا۔ عاکف کتنی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا۔ ان دو سوالوں کے ساتھ ساتھ سالار نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اسٹیرنگ پر موجود شخص پر جھپٹنے کی صورت میں خود اس کے ساتھ کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے پلک جھپکتے میں عاکف کو گلے سے پکڑ لیا۔ عاکف کا پاؤں بے اختیار بریک پر آیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ وہ دونوں پوری قوت سے ڈیش بورڈ سے ٹکرائے۔ سالار نے اس کے کالر کو نہیں چھوڑا۔ عاکف حواس باختگی کی حالت میں چلایا۔

"کیا کر رہے ہو تم؟" اس نے سالار کے ہاتھوں سے اپنا گلا چھڑانے کی کوشش میں اسے دور ہٹانے کی کوشش کی۔ "پاگل ہو گئے ہو؟"

'How dare you talk like that.'

سالار جواباً غرایا۔ اس کے ہاتھ ایک بار پھر عاکف کی گردن پر تھے۔ عاکف کا سانس رکنے لگا۔ اس نے کچھ غصے اور کچھ حواس باختگی کے عالم میں سالار کے منہ پر مکا مارا۔ سالار بے اختیار جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹا۔ اس کے دونوں ہاتھ اب اپنے منہ پر تھے۔ عاکف کی گاڑی کے پیچھے موجود گاڑیاں ہارن پر ہارن دے رہی تھیں۔ وہ سڑک کے وسط میں کھڑے تھے اور یہ ان دونوں کی خوش قسمتی تھی کہ اس طرح اچانک گاڑی رکنے پر پیچھے آنے والی گاڑی ان سے نہیں ٹکرائی۔

سالار دونوں ہاتھوں سے اپنا جبڑا پکڑے ہوئے اپنی سیٹ پر دوہرا ہوا تھا۔ عاکف نے اپنے ہوش و حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے گاڑی کو کچھ آگے ایک سنسان ذیلی سڑک پر موڑتے ہی ایک طرف روک لیا۔ سالار تب تک سیدھا ہو چکا تھا اور اپنی ایک ہاتھ کی ہتھیلی سے ہونٹوں اور جبڑے کو دبائے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ پہلے کا اشتعال اب غائب ہو چکا تھا۔

عاکف نے گاڑی روکی۔ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس کی طرف مڑا اور کہا "کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔ میرے گلے کیوں پڑ رہے تھے، میں نے کیا کیا ہے؟"

بلند آواز میں بات کرتے کرتے اس نے ڈیش بورڈ سے ٹشو باکس اٹھا کر سالار کی طرف بڑھایا۔ اس نے سالار کی شرٹ پر خون کے چند قطرے دیکھ لئے تھے۔ سالار نے یکے بعد دیگرے دو ٹشو نکال لئے اور ہونٹ کے اس کونے کو صاف کرنے لگا جہاں سے خون رس رہا تھا۔

"گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ابھی۔" عاکف نے کہا۔ سالار کو ہاتھ صاف کرتے ہوئے دوبارہ ایئر رنگز کا خیال آیا۔ اس نے یک دم جھک کر پائیدان میں ایئر رنگز ڈھونڈنا شروع کر دیا۔

"فٹ پاتھ پر گاڑی چڑھ جاتی یا —"

عاکف بات ادھوری چھوڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہو؟"

"وہ ایئر رنگز۔" سالار نے مختصراً کہا۔

عاکف بے اختیار جھلایا۔

"کیا پرابلم ہے سالار! میری گرل فرینڈ ہے، اس کے ایئر رنگز ہیں، میرا پرابلم ہے یہ ایئر رنگز یا اس کا پرابلم ہے تمہارا نہیں۔" سالار یک دم رک گیا۔ اسے اپنی نامعقول حرکت کا احساس ہوا۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ٹشو کو کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے اسے دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

عاکف ماتھے پر بل لئے اس کو دیکھ رہا تھا۔

"تمہارا اور صنوبر کا کوئی   " عاکف بات کرتے کرتے محتاط انداز میں رک گیا۔ وہ اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ پچھلی بار اس کے جملے میں ایسا کون سا لفظ تھا جس نے اسے مشتعل کیا تھا۔ وہ دوبارہ غلطی دہرانا نہیں چاہتا تھا۔

"آئی ایم سوری۔" سالار نے اس کے رکنے پر کہا۔

"او کے فائن۔" عاکف کچھ مطمئن ہوا۔ "تم اور صنوبر —" وہ پھر رک گیا۔

"تم نے کہا تھا، اس کا نام امامہ ہے۔" سالار نے گردن موڑ کر اس کا چہرہ دیکھا۔ عاکف کو بے اختیار اس کی آنکھوں سے خوف آیا۔ وہ کسی نارمل شخص کی آنکھیں نہیں تھیں۔ وحشت.... بے چارگی خوف.... وہ ہر تاثر لئے ہوئے تھیں۔

"ہاں، اس نے ایک بار مجھے بتایا تھا۔ شروع میں، ایک بار اپنے بارے میں بتا رہی تھی، تب اس نے مجھے بتایا۔"

"اس کا حلیہ بتا سکتے ہو مجھے؟" سالار نے موہوم سی امید کے ساتھ کہا۔

"ہاں، کیوں نہیں۔" عاکف گڑبڑایا۔ "بہت خوب صورت ہے۔ fair........ tall" عاکف اب اٹکنے لگا۔ "کالی آنکھیں ہیں، بال بھی پہلے کالے تھے اب ڈائی کئے ہوئے ہیں اس نے اور کیا بتاؤں۔" وہ زچ ہوا۔

سالار نے آنکھیں بند کر کے ونڈ اسکرین کی طرف چہرہ کر لیا۔ گھٹن کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

"امامہ ہاشم ہے اس کا نام؟" وہ ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

"پتا نہیں، باپ کا نام تو نہیں بتایا اس نے۔ نہ ہی میں نے پوچھا۔" عاکف نے کہا۔

"امامہ ہاشم ہی ہے وہ۔" وہ بڑبڑایا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ "یہ سب میری وجہ سے ہوا... سب میں ذمہ دار ہوں اس سب کچھ کا۔"

"کس چیز کے ذمہ دار ہو تم؟" عاکف کو تجسس ہوا۔ سالار خاموشی سے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتا

رہا۔ عاکف جواب کا انتظار کرتا رہا۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد سالار نے گردن موڑ کر اس سے کہا۔

"میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ ابھی اور اسی وقت۔"

عاکف کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر وہ ڈیش بورڈ سے موبائل اٹھا کر ایک کال ملانے لگا۔ کچھ دیر تک وہ کوشش کرتا رہا پھر اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"اس کا موبائل آف ہے۔ پتا نہیں وہ گھر پر ملے یا نہ ملے کیونکہ اب رات ہو رہی ہے اور وہ"

عاکف چپ ہو کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ "لیکن میں تمہیں لے جاتا ہوں اس کے گھر۔"

آدھ گھنٹہ کے بعد وہ دونوں ڈیفنس کے ایک بنگلے کے باہر کھڑے تھے۔ وہاں پہنچنے تک دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ عاکف اب اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے سالار کو لفٹ دی تھی۔

چند بار ہارن دینے پر اندر سے ایک آدمی باہر نکل آیا، وہ چوکیدار تھا۔

"صنوبر گھر پر ہے؟" عاکف نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"نہیں، بی بی صاحبہ تو نہیں ہیں۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"مجھے پتا نہیں۔" عاکف نے سالار کو دیکھا اور پھر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"تم بیٹھو، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" عاکف اس آدمی کے ساتھ اندر چلا گیا۔

"اس کی واپسی دس منٹ کے بعد ہوئی۔

"تم کو اس سے بات کرنی ہے؟" اس نے اندر بیٹھتے ہی پوچھا۔

"مجھے اس سے ملنا ہے۔" عاکف دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

سفر پھر اسی خاموشی سے طے ہونے لگا۔ نو بج رہے تھے جب وہ ریڈ لائٹ ایریا میں پہنچے تھے۔ سالار کے لئے وہ جگہ نئی نہیں تھی۔ صرف اس تکلیف کا احساس نیا تھا جو اسے اس بار ہو رہا تھا۔

"آج یہاں ہی ہے وہ   کسی آدمی نے یہاں کی کچھ لڑکیوں کو بک کروایا ہے کسی فنکشن کے لئے۔ وہ بھی ان ہی کے ساتھ جا رہی ہے۔"

عاکف نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

"تم بھی تو اترو، بہت اندر جانا ہے۔ اب صنوبر کو تو میں تم سے ملانے کے لئے یہاں نہیں لا سکتا۔" سالار باہر نکل آیا۔

وہ عاکف کے ساتھ ایک بار پھر ان گلیوں میں جانے لگا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا وہ اس طرح کی جگہ میں آخری بار وہاں کب آیا تھا، وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ انسانی گوشت کی تجارت تب بھی اسی "ڈھکے چھپے" انداز میں ہو رہی تھی۔

اسے بہت اچھی طرح یاد تھا وہ پہلی بار اٹھارہ سال کی عمر میں وہاں آیا تھا پھر وہ کئی بار وہاں آتا رہا تھا، کئی بار۔ بعض دفعہ رقص دیکھنے، بعض دفعہ کسی مشہور ایکٹریس کی کسی محفل میں شرکت کے لئے۔ بعض دفعہ ان گلیوں کے دروازوں، کھڑکیوں، چوباروں سے لٹکتی جھانکتی نیم برہنہ عورتوں کو دیکھنے۔ (اسے عجیب سی خوشی ملتی تھی ان گلیوں سے گزرتے ہوئے۔ وہ وہاں کھڑی کسی بھی عمر کی کسی بھی شکل کی لڑکی کو چند گھنٹوں کے لئے خرید سکتا تھا۔ والٹ سے نکلنے والے چند نوٹ وہاں کھڑی کسی بھی لڑکی کو سر سے پیر تک اس کا کر دیتے۔ دنیا پیر اس کے نیچے اور کائنات مٹھی میں ہوتا اور کسے کہتے تھے، اسے سرشاری کا احساس ہوتا)۔ اور بعض دفعہ وہاں رات گزارنے کے لئے۔ ان عورتوں کے ساتھ جن سے وہ نفرت کرتا تھا چند روپوں کی خاطر جسم فروخت کرنے والیوں کے لئے وہ اس کے علاوہ کیا جذبات رکھ سکتا تھا اور نفرت کے باوجود وہ انہیں خریدتا تھا کیونکہ وہ خرید سکتا تھا۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر میں اسے یقین تھا ان عورتوں میں کبھی کوئی ایسی عورت نہیں ہو سکتی تھی جس سے اس کا کوئی تعلق ہوتا، خونی رشتہ ہوتا یا محبت ہوتی۔

اس کی ماں اور بہن ایلیٹ کلاس کی فرد تھیں۔ اس کی بیوی کو بھی اسی کلاس کے کسی گھر سے آنا تھا۔ اس کی بیٹی بھی اسی کلاس سے ہوتی۔ ریڈ لائٹ ایریا کی عورتیں   انہیں اسی کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اسے یقین تھا اکڑی گردن، اٹھی ہوئی ٹھوڑی اور تنے ہوئے ابروؤں کے ساتھ وہ اس مخلوق سے جتنی نفرت کرتا، کم تھی۔ جتنی تذلیل کرتا، ناکافی تھی۔

اور اب   اب قسمت نے کیا کیا تھا۔ سات پردوں میں رہنے والی اس عورت کو جس کے جسم پر وہ کسی کی انگلی کے لمس تک کو برداشت نہیں کر سکتا تھا، اسے اس بازار میں پھینک دیا گیا تھا۔ اس سے چند قدم آگے وہ شخص چل رہا تھا جو اس کا گاہک تھا اور سالار سکندر زبان کھولنے کے قابل تک نہیں تھا۔ آواز بلند نہیں کر سکتا تھا۔ شکوہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کسی سے کیا کہتا۔ کیا وہ اللہ سے کہہ سکتا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ آخر اس نے ایسا کیا کیا تھا؟ اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ اس کی کپکپاہٹ کو کیسے روکتا۔ ان گلیوں میں آنے والا کوئی شخص کبھی دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کے اپنے گھر، اپنے خاندان کی عورت کبھی اس بازار میں نہیں آئے گی۔ کسی دوسرے مرد کی جیب میں پڑے ہوئے نوٹوں کے عوض نہیں بک سکے گی۔ ماں نہیں؟ .... بہن؟ ... یا بیوی؟ بیٹی؟ پوتی؟ نواسی؟ آنے والی نسلوں میں سے کوئی۔

سالار سکندر کی زبان حلق سے کھینچ لی گئی تھی۔ امامہ ہاشم اس کی بیوی تھی اس کی منکوحہ۔ ایلیٹ کلاس کی وہ عورت جس کا اس بازار سے کبھی واسطہ نہیں پڑتا۔ سالار سکندر نے ایک بار پھر خود کو مارگلہ کی پہاڑیوں پر رات کی تاریکی میں درخت کے ساتھ بندھا پایا ..... بے بسی کی انتہا تھی۔

"صاحب! میرے ساتھ چلو، ہر عمر کی لڑکی ہے میرے پاس۔ اس علاقے کی سب سے اچھی لڑکیاں، قیمت بھی زیادہ نہیں ہے۔" اس کے ساتھ ایک آدمی چلنے لگا۔

"میں اس لئے یہاں نہیں آیا ہوں۔" سالار نے مدھم آواز میں اس پر نظر ڈالے بغیر کہا۔

"کوئی ڈرنک چاہئے، کوئی ڈرگ۔ میں سب کچھ سپلائی کر سکتا ہوں۔"

ناکف نے یک دم قدم روک کر قدرے اکھڑے ہوئے انداز میں اس آدمی سے کہا۔ "تمہیں ایک بار کہا ہے ناکہ ضرورت نہیں پھر پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔"

اس آدمی کے قدم تھم گئے۔ سالار خاموشی سے چلتا رہا۔ اس کا ذہن کسی آندھی کی زد میں آیا ہوا تھا۔ امامہ۔ ہاشم وہاں کب۔ کیوں، کیسے آ گئی تھی۔ ماضی ایک فلم کی طرح اس کی نظروں کے سامنے آیا تھا۔

"پلیز، تم ایک بار ایک بار اس کو جا کر میرے بارے میں سب کچھ بتاؤ، اس سے کہو مجھ سے شادی کر لے۔ اس سے کہو، مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، صرف ایک نام ہے۔ اس کو تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا واسطہ دو گے تو وہ انکار نہیں کرے گا۔ وہ اتنی محبت کرتا ہے ان ﷺ سے۔"

اس نے بہت سال پہلے اپنے بیڈ پر نیم دراز چپس کھاتے ہوئے موبائل فون پر بڑے اطمینان کے ساتھ اس کو بلکتے سنا تھا۔

"بائی دا وے، تم امامہ کے کیا لگتے ہو؟"

"میں ؟ میں اور امامہ بہت گہرے اور پرانے فرینڈز ہیں۔" جلال انصر کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔ سالار نے عجیب سی سرشاری محسوس کی۔ جلال اس وقت امامہ اور اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہو گا۔ وہ اچھی طرح اندازہ کر سکتا تھا۔

"اس سے جا کر صاف صاف کہہ دو کہ میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔"

وہ جلال انصر کا یہ پیغام سنتے ہوئے امامہ ہاشم کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے خود کو ہکے بکے بتاتے ہوئے امامہ کو موبائل پر خبر دی تھی۔

"تم نے مجھ پر اتنے احسان کئے ہیں، ایک احسان اور کرو۔ مجھے طلاق دے دو۔" وہ فون پر گڑگڑائی تھی۔

"نہیں، میں تم پر احسان کرتے کرتے تھک گیا ہوں، اب اور احسان نہیں کر سکتا اور یہ والا احسان یہ تو ناممکن ہے۔" اس نے جواباً کہا تھا۔

"تم طلاق چاہتی ہو، کورٹ میں جا کر لے لو مگر میں تو تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔"

سالار کے حلق میں پھندے لگنے لگے۔

"ہاں، میں نے یہ سب کچھ کیا تھا لیکن میں نے، میں نے جلال انصر کی غلط فہمی کو دور کر دیا تھا۔ میں

نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا، کچھ بھی نہیں چھپایا۔ میں نے صرف ایک مذاق کیا تھا، ایک پریکٹیکل جوک۔ میں یہ تو نہیں چاہتا تھا کہ امامہ کے ساتھ یہ سب کچھ ہو۔" وہ جیسے کسی عدالت میں آن کھڑا ہوا تھا۔ "ٹھیک ہے، میں نے اس کے ساتھ زیادتی کی اسے طلاق نہیں دے کر۔ مگر...... مگر میں نے پھر بھی یہ خواہش تو نہیں کی تھی کہ وہ یہاں آ پہنچے۔ میں نے میں نے اسے گھر چھوڑنے سے روکا تھا، میں نے مذاق میں ہی سہی مگر اسے مدد کی آفر بھی کی تھی۔ میں تو اس کو یہاں لے کر نہیں آیا تھا۔ کوئی مجھے تو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتا اس سب کا۔"

وہ بے ربط جملوں میں وضاحتیں دے رہا تھا۔ اس کے سر میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی۔ درد کی ایک تیز مگر مانوس سی لہر میگرین (آدھے سر کا درد) کا ایک اور اٹیک۔ وہ چلتے چلتے رکا، ہونٹ بھینچتے ہوئے اس نے بے اختیار اپنی کنپٹی کو مسلا، درد کی لہر گزر گئی تھی۔ آنکھیں کھول کر اس نے گلی کے پیچ و خم کو دیکھا۔ وہ اندھی گلی تھی، کم از کم اس کے لئے اور امامہ ہاشم کے لئے۔ اس نے قدم آگے بڑھائے۔ ناکف ایک چوبارے نما گھر کے سامنے رک گیا تھا۔ اس نے مڑ کر سالار کو دیکھا۔

"یہی گھر ہے۔" سالار کا چہرہ کچھ اور زرد پڑ گیا۔ قیامت اب اور کتنی دور رہ گئی تھی۔

"اوپر کی منزل پر جانا ہے، صنوبر اوپر ہی ہو گی۔" ناکف کہتے ہوئے ایک طرف موجود تنگ اور تاریک سی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سالار کو پہلی سیڑھی پر ہی ٹھوکر لگی۔ وہ بے اختیار جھکا، ناکف نے مڑ کر اسے دیکھا اور رک گیا۔

"احتیاط سے آؤ، سیڑھیوں کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اوپر سے یہ لوگ بلب لگوانے کے بھی روادار نہیں۔" سالار سیدھا ہو گیا۔ اس نے دیوار کا سہارا لے کر اوپر والی سیڑھی پر قدم رکھا۔ سیڑھیاں بل کھا کر گولائی کی صورت میں اوپر جا رہی تھیں اور اتنی تنگ تھیں کہ صرف ایک وقت میں ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا۔ ان کی سیمنٹ بھی اکھڑی ہوئی تھی۔ وہ بوٹ پہننے کے باوجود ان کی خستہ حالت کو جانچ سکتا تھا جس دیوار کا سہارا لے کر وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ اس دیوار کی سیمنٹ بھی اکھڑی ہوئی تھی۔ سالار اندھوں کی طرح دیوار ٹٹولتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

پہلی منزل کے ایک دروازے کے کھلے ہوئے پٹ سے آنے والی روشنی نے سالار کی رہنمائی کی تھی۔ ناکف وہاں کہیں نہیں تھا۔ یقیناً وہ دروازہ پار کر کے آگے چلا گیا تھا۔ سالار چند لمحوں کے لئے وہاں رکا پھر اس نے دہلیز کے پار قدم رکھا۔ وہ اب ایک چوبارے میں تھا۔ ایک طرف بہت سے کمروں کے دروازے تھے۔ دوسری طرف نیچے گلی نظر آ رہی تھی۔ برآمدے نما لمبا چوبارہ بالکل خالی تھا۔ تمام کمروں کے دروازے اسے وہاں کھڑے بند ہی لگ رہے تھے۔ ناکف کہاں گیا تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ اس نے بہت محتاط انداز میں اپنے قدم آگے بڑھائے۔ یوں جیسے وہ کسی بھوت بنگلے میں آ گیا تھا۔ ابھی کوئی دروازہ

کھلتا اور امامہ ہاشم اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی۔

"میرے خدا میں میں اس کا سامنا یہاں کیسے کروں گا۔" اس کا دل ڈوبا۔

وہ ان بند دروازوں پر نظر ڈالتے ہوئے چلتا جا رہا تھا۔ جب اس برآمدے کے آخری سرے پر ایک دروازے میں سے ناکف نکلا۔

"تم کہاں رہ گئے ہو۔" وہ وہیں سے بلند آواز میں بولا۔ "یہاں آؤ۔"

سالار کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔ سالار دروازے تک پہنچنے سے پہلے چند لمحے کے لئے رُک گیا۔ وہ اپنے دل کی دھڑکن کی آواز باہر تک سن رہا تھا پھر آنکھیں بند کئے سرد ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچے وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں ناکف ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ ایک لڑکی اپنے بالوں پر برش کرتے ہوئے ناکف سے باتیں کر رہی تھی۔

"یہ امامہ نہیں ہے۔" بے اختیار سالار کے منہ سے نکلا۔

"ہاں، یہ امامہ نہیں ہے۔ وہ اندر ہے، آؤ۔" ناکف نے اُٹھتے ہوئے ایک اور کمرے کا دروازہ کھولا۔ سالار غیر ہموار قدموں سے اس کے پیچھے گیا۔ ناکف اگلے کمرے کو بھی پار کر گیا اور ایک اور دروازہ کھول کر ایک دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔

"ہیلو صنوبر!" سالار نے دور سے ناکف کو کہتے ہوئے سنا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس کا جی چاہا وہ وہاں سے بھاگ جائے ابھی اسی وقت...... سرپٹ ...... اِدھر اُدھر دیکھے بغیر اس گھر سے ...... اس علاقے سے ...... اس شہر سے اس ملک سے دوبارہ کبھی وہاں کا رُخ تک نہ کرے...... اس نے گردن موڑ کر اپنے عقب میں موجود دروازے کو دیکھا۔

"آؤ سالار!" ناکف نے اسے مخاطب کیا۔ وہ اب گردن موڑے اندر کسی لڑکی سے مصروفِ گفتگو تھا۔ سالار نے تھوک نگلا، اس کا حلق کانٹوں کا جنگل بن گیا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ ناکف نے اپنی پشت پر اس کے قدموں کی آواز سنی تو دروازے سے ہٹ گیا۔ سالار دروازے میں تھا۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔

"یہ ہے صنوبر۔" ناکف نے تعارف کروایا۔ سالار اس سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ وہ بھی اس پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

"امامہ؟" وہ بے حس و حرکت اسے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

"ہاں امامہ!" ناکف نے تصدیق کی۔

سالار گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑا۔ ناکف گھبرا گیا۔

"کیا ہوا، کیا ہوا؟" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے سجدے میں تھا۔ وہ ایک طوائف کے

کوٹھے پر سجدے میں گرنے والا پہلا مرد تھا۔

ناکف پنجوں کے بل بیٹھا اسے کندھے سے پکڑے ہلا رہا تھا۔ سالار سجدے میں بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

"پانی پانی لاؤں؟" صنوبر گھبراتے ہوئے تیزی سے بیڈ کے سرہانے پڑے جگ اور گلاس کی طرف گئی اور گلاس میں لے کر سالار کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"سالار صاحب! آپ پانی پئیں۔"

سالار ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا۔ یوں جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ کچھ کہے بغیر اس نے اپنی جینز کی جیب سے والٹ نکالا اور پاگلوں کی طرح اس میں سے کرنسی نوٹ نکال کر صنوبر کے سامنے رکھتا گیا اس نے والٹ چند سیکنڈ میں خالی کر دیا تھا۔ اس میں کریڈٹ کارڈز کے علاوہ کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ پھر وہ کچھ کہے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا اور اُلٹے قدموں دروازے کی دہلیز سے ٹھوکر کھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ ناکف ہکا بکا اس کے پیچھے آیا۔

"سالار سالار - ! کیا ہوا ہے؟ کہاں جا رہے ہو؟"

اس نے سالار کو کندھے سے پکڑ کر روکنے کی کوشش کی۔ سالار وحشت زدہ اس سے اپنے آپ کو چھڑانے لگا۔"

"چھوڑو مجھے۔ ہاتھ نہ لگاؤ۔ مجھے جانے دو۔"

وہ بلند آواز میں روتے ہوئے ہذیانی انداز میں چلایا۔

"امامہ سے ملنا تھا تمہیں۔" ناکف نے اسے یاد دلایا۔

"یہ امامہ نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے امامہ ہاشم"

"تو ٹھیک ہے۔ مگر میرے ساتھ جانا ہے تمہیں۔"

"میں چلا جاؤں گا۔ میں چلا جاؤں گا۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔" وہ اُلٹے قدموں اپنا کندھا اس سے چھڑا کر بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ ناکف زیرِ لب کچھ بڑبڑایا۔ اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ مڑ کر وہ صنوبر کے کمرے میں گھس گیا جو اب بھی حیرانی سے نوٹوں کے ڈھیر کو دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆...... ☆

سیڑھیاں اب بھی اسی طرح تاریک تھیں مگر اس بار وہ جس ذہنی حالت میں تھا اسے کسی دیوار، کسی سہارے، کسی روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اندھا دھند ان تاریک سیڑھیوں سے نیچے بھاگا اور بُری طرح گرا۔ اگر سیڑھیاں سیدھی ہوتیں تو وہ سیدھا نیچے جا کر گرتا مگر سیڑھیوں کی گولائی نے اسے بچا لیا تھا۔ وہ اندھیرے میں ایک بار پھر اُٹھا۔ گھٹنوں اور کہنیوں میں اُٹھنے والی ٹیسوں سے بے پروا اس نے

دوبارہ اسی طرح بھاگتے ہوئے سیڑھیاں اترنے کی کوشش کی۔ چند سیڑھیاں اترنے کے بعد لگائی جانے والی چھلانگ نے اسے پھر زمین بوس کیا تھا۔ اس بار اس کا سر بھی دیوار سے ٹکرایا۔ وہ خوش قسمت تھا کہ اس کی ہڈی نہیں ٹوٹی۔ شاید سیڑھیوں کی تعداد زیادہ ہوتی تو وہ پھر تیسری بار اٹھ کر اسی طرح سیڑھیاں اترنے کی کوشش کرتا لیکن دوسری بار سیڑھیوں سے گرنے کے بعد وہ نیچے والی سیڑھیوں پر آگیا تھا۔ سامنے گلی کی روشنی نظر آرہی تھی۔ وہ سیڑھیوں سے نکل آیا مگر آگے نہیں جا سکا۔ چند قدم آگے چل کر اس گھر کے باہر تھڑے پر بیٹھ گیا۔ اسے متلی محسوس ہو رہی تھی۔ سر کو تھامتے ہوئے بے اختیار اسے ابکائی آئی۔ وہ تھڑے پر بیٹھے بیٹھے جھک گیا۔ وہ ابکائیاں کرتے ہوئے بھی اسی طرح رو رہا تھا۔ گلی میں سے گزرنے والے لوگوں کے لئے یہ منظر نیا نہیں تھا۔ یہاں بہت سے شرابی اور نشئی ضرورت سے زیادہ نشہ استعمال کرنے کے بعد یہی سب کچھ کیا کرتے تھے۔ صرف سالار کا لباس اور حلیہ تھا جو اسے کچھ مہذب دکھا رہا تھا اور اس کے آنسو اور واویلا، کسی طوائف کی بے وفائی کا نتیجہ تھا شاید۔ وہاں کئی بار کئی مرد ایسے ہی مہذب اور معزز نظر آنے والے مرد اسی طرح روتے ہوئے جاتے تھے۔ طوائف کا کوٹھا ہر کسی کو راس نہیں آتا۔ گزرنے والے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔ کوئی اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ اس بازار میں حال احوال جاننے کا رواج نہیں تھا۔

خائف نیچے نہیں آیا تھا۔ آتا تو شاید سالار کے پاس رک جاتا۔ امامہ ہاشم وہاں نہیں تھی۔ صنوبر، امامہ ہاشم نہیں تھی۔ کتنا بڑا بوجھ اس کے کندھوں سے اٹھا لیا گیا تھا، کیسی اذیت سے اسے بچا لیا گیا تھا۔ تکلیف دے کر اسے آگہی نہیں دی گئی۔ صرف تکلیف کا احساس دے کر اسے آگہی سے شناسا کر دیا گیا تھا۔ اسے وہاں نہ دیکھ کر وہ اس حالت میں جا پہنچا تھا۔ وہ اسے وہاں دیکھ لیتا تو اس پر کیا گزرتی۔ اسے اللہ سے خوف آرہا تھا بے پناہ خوف۔ وہ کس قدر طاقتور تھا کیا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کس قدر مہربان تھا۔ کیا نہیں کرتا تھا۔ انسان کو انسان رکھنا اسے آتا تھا۔ کبھی غضب سے، کبھی احسان سے۔ وہ اسے اس کے دائرے میں ہی رکھتا تھا۔

اسے کبھی اپنی زندگی کے اس سیاہ باب پر اتنا پچھتاوا، اتنی نفرت نہیں ہوئی جتنی اس وقت ہو رہی تھی

"کیوں؟ کیوں... ؟ کیوں آتا تھا میں یہاں پر...... ؟ کیوں خریدتا تھا میں ان عورتوں کو ؟ کیوں گناہ کا احساس میرے اندر نہیں جاگتا تھا؟" وہ چبوترے پر بیٹھا دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بلک رہا تھا۔

"اور اب .... اب جب میں یہ سب کچھ چھوڑ چکا ہوں تو اب ..... اب کیوں یہ تکلیف یہ چبھن ہو رہی ہے مجھے۔ میں جانتا ہوں۔ جانتا ہوں مجھے اپنے ہر عمل کے لئے جواب دہ ہونا

ہے، مگر یہ حساب یہیں اس طرح نہ لے۔ جس عورت سے میں محبت کرتا ہوں اسے کبھی اس بازار میں نہ پھینک۔"

وہ روتے روتے رکا۔ کون سا انکشاف کہاں ہو رہا تھا۔

"محبت؟" وہ گلی سے گزرتے لوگوں کو دیکھتے ہوئے بے یقینی سے بڑبڑایا۔

"کیا میں میں اس سے محبت کرتا ہوں؟" کوئی لہر اس کے سر سے پیروں تک گزری تھی۔

"کیا یہ تکلیف صرف اس لئے ہو رہی ہے مجھے کہ میں اس سے ...." اس کے چہرے پر سائے لہرائے تھے۔ "کیا وہ میرا پچھتاوا نہیں ہے۔ کچھ اور ہے .... ؟"

اسے لگا وہ وہاں سے کبھی اٹھ نہیں پائے گا۔

"تو یہ پچھتاوا نہیں محبت ہے، جس کے پیچھے میں بھاگتا پھر رہا ہوں۔" اسے اپنا جسم ریت کا بنا ہوا لگا۔

"امامہ پچھتاوا نہیں ہے روگ ہے؟" آنسو اب بھی اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

"اور اس بازار میں اس عورت کی تلاش میں اٹھتے میرے قدموں میں لرزش اس لئے تھی کیونکہ میں نے اسے اپنے دل کے بہت اندر کہیں بہت اونچی جگہ پر رکھا تھا۔ وہاں، جہاں خود میں بھی اس کو محسوس نہیں کر پا رہا تھا۔ چیک میٹ۔"

"150+ آئی کیو لیول کا وہ مرد منہ کے بل زمین پر گرایا گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کون سا زخم تھا جو وہاں بیٹھا ہرا ہو رہا تھا۔ کون سی تکلیف تھی جو سانس لینے نہیں دے رہی تھی۔ آئینے نے اسے کہاں برہنہ کیا تھا۔ اسے کیا دیا تھا؟ کیا لیا تھا؟ وہ اٹھ کر وہاں سے چلنے لگا۔ اسی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے۔ اسے خود پر قابو نہیں تھا۔ اسے پاس سے گزرنے والوں کی نظروں کی بھی پروا نہیں تھی۔ اسے اپنے وجود سے کبھی زندگی میں اتنی نفرت محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی اس وقت ہو رہی تھی۔ وہ ریڈ لائٹ ایریا اس کی زندگی کا سب سے سیاہ باب تھا۔ ایسا سیاہ باب جسے وہ کھرچ کر اپنی زندگی سے علیحدہ نہیں کر پایا تھا۔ وہ ایک بار پھر اس کی زندگی میں آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ کئی سال پہلے وہاں گزاری گئی راتیں اب بلاؤں کی طرح اسے گھیرے ہوئے تھیں اور وہ ان سے فرار حاصل نہیں کر پا رہا تھا اور اب جس خوف نے اسے اپنے حصار میں لیا تھا وہ تو...

"اگر.. اگر..... امامہ اس بازار میں آگئی ہوتی تو... ؟ صنوبر، امامہ ہاشم نہیں تھی مگر کوئی اور...." اس کے سر میں درد کی ایک اور لہر اٹھی۔ میگرین اب شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا اور راستے کو بھی ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ اب اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا پھر وہ کہیں بیٹھ گیا تھا۔ گاڑیوں کے ہارن اور لائٹس نے اس کے درد کو اور بڑھایا تھا پھر اس کا ذہن کسی تاریکی میں

اترتا گیا تھا۔

کسی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر کچھ کہا ۔۔ ایک دوسری آواز نے جواباً کچھ کہا۔ سالار سکندر کے حواس آہستہ آہستہ کام کرنے لگے تھے۔ مضمحل تھکن زدہ مگر آوازوں کو شناخت کرتا ہوا ذہن۔

بہت آہستہ آہستہ اس نے آنکھیں کھولیں۔ اسے حیرانی نہیں ہوئی۔ اسے یہیں ہونا چاہئے تھا۔ وہ ہاسپٹل یا کسی کلینک کے ایک کمرے میں ایک بیڈ پر تھا۔ بے حد نرم اور آرام دہ بیڈ۔ اس سے کچھ فاصلے پر فرقان کسی دوسرے ڈاکٹر کے ساتھ کھڑا ہلکی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔ فرقان اور دوسرے ڈاکٹر نے گردن موڑ کر باتیں کرتے اسے دیکھا پھر وہ دونوں اس کی طرف چلے آئے۔

سالار نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں کھلا رکھنا اسے مشکل لگ رہا تھا۔ فرقان نے پاس آکر نرمی سے اس کے سینے کو تھپتھپایا۔

"کیسے ہو اب سالار؟"

سالار نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے مسکرانے کی کوشش نہیں کی۔ صرف چند لمحے خالی الذہنی کے عالم میں اسے دیکھتا رہا۔

"فائن۔" اس نے کہا۔

دوسرا ڈاکٹر اس کی نبض دیکھنے میں مصروف تھا۔

سالار نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ فرقان اور دوسرا ڈاکٹر آپس میں ایک بار پھر گفتگو میں مصروف تھے۔ اسے اس گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے کسی بھی چیز میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ باقی سب کچھ ویسا ہی تھا۔ احساس جرم، پچھتاوا۔ عائف، صنوبر امامہ۔ ریڈ لائٹ ایریا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ اس کا دل چاہا کاش وہ ابھی ہوش میں نہ آتا۔

"تو سالار صاحب..... اب کچھ تفصیلاً گفتگو ہو جائے آپ کے ساتھ۔" اس نے فرقان کی آواز پر آنکھیں کھول دیں۔ وہ اس کے بیڈ کے بالکل قریب ایک اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوسرا ڈاکٹر باہر جا چکا تھا۔ سالار نے اپنی ٹانگوں کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی۔ اس کے ٹخنے اور گھٹنوں میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں پر کمبل تھا وہ انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا مگر اس کو اندازہ تھا کہ اس کے ٹخنے اور گھٹنے پر کچھ لپٹا ہوا تھا۔ وہ اپنے کپڑوں میں بھی نہیں تھا بلکہ مریضوں کے لئے مخصوص لباس میں تھا۔

"کیا ہوا ہے؟" سالار نے بے اختیار کراہ کر ٹانگ سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

"sprained ankle دونوں گھٹنوں اور calf پر کچھ خراشیں اور سوجن مگر خوش قسمتی سے کوئی فریکچر نہیں۔ بازوؤں اور کہنیوں پر بھی کچھ Bruises خوش قسمتی سے پھر کوئی فریکچر نہیں۔ سر کے بائیں پچھلے حصے میں چھوٹا سا کٹ تھوڑی سی بلیڈنگ، مگر سی ٹی اسکین کے مطابق کوئی سیریس انجری نہیں۔ سینے

پر بھی رگڑ کی وجہ سے معمولی خراشیں مگر جہاں تک تمہارے سوال کا تعلق ہے کہ کیا ہوا ہے؟ تو یہ تم بتاؤ کہ کیا ہوا ہے؟"

فرقان کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح بات کرتے کرتے بولا۔ سالار چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

"میں پہلے سمجھتا رہا کہ میگرین کا اٹیک اتنا شدید تھا کہ تم بے ہوش ہو گئے مگر بعد میں تمہارا چیک اپ کرنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ ایسا نہیں تھا۔ کیا کسی نے حملہ کیا تھا تم پر؟" وہ اب سنجیدہ تھا۔ سالار نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سر کو جھٹکا۔

"تم مجھ تک کیسے پہنچے بلکہ میں یہاں کیسے پہنچا؟"

"میں تمہارے موبائل پر تمہیں کال کر رہا تھا اور تمہارے بجائے کسی آدمی نے وہ کال ریسیو کی، وہ اس وقت فٹ پاتھ پر تمہارے قریب تھا۔ تمہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے مجھے تمہاری حالت کے بارے میں بتایا۔ اچھا آدمی تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ تمہیں کسی ٹیکسی میں کسی قریبی ہاسپٹل لے جائے۔ وہ لے گیا پھر میں وہاں پہنچ گیا اور تمہیں یہاں لے آیا۔"

"ابھی کیا وقت ہے؟"

"صبح کے چھ بج رہے ہیں۔ میں نے تمہیں رات کو پین کلرز دیئے تھے اسی لئے تم ابھی تک سو رہے تھے۔"

فرقان کو بات کرتے کرتے احساس ہوا کہ وہ دلچسپی نہیں لے رہا۔ اس کی نظروں میں ایک عجیب سی سرد مہری فرقان کو محسوس ہوئی تھی۔ یوں جیسے فرقان اسے کسی تیسرے شخص کی حالت کے بارے میں بتا رہا تھا۔

"تم مجھے دوبارہ....." سالار نے اسے خاموش ہوتے ہوئے دیکھ کر کہنا شروع کیا۔ پھر قدرے الجھن آمیز انداز میں رکا۔ آنکھیں بند کیں جیسے ذہن پر زور دے رہا ہو۔

"ہاں..... کوئی ٹرنکولائزر دے دو۔ میں بہت لمبی نیند سونا چاہتا ہوں۔"

"سو جانا..... مگر یہ تو بتاؤ ..... ہوا کیا تھا؟"

"کچھ نہیں۔" سالار نے بیزاری سے کہا۔

"میگرین..... اور میں فٹ پاتھ پر گر پڑا، گرنے سے چوٹیں لگ گئیں۔"

فرقان نے اسے غور سے دیکھا۔

"کچھ کھا لو "

سالار نے اس کی بات کاٹی۔ "نہیں..... بھوک ..... نہیں ہے۔ تم بس مجھے کچھ دو۔ ٹیبلٹ، انجکشن، کچھ بھی۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔"

"اسلام آباد تمہارے گھر والوں "

سالار نے اسے بات مکمل کرنے نہیں دی۔

"نہیں اطلاع مت کرنا۔ میں جب سو کر اٹھوں گا تو اسلام آباد چلا جاؤں گا۔"

"اس حالت میں؟"

"تم نے کہا ہے میں ٹھیک ہوں۔"

"ٹھیک ہو مگر اتنے بھی ٹھیک نہیں ہو۔ دو چار دن آرام کرو۔ یہیں رہو لاہور میں، پھر چلے جانا۔"

"اچھا پھر تم پاپا کو یا ممی کو اطلاع مت دینا۔"

فرقان نے کچھ الجھے ہوئے انداز میں اسے دیکھا۔ اس کے ماتھے پر چند بل آ گئے۔ "اچھا اور کچھ......؟"

"ٹرینکولائزر......"

فرقان اسے سوچتے ہوئے دیکھنے لگا۔

"میں رہوں تمہارے پاس ۔ ؟"

"فائدہ ؟ میں تو ابھی سو جاؤں گا۔ تم جاؤ۔ جب میں اٹھوں گا تو تمہیں کال کروں گا۔"

اس نے بازو کے ساتھ اپنی آنکھیں ڈھانپ لیں۔ اس کے انداز میں موجود روکھے پن اور سرد مہری نے فرقان کو کچھ اور پریشان کیا۔ اس کا رویہ بہت ابنارمل تھا۔

"میں سمیر سے بات کرتا ہوں، مگر ٹرینکولائزر چاہئے تو پہلے تمہیں کچھ کھانا ہوگا۔" فرقان نے اٹھتے ہوئے دو ٹوک انداز میں کہا۔ سالار نے آنکھوں سے بازو نہیں ہٹایا۔

دوبارہ اس کی آنکھ جس وقت کھلی اس وقت شام ہو رہی تھی۔ کمرہ خالی تھا۔ اس کے پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ جسمانی طور پر صبح سے زیادہ تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ اپنی ٹانگوں سے کمبل کو پرے پھینک کر اس نے لیٹے لیٹے بائیں ٹخنے اور گھٹنوں میں اٹھتی ہوئی ٹیسوں کو نظرانداز کرتے ہوئے ٹانگوں کو سکیڑ لیا۔ اسے اپنے اندر ایک عجیب سی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ اتنی گھٹن جیسے کسی نے اس کے سینے کو جکڑ لیا ہو۔ وہ اسی طرح لیٹے لیٹے چھت کو گھورتا رہا پھر جیسے اسے کوئی خیال آیا۔

☆......☆......☆

وہ ہوٹل آ کر اپنا سامان پیک کر رہا تھا جب فرقان نے دروازے پر دستک دی۔ سالار نے دروازہ کھول دیا۔ فرقان کو دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی اس کے پیچھے آ جائے گا۔

"عجیب انسان ہو تم سالار" فرقان اسے دیکھتے ہی ناراضی سے بولنے لگا۔

"یوں کسی کو بتائے بغیر سمیر کے کلینک سے چلے آئے۔ مجھے پریشان کر دیا۔ اوپر سے موبائل کو بھی

آف کر رکھا ہے۔"

سالار نے کچھ نہیں کہا۔ وہ لنگڑاتا ہوا ایک بار پھر اپنے بیگ کے پاس آ گیا۔ جس میں وہ اپنی چیزیں پیک کر رہا تھا۔

"تم جا رہے ہو؟" فرقان بیگ دیکھ کر چونکا۔

"ہاں !" سالار نے یک لفظی جواب دیا۔

"کہاں ؟" سالار نے بیگ کی زپ بند کر دی اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"اسلام آباد؟" فرقان اس کے سامنے صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔

"نہیں ؟" سالار نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"پھر ؟"

"کراچی جا رہا ہوں۔"

"کس لئے؟" فرقان نے حیرانی سے پوچھا۔

"فلائٹ ہے میری۔"

"پیرس کی؟"

"ہاں !"

"چار دن بعد ہے تمہاری فلائٹ، ابھی جا کر کیا کرو گے؟" فرقان اسے دیکھنے لگا۔ سمیر کا اندازہ ٹھیک تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بے حد عجیب تھے۔

"کام ہے مجھے وہاں۔"

"کیا کام ہے؟"

وہ جواب دینے کے بجائے بیڈ پر بیٹھا پلکیں جھپکائے بغیر چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ فرقان سائیکاٹرسٹ نہیں تھا۔ پھر بھی سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی آنکھوں کو پڑھنے میں اسے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ سالار کی آنکھوں میں کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف سرد مہری تھی۔ یوں جیسے وہ کسی کو جانتا تک نہ ہو۔ اسے اور اپنے آپ کو بھی۔ وہ ڈپریس تھا۔ فرقان کو کوئی شبہ نہیں تھا مگر اس کا ڈپریشن اسے کہاں لے جا رہا تھا۔ فرقان یہ جاننے سے قاصر تھا۔

"تمہیں آخر کیا پریشانی ہے سالار؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

سالار نے توقف کیا۔ پھر کندھے جھٹکے۔

"کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

"تو پھر......" سالار نے فرقان کی بات کاٹ دی۔

"تم جانتے ہو مجھے میگرین ہے۔ کبھی کبھار اس طرح ہو جاتا ہے مجھے۔"

"میں ڈاکٹر ہوں سالار!" فرقان نے سنجیدگی سے کہا۔ "میگرین کو کوئی مجھ سے زیادہ بہتر نہیں جانتا۔ یہ سب کچھ صرف میگرین کی وجہ سے نہیں تھا۔"

"تو تم بتاؤ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" سالار نے الٹا اس سے سوال کیا۔

"کسی لڑکی کا پرابلم ہے؟" سالار پلکیں جھپک نہیں سکا۔ فرقان کہاں جا پہنچا تھا۔

"ہیں ..." وہ نہیں جانتا اس نے "نہیں" کیوں نہیں کہا تھا۔

"کسی میں انوالو ہو تم؟" فرقان کو اپنے اندازے کے صحیح ہونے پر جیسے یقین نہیں آیا۔

"ہاں ..."

فرقان بہت دیر چپ بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ یوں جیسے اپنی بے یقینی پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔

"کس کے ساتھ انوالو ہو؟"

"تم اسے نہیں جانتے۔"

"شادی نہیں ہو سکی تمہاری اس کے ساتھ؟" سالار اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

"ہوگئی تھی۔" اس کے لہجے میں آنچ تھی۔

"شادی ہوگئی تھی؟" فرقان کو پھر یقین نہیں آیا۔

"ہاں ..."

"پھر ... طلاق ہوگئی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"تو ...؟" سالار کے پاس آگے بتانے کے لئے کچھ نہیں تھا۔

"تو بس ..."

"بس کیا ...؟" سالار اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی دائیں ہاتھ میں موجود دل کی لکیر پر پھیرتا رہا۔

"کیا نام ہے اس کا؟" فرقان نے دھیمی آواز میں اس سے پوچھا۔ وہ ایک بار پھر اسی طرح لکیر کو چھوتے ہوئے بہت دیر خاموش رہا۔ بہت دیر ... پھر اس نے کہا۔

"امامہ ہاشم ..." فرقان نے بے اختیار سانس لیا۔ اسے اب سمجھ میں آیا کہ وہ اس کی چھوٹی بیٹی کو ڈھیروں کے حساب سے تحفے تحائف کیوں دیا کرتا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے میں جب سے سالار سے اس کی شناسائی ہوئی تھی اور سالار کا اس کے گھر آنا جانا شروع ہوا تھا سالار اور امامہ کی بہت دوستی ہوگئی تھی۔ وہ پاکستان سے جانے کے بعد بھی اسے وہاں سے کچھ نہ کچھ بھجواتا رہتا تھا مگر فرقان کو اکثر صرف ایک بات

پر حیرانی ہوتی تھی۔ وہ کبھی امامہ کا نام نہیں لیتا تھا اور خود اس سے بات کرتا تو اسے نام کے بغیر مخاطب کرتا رہتا۔ فرقان کو چند ایک بار یہ بات محسوس ہوئی تھی مگر اس نے اسے نظر انداز کر دیا تھا لیکن اب امامہ ہاشم کا نام سن کر وہ جان گیا تھا کہ وہ کیوں اس کا نام نہیں لیتا تھا۔

وہ اب رک رک کر بے ربط جملوں میں، مدھم آواز میں اسے اپنے اور امامہ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ فرقان دم سادھے سن رہا تھا۔ جب وہ سب کچھ بتانے کے بعد خاموش ہوا تو دیر تک فرقان بھی کچھ نہیں بول سکا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ تسلی دے یا پھر کچھ اور کہے ... کوئی نصیحت۔

"تم اسے بھول جاؤ۔" اس نے بالآخر کہا۔ "سوچ لو کہ وہ جہاں بھی ہے خوش اور محفوظ ہے۔ ضروری نہیں اس کے ساتھ کوئی سانحہ ہی ہوا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ بالکل محفوظ ہو۔" فرقان کہہ رہا تھا۔ "تم نے اس کی مدد کی تھی، جس حد تک تم کر سکتے تھے۔ پچھتاووں سے اپنے آپ کو نکال لو۔ اللہ مدد کرتا ہے۔ تمہارے بعد ہو سکتا ہے اسے تم سے بہتر کوئی اور مل گیا ہو۔ تم کیوں اس طرح کے وہم لئے بیٹھے ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ جلال سے اس کی شادی نہ ہونے کی وجہ تم تھے۔ جو کچھ تم نے مجھے جلال کے بارے میں بتایا ہے میرا اندازہ تو یہی ہے کہ وہ کسی بھی صورت میں امامہ سے شادی نہ کرتا، چاہے تم بیچ میں آتے نہ آتے۔ کوشش کرتے نہ کرتے۔ جہاں تک امامہ کو طلاق نہ دینے کا سوال ہے اسے چاہئے تھا وہ تم سے دوبارہ رابطہ کرتی۔ وہ ایسا کرتی تو تم یقیناً اسے طلاق دے دیتے۔ اگر اس معاملے میں تم سے کوئی غلطی ہوئی بھی ہے تو اللہ تمہیں معاف کر دے گا کیونکہ تم پچھتا رہے ہو۔ تم اللہ سے معافی بھی مانگتے آ رہے ہو۔ یہ کافی ہے مگر اس طرح ڈپریشن کا شکار ہونے سے کیا ہوگا۔ تم اپنے آپ کو اس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کرو۔"

وہ بڑی رنجیدگی سے اسے سمجھا رہا تھا۔ سالار کی خاموشی سے اسے امید بندھی کہ شاید اس کی کوشش رنگ لا رہی تھی مگر ایک لمبی تقریر کے بعد جب وہ خاموش ہوا تو سالار اٹھ کر اپنا بریف کیس کھولنے لگا۔

"کیا کر رہے ہو؟" فرقان نے پوچھا۔

"میری فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔" وہ اب اپنے بریف کیس میں سے کچھ پیپرز نکال رہا تھا۔ فرقان کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اس سے کیا کہے۔

☆ ☆ ...... ☆

وہ پچھلے کئی سالوں میں کئی بار پاکستان آتا جاتا رہا تھا اسے کبھی واپس جاتے ہوئے اس قسم کی کیفیات کا شکار نہیں ہونا پڑا تھا جس قسم کی کیفیات کا شکار وہ اس بار ہو رہا تھا۔ جہاز کے ٹیک آف کے وقت ایک عجیب سا خالی پن تھا، جو اس نے اپنے اندر اترتے محسوس کیا تھا۔ اس نے جہاز کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ بہت دور تک پھیلے ہوئے اس خطے میں کہیں امامہ ہاشم نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ وہاں رہتا تو کبھی کہیں کسی وقت کسی روپ میں وہ اسے نظر آ جاتی۔ اسے مل جاتی۔ یا کوئی ایسا شخص اسے مل جاتا جو اس سے واقف ہوتا لیکن

وہ اب جہاں جا رہا تھا اس زمین پر امامہ ہاشم کہیں نہیں تھی۔ کوئی اتفاق بھی ان دونوں کو آمنے سامنے نہیں لا سکتا تھا۔ وہ ایک بار پھر ایک لمبے عرصے کے لئے "امکان" کو چھوڑ کر جا رہا تھا۔ وہ زندگی میں کتنی بار "امکان" کو چھوڑ کر جاتا رہے گا۔

دس منٹ کے بعد پانی سے ٹرینکو لائزرز کو نگلتے ہوئے اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ زندگی میں کبھی بھی نہیں کھڑا تھا۔ وہ زندگی میں کبھی بھی نہیں کھڑا ہو پائے گا۔ اس کے پیروں کے نیچے زمین کبھی نہیں آ سکے گی۔

ساتویں منزل پر اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے بھی اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ وہاں جانا نہیں چاہتا تھا وہ کہیں اور جانا چاہتا تھا۔ کہاں......؟

اس نے اپارٹمنٹ کے دروازے کو لاک کیا۔ لاؤنج میں پڑے ٹی وی کو آن کیا۔ سی این این پر نیوز بلیٹن آ رہا تھا۔ اس نے اپنے جوتے اور جیکٹ اُتار کر دور پھینک دیئے۔ پھر ریموٹ لے کر صوفے پر لیٹ گیا۔ خالی الذہنی کے عالم میں وہ چینل بدلتا رہا۔ ایک چینل سے گونجتی اردو آواز نے اُسے روک لیا۔ ایک غیر معروف سا گلوکار کوئی غزل گا رہا تھا۔

میری زندگی تو فراق ہے، وہ ازل سے دل میں مکیں سہی
وہ نگاہِ شوق سے دور ہیں، رگِ جاں سے لاکھ قریں سہی

اس نے ریموٹ اپنے سینے پر رکھ دیا۔ گلوکار کی آواز بہت خوبصورت تھی یا پھر شاید وہ اس کے جذبات کو الفاظ دے رہا تھا۔

ہمیں جان دینی ہے ایک دن، وہ کسی طرح وہ کہیں سہی
ہمیں آپ کھینچئے دار پر جو نہیں کوئی، تو ہمیں سہی

شاعری، کلاسیکل میوزک، پرانی فلمیں، انسٹرومینٹل میوزک اسے ان تمام چیزوں کی worth کا اندازہ پچھلے کچھ سالوں میں ہی ہونا شروع ہوا تھا۔ پچھلے کچھ سالوں نے اس کی موسیقی کے انتخاب کو بہت اعلیٰ کر دیا تھا اور اردو غزلیں سننے کا تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

سرِ طور ہو، سرِ حشر ہو، ہمیں انتظار قبول ہے
وہ کبھی ملیں، وہ کہیں ملیں، وہ کبھی سہی، وہ کہیں سہی

اسے ایک بار پھر امامہ یاد آئی۔ اسے ہمیشہ وہی یاد آتی تھی۔ پہلے وہ صرف تنہائی میں یاد آتی تھی پھر وہ ہجوم میں بھی نظر آنے لگی ......اور وہ۔ وہ محبت کو پچھتاوا سمجھتا رہا۔

نہ ہو ان پہ جو مرا بس نہیں کہ یہ عاشقی ہے ہوس نہیں
میں انہی کا تھا، میں انہی کا ہوں، وہ میرے نہیں تو نہیں سہی

سالار یک دم صوفے سے اُٹھ کر کھڑکیوں کی طرف چلا گیا۔ ساتویں منزل پر کھڑے وہ رات کو روشنیوں کی اوٹ میں دیکھ سکتا تھا۔ عجیب وحشت تھی جو باہر تھی۔ عجیب عالم تھا جو اندر تھا۔

جو ہو فیصلہ وہ سنایئے اسے حشر پر نہ اُٹھایئے
جو کریں گے آپ ستم وہاں، وہ ابھی سہی، وہ یہیں سہی

وہاں کھڑے کھڑکیوں کے شیشوں کے پار اندھیرے میں ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنے اندر اُترنے کی کوشش کی۔

"میں اور کبھی کسی لڑکی سے محبت کروں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

بہت سال پہلے اکثر کہا جانے والا جملہ اسے یاد آیا۔ باہر تاریکی کچھ اور بڑھی۔ اندر آوازوں کی بازگشت اس نے شکست خوردہ انداز میں سر جھکایا پھر چند لمحوں کے بعد دوبارہ سر اُٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ انسان کا اختیار کہاں سے شروع کہاں پر ختم ہوتا ہے؟ ڈپریشن کا ایک اور دورہ، باہر نظر آنے والی ٹمٹماتی روشنیاں بھی اب بجھنے لگی تھیں۔

اسے دیکھنے کی جو لو لگی تو نصیر دیکھ ہی لیں گے ہم
وہ ہزار آنکھ سے دور ہو، وہ ہزار پردہ نشیں سہی

سالار سکندر نے مڑ کر اس کی اسکرین کو دیکھا، گلوکار لہک لہک کر بار بار آخری شعر دہرا رہا تھا۔ کسی معمول کی طرح چلتا ہوا وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ سینٹرل ٹیبل پر رکھے ہوئے بریف کیس کو کھول کر اس نے اندر سے لیپ ٹاپ نکال لیا۔

اسے دیکھنے کی جو لو لگی تو نصیر دیکھ ہی لیں گے ہم
وہ ہزار آنکھ سے دور ہو، وہ ہزار پردہ نشیں سہی

گلوکار مقطع دہرا رہا تھا۔ سالار کی انگلیاں لیپ ٹاپ پر برق رفتاری سے حرکت کرتے ہوئے استعفیٰ لکھنے میں مصروف تھیں۔ کمرے میں موسیقی کی آواز اب ڈوبتی جا رہی تھی۔ استعفیٰ کی ہر لائن اس کے وجود پر چھائے جمود کو ختم کرتی جا رہی تھی وہ جیسے کسی جادو کے حصار سے باہر آ رہا تھا۔ کوئی توڑ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اپنے کیریئر کی اس اسٹیج پر اس طرح کا احمقانہ فیصلہ صرف تم ہی کر سکتے تھے۔"

وہ فون پر سکندر عثمان کو خاموشی سے سن رہا تھا۔

"آخر اتنی اچھی پوسٹ کو کیوں چھوڑ رہے ہو اور وہ بھی اس طرح اچانک اور چلو اگر چھوڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر آ کر اپنا بزنس کرو۔ بینک میں جانے کی کیا تک بنتی ہے۔" وہ اس کے فیصلے پر بری طرح تنقید کر رہے تھے۔

"میں اب پاکستان میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ بس اسی لئے جاب چھوڑ دی۔ بزنس میں نہیں کر سکتا اور بینک کی آفر میرے پاس بہت عرصے سے تھی۔ وہ مجھے پاکستان پوسٹ کرنے پر تیار ہیں، اس لئے میں اسے قبول کر رہا ہوں۔" اس نے تمام سوالوں کا اکٹھا جواب دیا۔

"پھر بینک کو بھی جوائن مت کرو، میرے ساتھ آ کر کام کرو۔"

"میں نہیں کر سکتا پاپا! مجھے مجبور نہ کریں۔"

"تو پھر وہیں پر رہو۔ پاکستان آنے کی کیا تک بنتی ہے؟"

"میں یہاں پر رہ نہیں پا رہا۔"

"حب الوطنی کا کوئی دورہ پڑا ہے تمہیں؟"

"نہیں"

"تو پھر ؟"

"میں آپ لوگوں کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔" اس نے بات بدلی۔

"خیر یہ فیصلہ تم از کم ہماری وجہ سے تو نہیں کیا گیا۔" سکندر عثمان کا لہجہ نرم ہوا۔

سالار خاموش رہا۔ سکندر عثمان بھی کچھ دیر خاموش رہے۔

"فیصلہ تو تم کر ہی چکے ہو۔ میں اب اس کے بارے میں تو کچھ نہیں کر سکتا۔ ٹھیک ہے آنا چاہتے ہو آ جاؤ۔ کچھ عرصہ بینک میں کام کر کے بھی دیکھ لو لیکن میری خواہش یہی ہے کہ تم میرے ساتھ، میرے بزنس کو دیکھو۔" سکندر عثمان نے جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"تمہارا تو پی ایچ ڈی کا بھی ارادہ تھا۔ اس کا کیا ہوا؟" سکندر عثمان کو بات ختم کرتے کرتے پھر یاد آیا۔

"فی الحال میں مزید اسٹڈیز نہیں کرنا چاہ رہا۔ ہو سکتا ہے کچھ سالوں کے بعد پی ایچ ڈی کے لئے دوبارہ باہر چلا جاؤں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پی ایچ ڈی کروں ہی نہ۔" سالار نے مدھم آواز میں کہا۔

"تم اس اسکول کی وجہ سے آ رہے ہو؟" سکندر عثمان نے اچانک کہا۔ "شاید" سالار نے تردید نہیں کی۔ وہ اگر اسکول کو اس کی واپسی کی وجہ سمجھ رہے تھے تو بھی کوئی حرج نہیں تھا۔

"ایک بار پھر سوچ لو سالار !" سکندر کہے بغیر نہیں رہ سکے۔

"بہت کم لوگوں کو کیریئر میں اس طرح کا اسٹارٹ ملتا ہے جس طرح کا تمہیں ملا ہے۔ تم سن رہے ہو؟"

"جی......!" اس نے صرف ایک لفظ کہا۔

"باقی تم میچور ہو، اپنے فیصلے خود کر سکتے ہو۔" انہوں نے ایک طویل کال کے اختتام پر فون بند

کرنے سے پہلے کہا۔

سالار نے فون رکھنے کے بعد اپارٹمنٹ کی دیواروں پر ایک نظر دوڑائی۔ اٹھارہ دن کے بعد اسے یہ اپارٹمنٹ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا تھا۔

☆......☆......☆

پیرس سے واپسی پر اس کی زندگی کے ایک نئے فیز کا آغاز ہوا تھا۔ ابتدائی طور پر وہ اسلام آباد میں اس غیر ملکی بینک میں کام کرتا رہا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد وہ اسی بینک کی ایک نئی برانچ کے ساتھ لاہور چلا آیا۔ اسے کراچی جانے کا موقع بھی مل رہا تھا مگر اس نے لاہور کا انتخاب کیا تھا۔ اسے یہاں ڈاکٹر سبط علی کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع بھی مل رہا تھا۔

پاکستان میں اس کی مصروفیات کی نوعیت تبدیل ہو گئی تھی مگر ان میں کمی نہیں آئی تھی۔ وہ یہاں بھی دن رات مصروف رہتا تھا۔ ایک exceptional ماہر معاشیات کے طور پر اس کی شہرت اس کے ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھی۔ حکومتی حلقوں کے لئے اس کا نام نیا نہیں تھا مگر پاکستان آ جانے کے بعد وزنس منسٹری مختلف مواقع پر وقتاً فوقتاً اپنے زیر تربیت آفیسرز کو دیئے جانے والے لیکچرز کے لئے اسے بلواتی رہتی۔ لیکچرز کا سلسلہ بھی اس کے لئے نیا نہیں تھا۔ Yale میں زیر تعلیم رہنے کے بعد وہ وہاں مختلف کلاسز کو لیکچر دیتا رہا تھا یہ سلسلہ نیو یارک منتقل ہو جانے کے بعد بھی جاری رہا۔ جہاں وہ کولمبیا یونیورسٹی میں ہیومن ڈویلپمنٹ پر ہونے والے سیمینارز میں حصہ لیتا رہا بعد میں اس کی توجہ ایک بار پھر اکنامکس کی طرف مبذول ہو گئی۔

پاکستان میں بھی بہت جلد وہ ان سیمینارز کے ساتھ انوالو ہو گیا تھا۔ جو IBA، LUMS اور FAST جیسے ادارے کروا رہے تھے۔ اکنامکس اور ہیومن ڈویلپمنٹ واحد موضوعات تھے جن پر وہ خاموشی اختیار نہیں کیا کرتا تھا۔ وہ اس کے پسندیدہ موضوعِ گفتگو تھے اور سیمینارز میں اس کے لیکچرز کا فیڈ بیک ہمیشہ بہت زبردست رہا تھا۔

وہ مہینے کا ایک ویک اینڈ گاؤں میں اپنے اسکول میں گزارا کرتا تھا اور وہاں رہنے کے دوران وہ زندگی کے ایک نئے رخ سے آشنائی حاصل کر رہا تھا۔

"ہم نے اپنی غربت اپنے دیہات میں چھپا دی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے لوگ مٹی کو کارپٹ کے نیچے چھپا دیتے ہیں۔"

"اس اسکول کی تعمیر کا آغاز کرتے ہوئے فرقان نے ایک بار اس سے کہا تھا اور وہاں گزارے جانے والے دن اسے اس جملے کی ہولناکی کا احساس دلاتے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں غربت کی موجودگی سے نا آشنا تھا۔ وہ یونیسکو اور یونی سیف میں کام کے دوران دوسرے ایشیائی ممالک کے ساتھ

ساتھ پاکستان کے بارے میں بھی بہت ساری رپورٹس دیکھتا رہا تھا مگر پاکستان میں غربت کی آخری حدوں کو بھی پار کر جانے والے لوگوں کو وہ پہلی بار ذاتی طور پر دیکھ رہا تھا۔

"پاکستان کے دس پندرہ بڑے شہروں سے نکل جائیں تو احساس ہوتا ہے کہ چھوٹے شہروں میں رہنے والے لوگ تیسری دنیا میں نہیں دسویں بارھویں دنیا میں رہتے ہیں۔ وہاں تو لوگوں کے پاس نہ روزگار ہے، نہ سہولتیں۔ وہ اپنی آدھی زندگی خواہش میں گزارتے ہیں اور آدھی حسرت میں مبتلا ہو کر کون سی اخلاقیات سکھا سکتے ہیں آپ اس شخص کو جس کا دن سوکھی روٹی سے شروع ہوتا ہے اور فاقے پر ختم ہو جاتا ہے اور ہم ہم لوگوں کی بھوک مٹانے کے بجائے مسجدوں پر مسجدیں تعمیر کرتے ہیں۔ عالی شان مسجدیں، پرشکوہ مسجدیں، ماربل سے آراستہ مسجدیں۔ بعض دفعہ تو ایک ہی سڑک پر دس دس مسجدیں کھڑی ہوتی ہیں۔ نمازیوں سے خالی مسجدیں۔"

فرقان تلخی سے کہتا تھا۔

"اس ملک میں اتنی مسجدیں ہو چکی ہیں کہ اگر پورا پاکستان ایک وقت کی نماز کے لئے مسجدوں میں اکٹھا ہو جائے تو بھی بہت سی مسجدیں خالی رہ جائیں گی۔ میں مسجدیں بنانے پر یقین نہیں رکھتا جہاں لوگ بھوک سے خودکشیاں کرتے پھر رہے ہوں جہاں کچھ خاص طبقوں کی پوری پوری نسل جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتی پھر رہی ہو وہاں مسجد کے بجائے مدرسے کی ضرورت ہے۔ اسکول کی ضرورت ہے، تعلیم اور شعور ہوگا اور رزق کمانے کے مواقع تو اللہ سے محبت ہوگی ورنہ صرف شکوہ ہی ہوگا۔"

وہ فرقان کی باتیں خاموشی سے سنتا رہتا تھا۔ اس نے مستقل طور پر گاؤں میں جانا شروع کیا تو اسے اندازہ ہوا فرقان ٹھیک کہتا تھا۔ غربت لوگوں کو کفر تک لے گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی ضرورتیں ان کے اعصاب پر سوار تھیں اور جو ان معمولی ضرورتوں کو پورا کر دیتا وہ جیسے اس کی غلامی کرنے پر تیار ہو جاتے۔ اس نے جس ویک اینڈ پر گاؤں جانا ہوتا اسکول میں لوگ اپنے چھوٹے موٹے کاموں کے لئے جمع ہوتے۔ بعض دفعہ لوگوں کی قطاریں ہوتیں۔

"بیٹے کو شہر کی کسی فیکٹری میں کام پر رکھوا دیں۔ چاہے ہزار روپیہ ہی مل جائے مگر کچھ پیسہ تو آئے۔"

"دو ہزار روپے مل جاتے تو میں اپنی بیٹی کی شادی کر دیتا۔"

"بارش نے ساری فصل خراب کر دی۔ اگلی فصل لگانے کے لئے بیج خریدنے تک کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ آپ تھوڑے پیسے قرض کے طور پر دے دیں، میں فصل کٹنے کے بعد دے دوں گا۔"

"بیٹے کو پولیس نے پکڑ لیا ہے، قصور بھی نہیں بتاتے، بس کہتے ہیں ہماری مرضی جب تک چاہیں اندر رکھیں، تم آئی جی کے پاس جاؤ۔"

"پٹواری میری زمین پر جھگڑا کر رہا ہے۔ کسی اور کو الاٹ کر رہا ہے۔ کہتا ہے میرے کاغذ جعلی ہیں۔"

"بیٹا کام کے لئے پاس کے گاؤں جاتا ہے۔ روز آٹھ میل چل کر آنا جانا پڑتا ہے۔ آپ ایک سائیکل لے دیں تو مہربانی ہوگی۔"

"گھر میں پانی کا ہینڈ پمپ لگوانا ہے۔ آپ مدد کر دیں۔"

وہ تعجب سے ان درخواستوں کو سنتا تھا۔ کیا لوگوں کے یہ معمولی کام بھی ان کے لئے پہاڑ بن چکے ہیں۔ ایسا پہاڑ جسے عبور کرنے کے لئے وہ زندگی کے کئی سال ضائع کر دیتے ہیں۔ وہ سوچتا۔

مہینے کے ایک ویک اینڈ پر جب وہ وہاں آتا تو اپنے ساتھ دس پندرہ ہزار روپے زیادہ لے کر آتا وہ روپے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بہت سے لوگوں کو بظاہر بڑی لیکن حقیقتاً بہت چھوٹی ضرورتیں پوری کر دیتے۔ ان کی زندگی میں کچھ آسانیاں لے آتے، اس کے لکھے ہوئے چند سفارشی رقعے اور فون کالز ان لوگوں کے کندھوں کے بوجھ اور پیروں میں پڑی نہ نظر آنے والی بیڑیوں کو کیسے اتار دیتے۔ اس کا احساس شاید سالار کو خود بھی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

لاہور میں اپنے قیام کے دوران وہ باقاعدگی سے ڈاکٹر سبط علی صاحب کے پاس جاتا تھا۔ ان کے ہاں ہر رات عشاء کی نماز کے بعد کچھ لوگ جمع ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کسی نہ کسی موضوع پر بات کیا کرتے تھے۔ بعض دفعہ اس موضوع کا انتخاب وہ خود کرتے بعض دفعہ ان کے پاس آنے والے لوگوں میں سے کوئی ان سے سوال کرتا اور پھر یہ سوال اس رات کا موضوع گفتگو بن جاتا۔ عام اسکالرز کے برعکس ڈاکٹر سبط علی صرف خود نہیں بولتے تھے، نہ ہی انہوں نے اپنے پاس آنے والے لوگوں کو صرف سامع بنا دیا تھا بلکہ وہ اکثر اپنی بات کے دوران ہی چھوٹے موٹے سوالات کرتے رہتے اور پھر ان سوالات کا جواب دینے کے لئے نہ صرف لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے بلکہ ان کی رائے کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ان کے اعتراضات کو بڑے تحمل اور بردباری سے سنتے۔ ان کے پاس آنے والوں میں صرف سالار سکندر تھا، جس نے ان سے کبھی سوال کیا تھا نہ کبھی ان کے کسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ کبھی کسی بات پر اعتراض کرنے والوں میں شامل ہوا نہ کسی بات پر رائے دینے والوں میں۔

وہ فرقان کے ساتھ آتا۔ فرقان نہ آتا تو اکیلا چلا آتا، کمرے کے آخری حصے میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ جاتا، خاموشی سے ڈاکٹر صاحب اور وہاں موجود لوگوں کی گفتگو سنتا۔ بعض دفعہ اپنے دائیں بائیں آبیٹھنے والے لوگوں کے استفسار پر اپنا ایک جملہ تعارف پیش کرتا۔

"میں سالار سکندر ہوں، ایک بینک میں کام کرتا ہوں۔"

وہ جب تک امریکہ میں رہا تب تک ہر ہفتے ایک بار وہاں سے ڈاکٹر سبط علی کو فون کرتا رہا مگر فون پر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہونے والی اس کی گفتگو بہت مختصر اور ایک ہی نوعیت کی ہوتی تھی۔ وہ کال

کرتا۔ ڈاکٹر صاحب کال ریسیو کرتے اور ایک ہی سوال کرتے۔

وہ پہلی بار اس سوال پر تب چونکا تھا جب وہ پاکستان سے چند دن پہلے ہی امریکہ آیا تھا اور ڈاکٹر صاحب اس کی واپسی کا پوچھ رہے تھے۔ اسے تعجب ہوا تھا۔

"ابھی تو نہیں ......" اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا تھا۔ بعد میں وہ سوال اسے کبھی عجیب نہیں لگا کیونکہ وہ لاشعوری طور پر جان گیا تھا کہ وہ کیا پوچھ رہے تھے۔

آخری بار انہوں نے وہ سوال اس سے تب کیا تھا جب وہ امامہ کی تلاش میں ریڈ لائٹ ایریا میں پہنچا تھا۔ یو ایس واپس پہنچنے کے ایک ہفتے کے بعد اس نے ہمیشہ کی طرح انہیں کال کیا تھا۔ ہمیشہ جیسی گفتگو کے بعد گفتگو اسی سوال پر آ پہنچی تھی۔

"واپس پاکستان کب آرہے ہیں؟"

بے اختیار سالار کا دل بھر آیا۔ اسے خود کو کمپوز کرنے میں کچھ دیر لگی۔

"اگلے ماہ آ جاؤں گا۔ میں ریزائن کر رہا ہوں۔ واپس آکر پاکستان میں ہی کام کروں گا۔"

"پھر ٹھیک ہے، آپ سے اگلے ماہ ملاقات ہو گی۔" ڈاکٹر صاحب نے تب کہا تھا۔

"دعا کیجئے گا۔" سالار آخر میں کہتا۔

"کروں گا کچھ اور ......؟"

"اور کچھ نہیں۔ اللہ حافظ ......" وہ کہتا۔

"اللہ حافظ۔" وہ جواب دیتے۔ گفتگو کا یہ سلسلہ پاکستان آنے تک جاری رہا جب وہ ان کے پاس باقاعدگی سے جانے لگا تو یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

لاہور آنے کے بعد وہ باقاعدگی سے ان کے پاس جانے لگا تھا۔ اسے ان کے پاس سکون ملتا تھا۔ صرف ان کے پاس گزارا ہوا وقت ایسا ہوتا تھا جب وہ کچھ دیر کے لئے مکمل طور پر اپنے ڈپریشن سے آزادی حاصل کر لیتا تھا۔ بعض دفعہ ان کے پاس خاموش بیٹھے بیٹھے بے اختیار اس کا دل چاہتا وہ ان کے سامنے وہ سب کچھ اگل دے جسے وہ اتنے سالوں سے اپنے اندر زہر کی طرح بھرے پھر رہا تھا۔ پچھتاوا، احساس جرم ...... بے چینی، بے بسی، شرمندگی، ندامت، ہر چیز۔ پھر اسے خوف پیدا ہوتا ڈاکٹر سبط علی اس کو پتا نہیں کن نظروں سے دیکھیں گے۔ اس کی ہمت دم توڑ جاتی۔

ڈاکٹر سید سبط علی ابہام کو دور کرنے میں کمال رکھتے تھے۔ وہ ان کے پاس خاموش بیٹھا رہتا۔ صرف سنتا، صرف سمجھتا، صرف نتیجے اخذ کرتا۔ کوئی دھند تھی جو چھٹ رہی تھی۔ کوئی چیز تھی جو نظر آنے لگی تھی۔ جن سوالوں کو وہ کئی سالوں سے سر پر بوجھ کی صورت میں لئے پھر رہا تھا ان کے پاس ان کے جواب تھے۔

"اسلام کو سمجھ کر دیکھیں تو آپ کو پتا چلے گا کہ اس میں کتنی وسعت ہے۔ یہ تنگ نظری اور تنگ دل کا دین نہیں ہے نہ ہی ان دونوں چیزوں کی اس میں گنجائش ہے۔ یہ میں سے شروع ہو کر ہم پر جاتا ہے۔ فرد سے معاشرے تک۔ اسلام آپ سے یہ نہیں کہتا کہ آپ چوبیس گھنٹے سر پر ٹوپی، ہاتھ میں تسبیح پکڑے ہر جگہ مصلے بچھائے بیٹھے رہیں۔ ہر بات میں اس کے حوالے دیتے رہیں۔ نہیں، یہ تو آپ کی زندگی سے ...... آپ کی اپنی زندگی سے حوالہ چاہتا ہے۔ یہ تو آپ سے راست بازی اور پارسائی کا مطالبہ کرتا ہے۔ دیانت داری اور محنت چاہتا ہے۔ اخلاص اور استقامت مانگتا ہے۔ ایک اچھا مسلمان اپنی باتوں سے نہیں اپنے کردار سے دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔"

سالار ان کی باتوں کو ایک چھوٹے سے ریکارڈر میں ریکارڈ کر لیتا پھر گھر آکر بھی سنتا رہتا۔ اسے ایک رہبر کی تلاش تھی، ڈاکٹر سبط علی کی صورت میں اسے وہ رہبر مل گیا تھا۔

☆ ......☆ ☆

"سالار، آؤ، اب آ بھی جاؤ۔ کتنی منتیں کرواؤ گے؟" انیتا نے اس کا بازو کھینچتے ہوئے ناراضی سے کہا۔

وہ عمار کی شادی میں شرکت کے لئے اسلام آباد آیا ہوا تھا۔ تین دن کی چھٹی لے کر حالانکہ اس کے گھر والوں کا اصرار تھا کہ وہ ایک ہفتے کے لئے آئے۔ شادی کی تقریبات کئی دن پہلے شروع ہو چکی تھیں۔ وہ ان تقریبات کی "اہمیت" اور "نوعیت" سے واقف تھا۔ اس لئے گھر والوں کے اصرار کے باوجود وہ تین دن کی رخصت لے کر آیا اور اب وہ عمار کی مہندی کے فنکشن میں شرکت کر رہا تھا جو عمار اور اس کے سسرال والے مل کر کر رہے تھے۔ عمار اور امرین دونوں کے عزیز و اقارب اور دوست مختلف فلمی اور پاپ گانوں پر رقص کرنے میں مصروف تھے۔ ایک طوفان بدتمیزی تھا جو وہاں بپا تھا۔ سلیولیس شرٹس، کھلے گلے، جسم کے ساتھ چپکے ہوئے کپڑے، باریک ملبوسات، سلک اور شیفون کی ساڑھیاں، نیٹ کے بلاؤز، اس کی فیملی کی عورتیں بھی دوسری عورتوں کی طرح اسی طرح کے ملبوسات پہنے ہوئے تھیں۔

ملگجا سا رنگ تھی اور وہ تقریب شروع ہونے پر اس ہنگامے سے کافی دور کچھ ایسے لوگوں کے پاس بیٹھا ہوا تھا جو کارپوریٹ یا بینکنگ سیکٹر سے تعلق رکھتے تھے اور سکندر یا اس کے اپنے بھائیوں کے شناسا تھے۔

مگر پھر مہندی کی رسومات کا آغاز ہونے لگا اور انیتا اسے اسٹیج کی طرف لے گئی۔ امرین اور عمار بے تکلفی سے اسٹیج پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ پہلی بار امرین سے مل رہا تھا۔ عمار نے اس کا اور امرین کا تعارف کروایا۔ مہندی کی رسومات کے بعد اس نے وہاں سے جانے کی کوشش کی مگر کامران اور طیبہ نے اسے زبردستی روک دیا۔

"بھائی کی مہندی ہو رہی ہے اور تم اس طرح وہاں کونے میں بیٹھے ہو۔" طیبہ نے اسے ڈانٹا تھا۔ "تمہیں یہاں ہونا چاہئے۔"

وہ ان کے کہنے پر وہیں کامران اور اس کی بیوی کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس کے ایک کزن نے ایک بار پھر وہ دوپٹہ اس کے گلے میں ڈالنے کی کوشش کی جو وہ سب ڈالے ہوئے تھے۔ اس نے ایک بار پھر قدرے ناگواری سے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے اسے تنبیہ کی۔

اگلے چند منٹوں کے بعد وہاں رقص شروع ہو چکا تھا۔ عمار سمیت اس کے سارے بہن بھائی اور کزنز رقص کر رہے تھے اور انیتا نے اسے بھی کھینچنا شروع کر دیا تھا۔

"نہیں انیتا! میں نہیں کر سکتا۔ مجھے نہیں آتا۔"

اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے معذرت کی مگر اس کی معذرت قبول کرنے کے بجائے وہ اور عمار اسے کھینچ کر رقص کرنے والوں کے ہجوم میں لے آئے تھے۔ کامران اور معیز کی شادی میں وہ بھی ایسے ہی رقص کرتا رہا تھا، مگر عمار کی مہندی پر وہ پچھلے سات سالوں میں اتنا لمبا ذہنی سفر طے کر چکا تھا کہ وہاں اس ہجوم کے درمیان خالی بازو کھڑے کرنا بھی اس کے لئے دشوار تھا۔ قدرے بے بس مسکراہٹ کے ساتھ وہ اسی طرح ہجوم کے درمیان کھڑا رہا پھر اس نے انیتا کے کان میں کہا۔

"انیتا میں ڈانس بھول چکا ہوں۔ Please Let me go (براہِ مہربانی مجھے جانے دو)۔"

"تم کرنا شروع کرو آ جائے گا۔" انیتا نے جواباً اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اب اسریٰ بھی اس ہجوم میں شامل ہو چکی تھی۔

"میں نہیں کر سکتا۔ تم لوگ کرو۔ میں انجوائے کر رہا ہوں۔ مجھے جانے دو۔"

اس نے مسکراتے ہوئے نکلنے کی کوشش کی۔ اسریٰ کی آمد نے اسے اس کوشش میں کامیاب کر دیا۔

"عروج ہر قوم، ہر نسل کا خواب ہوتا ہے اور پھر وہ قومیں جن پر الہامی کتابیں نازل ہوئی ہوں وہ تو عروج کو اپنا حق سمجھتی ہیں مگر کبھی بھی کسی قوم پر عروج صرف اس بناء پر نہیں آیا کہ اسے ایک کتاب اور نبی دے دیا گیا جب تک اس قوم نے اپنے اعمال اور افعال سے عروج کے لئے اپنی اہلیت ثابت نہیں کر دی وہ کسی مرتبہ، کسی مقام، کسی فضیلت کے قابل نہیں ٹھہریں۔ مسلمان قوم یا امت کے ساتھ بھی ایسا ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے۔ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے اعلیٰ طبقات عیش اور نفس پرستی کا شکار ہیں۔ یہ دونوں چیزیں وبا کی طرح ہوتی ہیں۔ ایک سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے اور پھر یہ سلسلہ کہیں رُکتا نہیں۔" اسے وہاں کھڑے ان ناچتے ہوئے عورتوں اور مردوں کے ہجوم کو دیکھتے ہوئے بے اختیار ڈاکٹر سبط علی کی باتیں یاد آنے لگیں۔

"مومن عیاش نہیں ہوتا نہ تب جب وہ رعایا ہوتا ہے نہ تب جب وہ حکمران ہوتا ہے۔ اس کی

زندگی کسی جانور یا کیڑے کی زندگی جیسی نہیں ہوتی۔ کھانا پینا، اپنی نسل کو آگے بڑھانا اور فنا ہو جانا۔ یہ کسی جانور کی زندگی کا انداز تو ہو سکتا ہے مگر کسی مسلمان کی نہیں۔" سالار بے اختیار مسکرایا۔ وہ آج پھر "جانوروں" اور "حشرات الارض" کا ایک گروہ دیکھ رہا تھا۔ اسے خوشی ہوئی۔ وہ بہت عرصہ پہلے ان میں سے نکل چکا تھا۔ وہاں ہر ایک خوش باش، پرسکون اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ بلند قہقہے اور چمکدار چہرے اور آنکھیں۔ اس کے سامنے طیبہ عمار کے سسر کے ساتھ رقص کر رہی تھیں۔ انیتا اپنے سب سے بڑے بھائی کامران کے ساتھ۔

سالار نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے دائیں کنپٹی کو مسلا۔ شاید یہ تیز میوزک تھا یا پھر اس وقت اس کا ذہنی اضطراب اسے اپنی کنپٹی میں ہلکی سی درد کی لہر گزرتی محسوس ہوئی۔ اپنے گلاسز اُتار کر اس نے بائیں ہاتھ سے اپنی دونوں آنکھیں مسلیں۔ دوبارہ گلاسز آنکھوں پر لگاتے ہوئے اس نے مڑ کر راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی، کچھ جدوجہد کے بعد وہ اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے اس دائرے سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسے بخوشی راستہ دے دیا گیا۔

"کدھر جا رہے ہو؟" بے ہنگم شور میں طیبہ نے بلند آواز میں جانے سے پہلے اس کا بازو پکڑ کر پوچھا تھا۔ وہ ابھی رقص کرتے کرتے کچھ تھک کر اس کے پاس کھڑی ہوئی تھیں ان کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"ممی! میں ابھی آتا ہوں۔ نماز پڑھ کر۔"

"آج رہنے دو......"

سالار مسکرایا مگر اس نے جواب میں کچھ کہا نہیں بلکہ نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے نرمی سے ان کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹا دیا۔

وہ اب باہر نکلنے کی تگ و دو کر رہا تھا۔

"یہ کبھی نارمل نہیں ہو سکتا۔ زندگی کو انجوائے کرنا بھی ایک آرٹ ہے اور یہ آرٹ اس بے وقوف کو کبھی نہیں آئے گا۔" انہوں نے اپنے تیسرے بیٹے کی پشت کو دیکھتے ہوئے قدرے افسوس سے سوچا۔

سالار نے اس ہجوم سے نکل کر بے اختیار سکون کی سانس لی تھی۔

وہ جس وقت نماز پڑھنے کے لئے اپنے گھر کے گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ شہر اس وقت بھی گانے میں مصروف تھا۔ اس وقت مسجد کی طرف جانے والا وہ اکیلا تھا۔ شاید گاڑیوں کی لمبی قطاروں کے درمیان سے سڑک پر چلتے ہوئے وہ مسلسل ڈاکٹر سبط علی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ "سینکڑوں" کے اس مجمع کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا جو اس کے گھر پر ناچ گانے میں مصروف تھے۔ مسجد میں کل "چودہ" لوگوں نے باجماعت نماز ادا کی تھی۔

☆......☆......☆

پاکستان آنے کے بعد اسلام آباد اپنی پوسٹنگ کے دوران وہ سکندر عثمان کے گھر پر ہی رہتا رہا۔ لاہور آنے کے بعد بھی کسی پوش علاقے میں کوئی بڑا گھر رہائش کے لئے منتخب کرنے کے بجائے اس نے فرقان کی بلڈنگ میں ایک فلیٹ کرائے پر لینے کو ترجیح دی۔

فرقان کے پاس فلیٹ لینے کی ایک وجہ اگر یہ تھی کہ وہ لاہور میں اپنی عدم موجودگی کے دوران فلیٹ کے بارے میں کسی عدم تحفظ کا شکار نہیں ہوتا تھا تو دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ فلیٹ کے بجائے کوئی گھر لینے پر اسے دو چار ملازم مستقل رکھنے پڑتے جب کہ اس کا بہت کم وقت فلیٹ پر گزرتا تھا۔ فرقان کے ساتھ آہستہ آہستہ لاہور میں اس کا سوشل سرکل بہت وسیع ہونے لگا تھا۔ فرقان بہت سوشل آدمی تھا اور اس کا حلقہ احباب بھی خاصا لمبا چوڑا تھا۔ وہ سالار کے موڈ اور ٹمپرامنٹ کو سمجھنے کے باوجود وقتاً فوقتاً اپنے ساتھ مختلف جگہوں پر کھینچتا رہتا۔

وہ اس رات فرقان کے ساتھ اس کے کسی ڈاکٹر دوست کی ایک پارٹی اور محفل غزل میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ وہ ایک فارم پر ہونے والی پارٹی تھی۔ اس نے سالار کو مدعو کر لیا اور محفل غزل کا سن کر وہ انکار نہیں کر سکا۔

فارم پر شہر کی ایلیٹ کلاس کا اجتماع تھا۔ وہ ان میں سے اکثریت کو جانتا تھا۔ وہ اپنے شناسا کچھ لوگوں کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ ڈنر چل رہا تھا اور ان ہی باتوں کے دوران اس نے فرقان کی تلاش میں نظر دوڑائی تھی وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ سالار ایک بار پھر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ کھانے کے بعد اسے چند لوگوں کے ساتھ فرقان کھڑا نظر آ گیا۔ وہ بھی اس طرف بڑھ آیا۔

''آؤ سالار! میں تمہارا تعارف کرواتا ہوں۔'' فرقان نے اس کے قریب آنے پر چند جملوں کے تبادلے کے بعد کہا۔ ''یہ ڈاکٹر رضا ہیں۔ گنگا رام ہاسپٹل میں کام کرتے ہیں۔ چائلڈ اسپیشلسٹ ہیں۔'' سالار نے ہاتھ ملایا۔

''یہ ڈاکٹر جلال انصر ہیں۔'' سالار کو اس شخص سے تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ فرقان اب کیا کہہ رہا تھا وہ سن نہیں پایا۔ اس نے جلال انصر کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ دونوں کے درمیان بہت رسمی سا مصافحہ ہوا۔ جلال انصر نے بھی یقیناً اسے پہچان لیا تھا۔

سالار وہاں ایک اچھی شام گزارنے آیا تھا مگر اس وقت اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک اور بری رات گزارنے آیا تھا۔ یادوں کا ایک سیلاب تھا جو ایک بار پھر ہر بند توڑ کر اس پر چڑھائی کر رہا تھا۔ وہ سب اب اس طرف جا رہے تھے جہاں بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ اب فرقان تھا۔ جلال انصر اب اس سے کچھ آگے دوسرے ڈاکٹرز کے ساتھ تھا۔ سالار نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کی پشت کو دیکھا۔

وحشت تنہائی میں اے جان جہاں

لرزاں ہیں

تیری آواز کے سائے

تیرے ہونٹوں کے سراب

اقبال بانو گانا شروع کر چکی تھیں۔

وحشت تنہائی میں

دوری کے

خس و خاشاک کے

کھل رہے ہیں

تیرے پہلو کے سمن اور گلاب

اس کے اردگرد بیٹھے لوگ اپنا سر دھن رہے تھے۔ سالار چند ٹیبلز کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے اس شخص کو دیکھ رہا تھا جو اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ اسے زندگی میں کبھی کسی شخص کو دیکھ کر رشک نہیں آیا تھا، اس دن پہلی بار آ رہا تھا۔

آدھا گھنٹہ گزر جانے کے بعد اس نے فرقان سے کہا۔

''چلیں؟'' فرقان نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کہاں؟''

''گھر''

''ابھی تو پروگرام شروع ہوا ہے۔ تمہیں بتایا تو تھا، رات دیر تک یہ محفل چلے گی۔''

''ہاں، مگر میں جانا چاہتا ہوں۔ کسی کے ساتھ بھجوا دو۔ تم بعد میں آ جانا۔''

فرقان نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

''تم کیوں جانا چاہتے ہو؟''

''مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''اقبال بانو کو سنتے ہوئے بھی کوئی دوسرا کام یاد آ گیا ہے؟'' فرقان نے قدرے ملامتی انداز میں کہا۔

''تم بیٹھو میں چلا جاتا ہوں۔'' سالار نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''عجیب باتیں کرتے ہو۔ یہاں سے کیسے جاؤ گے۔ فارم اتنا دور ہے۔ چلو اگر اتنی ہی جلدی ہے تو چلتے ہیں۔'' فرقان بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میزبان سے اجازت لیتے ہوئے وہ دونوں فرقان کی گاڑی میں آ بیٹھے۔

"اب بتاؤ۔ یوں اچانک کیا ہوا ہے؟" گاڑی کو فارم سے باہر لاتے ہوئے فرقان نے کہا۔

"میرا وہاں ٹھہرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔"

"کیوں ... ؟" سالار نے جواب نہیں دیا۔ وہ باہر سڑک کو دیکھتا رہا۔

"وہاں سے اٹھ آنے کی وجہ جلال ہے؟"

سالار نے بے اختیار گردن موڑ کر فرقان کو دیکھا۔ فرقان نے ایک گہرا سانس لیا۔

"یعنی میرا اندازہ ٹھیک ہے۔ تم جلال انصر کی وجہ سے ہی فنکشن سے بھاگ آئے ہو۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" سالار نے ہتھیار ڈالنے والے انداز میں کہا۔

"تم دونوں بڑے عجیب انداز میں آپس میں ملے تھے۔ جلال انصر نے خلافِ معمول تمہیں کوئی اہمیت نہیں دی جب کہ تمہارے جیسی شہرت والے بینکر کے سامنے تو اس جیسے آدمی کو مکمل اٹھنا چاہئے تھا۔ وہ تعلقات بنانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا، خود تم بھی مسلسل اسے دیکھ رہے تھے۔" فرقان بہت آرام سے کہہ رہا تھا۔

"تم جلال انصر کو جانتے ہو؟"

سالار نے گردن سیدھی کر لی۔ وہ ایک بار پھر سڑک کو دیکھ رہا تھا۔

"امامہ اسی شخص سے شادی کرنا چاہتی تھی۔" بہت دیر بعد اس نے مدھم آواز میں کہا۔ فرقان کچھ بول نہیں سکا۔ اسے توقع نہیں تھی جلال اور سالار کے درمیان اس طرح کی شناسائی ہوگی ورنہ وہ شاید یہ سوال کبھی نہ کرتا۔

گاڑی میں بہت دیر خاموشی رہی پھر فرقان نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

"مجھے یہ جان کر مایوسی ہوئی ہے کہ وہ جلال جیسے آدمی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی۔ یہ تو بڑا فراڈ آدمی ہے۔ ہم لوگ اس کو "قصائی" کہتے ہیں۔ اس کی واحد دلچسپی پیسہ ہے۔ مریض کیسے لا کر دے گا، کہاں سے لا کر دے گا، اسے دلچسپی نہیں ہوتی۔ تم دیکھنا آٹھ دس سال میں یہ اسی رفتار کے ساتھ پیسہ کماتے ہوئے لاہور کا سب سے امیر ڈاکٹر ہوگا۔"

فرقان اب جلال انصر کے بارے میں تبصرہ کر رہا تھا۔ سالار خاموشی سے سن رہا تھا۔ جب فرقان نے اپنی بات ختم کر لی تو اس نے کہا۔

"اس کو قسمت کہتے ہیں۔"

"تمہیں اس پر رشک آ رہا ہے؟" فرقان نے قدرے حیرانی سے کہا۔

"حسد تو میں کر نہیں سکتا۔" سالار عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ "یہ جو کچھ تم مجھے اس کے بارے

میں بتا رہے ہو۔ یہ سب کچھ مجھے بہت سال پہلے پتا تھا۔ تب ہی جب میں امامہ کے سلسلے میں اس سے ملا تھا۔ یہ کیسا ڈاکٹر بننے والا تھا، مجھے اندازہ تھا مگر آج اس فنکشن میں اسے دیکھ کر مجھے اس پر بے تحاشا رشک آیا۔ کچھ بھی نہیں ہے اس کے پاس۔ معمولی شکل و صورت ہے۔ خاندان بھی خاص نہیں ہے۔ اس جیسے ہزاروں ڈاکٹرز ہوتے ہیں۔ لالچی، مادہ پرست بھی ہے مگر قسمت دیکھو کہ امامہ ہاشم جیسی لڑکی اس کے عشق میں مبتلا ہوئی۔ اس کے پیچھے خوار ہوتی پھری۔ میں اور تم اسے قصائی کہہ لیں، کچھ بھی کہہ لیں، صرف ہماری باتوں سے اس کی قسمت تو نہیں بدل جائے گی نہ اس کی نہ میری۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ فرقان نے اس کے چہرے کو دھواں دھواں ہوتے دیکھا۔

"کوئی نہ کوئی خوبی تو ہوگی اس میں کہ...... کہ امامہ ہاشم کو اور کسی سے نہیں صرف اسی سے محبت ہوئی۔" وہ اب اپنی دونوں آنکھوں کو مسل رہا تھا۔

"مجھے اگر پتا ہوتا کہ یہاں تم جلال انصر سے ملو گے تو میں تمہیں کبھی اپنے ساتھ یہاں نہ لاتا۔" فرقان نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی اگر یہ پتا ہوتا کہ میں یہیں اس کا سامنا کروں گا تو میں بھی کسی قیمت پر یہاں نہ آتا۔" سالار نے ونڈ اسکرین سے نظر آنے والی تاریک سڑک کو دیکھتے ہوئے افسردگی سے سوچا۔

کچھ اور سفر بے حد خاموشی سے طے ہوا پھر فرقان نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا۔

"تم نے اسے کبھی ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی؟"

"امامہ کو ... ؟ یہ ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"میں اسے کیسے ڈھونڈ سکتا ہوں۔ کئی سال پہلے ایک بار میں نے کوشش کی تھی کوئی فائدہ نہیں ہوا اور اب ... اب تو یہ اور بھی مشکل ہے۔"

"تم نیوز پیپرز کی مدد لے سکتے ہو۔"

"اشتہار دوں اس کے بارے میں؟" سالار نے قدرے خفگی سے کہا۔ "وہ تو پتا نہیں ملے یا نہ ملے لیکن اس کے گھر والے مجھ تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ شک تو ان کو مجھ پر پہلے بھی تھا اور فرض کرو میں ایسا کچھ کر بھی لوں تو نیوز پیپر میں کیا اشتہار دوں۔ کیا کہوں؟" اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"پھر اسے بھول جاؤ۔" فرقان نے بڑی سہولت سے کہا۔

"کوئی سانس لینا بھول سکتا ہے؟" سالار نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"سالار! اب بہت سال گزر گئے ہیں۔ تم آخر کتنی دیر اس طرح اس لاحاصل عشق میں مبتلا رہو گے۔ تمہیں اپنی زندگی کو دوبارہ پلان کرنا چاہئے۔ تم اپنی ساری زندگی امامہ ہاشم کے لئے تو ضائع نہیں

کر سکے۔"

"میں کچھ بھی ضائع نہیں کر رہا ہوں۔ نہ زندگی کو، نہ وقت کو، نہ اپنے آپ کو۔ میں اگر امامہ ہاشم کو یاد رکھے ہوئے ہوں تو صرف اس لئے کیونکہ میں اسے بھلا نہیں سکتا۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ مجھے اس کے بارے میں سوچنے سے بہت تکلیف ہوتی ہے لیکن میں اس تکلیف کا عادی ہو چکا ہوں۔ ہوں۔ وہ میری پوری زندگی کو dominate کرتی ہے۔ وہ میری زندگی میں نہ آتی تو میں آج یہاں پاکستان میں تمہارے ساتھ نہ بیٹھا ہوتا۔ سالار سکندر کہیں اور ہوتا شاید ہوتا ہی نہ۔ مجھ پر اس کا قرض بہت ہے۔ جس آدمی کے مقروض ہوں اس کو چٹکی سے پکڑ کر اپنی زندگی سے کوئی باہر نہیں کر سکتا۔ میں بھی نہیں کر سکتا۔"

سالار نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"فرض کرو وہ دوبارہ نہ ملے پھر......؟" فرقان نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ یکلخت گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔ بہت دیر بعد سالار نے کہا۔

"میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ کسی اور موضوع پر بات کرتے ہیں۔" اس نے بڑی سہولت سے بات بدل دی۔

☆ ☆ ☆

چند سالوں میں فرقان کی طرح اس نے بھی گاؤں میں بہت کام کیا تھا اور فرقان کی نسبت زیادہ تیز رفتاری سے کیونکہ فرقان کے برعکس وہ بہت زیادہ اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ اس نے چند سالوں میں اس گاؤں کی حالت بدل کر رکھ دی تھی۔ صاف پانی، بجلی اور بڑی سڑک تک جاتی ایک پختہ سڑک، اس کے پہلے دو سالوں کی کارکردگی تھی۔ تیسرے سال وہاں ڈاک خانہ، محکمہ زراعت کا دفتر اور فون کی سہولت آئی تھی اور چوتھے سال اس کے اپنے ہائی اسکول میں سہ پہر کی کلاسز میں ایک این جی او کی مدد سے لڑکیوں کے لئے دستکاری سکھانے کا آغاز کیا گیا۔ گاؤں کی ڈسپنسری میں ایمبولینس آگئی۔ وہاں کچھ اور مشینری نصب کی گئی۔ فرقان کی طرح یہ ڈسپنسری بھی اس نے اپنے وسائل سے اسکول کے ساتھ ہی شروع کی تھی اور اسے مزید بہتر بنانے میں فرقان نے اس کی مدد کی تھی۔

فرقان کے برعکس اس کی ڈسپنسری میں ڈاکٹر کی عدم دستیابی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کی ڈسپنسری کا باقاعدہ آغاز ہونے سے بھی پہلے ایک ڈاکٹر اس کی کوششوں کی وجہ سے وہاں موجود تھا۔

اسکول پر ہونے والے تمام اخراجات تقریباً اسی کے تھے لیکن ڈسپنسری کو قائم کرنے اور اسے چلانے کے لئے ہونے والے اخراجات اس کے کچھ دوست برداشت کر رہے تھے۔ یونیسیف میں کام کے دوران بنائے ہوئے کانٹیکٹ اور دوستیاں اب اس کے کام آرہی تھیں اور وہ انہیں استعمال کر رہا تھا۔ وہ یونیسیف اور یونیسکو میں اپنے بہت سے دوستوں کو پاکستان آنے پر وہیں لا چکا تھا۔ وہ اب وہاں ووکیشنل ٹریننگ کی پلاننگ کرنے میں مصروف تھا، مگر چوتھے سال میں صرف یہی کچھ نہیں ہوا تھا کچھ اور بھی ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

سکندر عثمان اس دن سہ پہر کے قریب اسلام آباد آتے ہوئے گاڑی کا ٹائر پنکچر ہونے پر سڑک پر رُک گئے۔ ڈرائیور ٹائر بدلنے لگا اور وہ سڑک کے اطراف نظریں دوڑانے لگے۔ تب ان کی نظر ایک سائن بورڈ پر پڑی۔ وہاں لکھے ہوئے گاؤں کے نام نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ سالار سکندر کے حوالے سے وہ نام ان کے لئے ناآشنا نہیں تھا۔

ڈرائیور جب ٹائر بدل کر واپس ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھا تو سکندر عثمان نے اس سے کہا۔

"اس گاؤں میں چلو۔" انہیں اچانک ہی تجسس پیدا ہوا تھا۔ اس اسکول کے بارے میں جو سالار سکندر پچھلے کئی سالوں سے وہیں چلا رہا تھا۔

کچی سڑک پر تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے دس منٹ میں وہ گاؤں کے اندر موجود تھے۔ آبادی شروع ہو چکی تھی۔ کچھ کچی پکی دکانیں نظر آنے لگی تھیں۔ شاید یہ گاؤں کا "کمرشل ایریا" تھا۔

"یہاں نیچے اتر کر کسی سے پوچھو کہ سالار سکندر کا اسکول کہاں ہے۔" سکندر عثمان نے ڈرائیور کو ہدایت دی۔ اس وقت انہیں یاد آیا تھا کہ اس نے کبھی ان کے سامنے اسکول کا نام نہیں لیا تھا اور جہاں ان کی گاڑی موجود تھی وہاں آس پاس کسی اسکول کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ گاؤں کے لوگوں کے لئے چند سال پہلے سکندر عثمان کی گاڑی بے حد اشتیاق یا تجسس کا باعث بنتی مگر پچھلے کچھ سالوں میں سالار اور فرقان کی وجہ سے وہاں وقتاً فوقتاً گاڑیوں کی آمد ہوتی رہتی تھی۔ یہ پہلے کی طرح ان کے لئے تعجب انگیز نہیں رہی تھی مگر وہ گاڑی وہاں سے ہمیشہ کی طرح گزر جانے کے بجائے جب وہیں کھڑی ہو گئی تو یک دم لوگوں میں تجسس بیدار ہوا۔

سکندر عثمان کی ہدایت پر ڈرائیور نیچے اتر کر پاس کی ایک دکان کی طرف گیا اور وہاں بیٹھے چند لوگوں سے اسکول کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"یہاں سالار سکندر صاحب کا کوئی اسکول ہے؟" علیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا۔

"ہاں جی ہے یہ اسی سڑک پر آگے دائیں طرف موڑ مڑنے پر بڑی سی عمارت ہے۔" ایک آدمی نے بتایا۔

"آپ ان کے کوئی دوست ہیں؟" اس آدمی نے جواب کے ساتھ ساتھ سوال بھی کیا۔

"نہیں میں ان کے والد کے ساتھ آیا ہوں۔"

"والد؟" اس آدمی کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہاں بیٹھے ہوئے تمام لوگ یک دم سکندر عثمان کی گاڑی کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر اس آدمی نے اٹھ کر ڈرائیور سے ہاتھ ملایا۔

"سالار صاحب کے والد آئے ہیں بڑی خوش قسمتی ہے۔" اس آدمی نے کہا اور پھر ڈرائیور کے ساتھ گاڑی کی طرف آنے لگا۔ وہاں بیٹھے ہوئے باقی لوگ بھی کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے آئے۔

سکندر عثمان نے دور سے انہیں ایک گروپ کی شکل میں اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ کچھ الجھن کا شکار ہو گئے۔ ڈرائیور کے پیچھے آنے والے آدمی نے بڑی عقیدت کے ساتھ کھڑکی سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ سکندر عثمان نے کچھ تذبذب کے عالم میں اس سے ہاتھ ملایا جب کہ اس آدمی نے بڑے جوش و خروش سے دونوں ہاتھوں کے ساتھ ان سے مصافحہ کیا۔ اس کے ساتھ آنے والے دوسرے آدمی بھی اب یہی کر رہے تھے۔ سکندر کچھ الجھن کے انداز میں ان سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ صاب!"

پہلے ادھیڑ عمر آدمی نے عقیدت بھرے انداز میں کہا۔

"آپ کے لئے چائے لائیں یا پھر بوتل.... " وہ آدمی اسی جوش و خروش سے پوچھ رہا تھا۔

ڈرائیور اب گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔

"نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں۔ بس راستہ ہی پوچھنا تھا۔" انہوں نے جلدی سے کہا۔

ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ آدمی اور اس کے ساتھ کھڑے دوسرے لوگ وہیں کھڑے گاڑی کو آگے جاتے دیکھتے رہے پھر اس آدمی نے قدرے مایوسی سے سر ہلایا۔

"سالار صاحب کی اور بات ہے۔"

"ہاں سالار صاحب کی اور ہی بات ہے، وہ بھی کچھ کھائے پیئے بغیر یہاں سے اس طرح جاتے تھے۔" ایک دوسرے آدمی نے تائید کی۔ وہ لوگ اب واپس قدم بڑھانے لگے۔

سالار گاؤں میں موجود ان چند دکانوں کے پاس ہی اپنی گاڑی کھڑی کر دیا کرتا تھا اور پھر وہاں موجود لوگوں سے ملتے ان کی پیش کردہ چھوٹی موٹی چیزیں کھاتا پیتا وہاں سے پیدل دس منٹ میں اپنے اسکول چلا جاتا تھا۔ وہ لوگ مایوس ہوئے تھے۔ سکندر عثمان نے تو گاڑی سے اترنے تک کا تکلف نہیں کیا تھا، کھانا پینا تو دور کی بات تھی۔

گاڑی اب موڑ مڑ رہی تھی اور موڑ مڑتے ہی ڈرائیور سے مزید کچھ کہتے کہتے سکندر عثمان خاموش ہو گئے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ونڈ اسکرین کے پار نظر آنے والی وسیع و عریض عمارت ان چھوٹے چھوٹے کچے پکے مکانوں اور کھلے کھیتوں کے درمیان دور سے بھی حیرت میں ڈالنے کے لئے کافی تھی۔ سکندر کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ وہاں اتنا بڑا اسکول چلا رہا تھا مگر ان کو دم بخود اس اسکول کی دور تک پھیلی ہوئی عمارت

نے نہیں کیا تھا بلکہ اسکول کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر لگے اس سائن بورڈ نے کیا جس پر تیر کے ایک نشان کے اوپر جلی حروف میں اردو میں تحریر تھا۔ سکندر عثمان ہائی اسکول۔ ڈرائیور گاڑی اسکول کے سامنے روک چکا تھا۔

سکندر عثمان نے گاڑی سے اتر کر اس عمارت کے گیٹ کے پار عمارت کے ماتھے پر چمکتے ہوئے اپنے نام کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیر گئی۔ سالار سکندر نے ایک بار پھر انہیں کچھ بولنے کے قابل نہیں رکھا تھا۔ گیٹ بند تھا مگر اس کے دوسری طرف چوکیدار موجود تھا جو گاڑی کو وہاں رکتے دیکھ کر گیٹ کھول رہا تھا۔ ڈرائیور جب تک گاڑی سے اترا چوکیدار باہر آ گیا۔

"صاحب شہر سے آئے ہیں ذرا اسکول دیکھنا چاہتے ہیں۔" ڈرائیور نے چوکیدار سے کہا۔ سکندر عثمان ہنوز اس اسکول پر لگے اپنے نام کو دیکھ رہے تھے۔

"سالار صاحب کے حوالے سے آئے ہیں؟" چوکیدار نے پوچھا۔

"نہیں ....." ڈرائیور نے بلاتوقف کہا۔ "ویسے ہی آئے ہیں۔" سکندر عثمان نے پہلی بار اپنی نظریں ہٹا کر ڈرائیور اور پھر چوکیدار کو دیکھا۔

"میں سالار سکندر کا باپ ہوں۔" سکندر عثمان نے مستحکم مگر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ڈرائیور نے حیرانی سے ان کو دیکھا۔ چوکیدار ایک دم بوکھلا گیا۔

"آپ ... آپ سکندر عثمان صاحب ہیں؟" سکندر کچھ کہے بغیر میکانکی انداز میں گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔

☆......☆......☆

وہ شام کو جاگنگ ٹریک پر تھا جب موبائل پر سکندر عثمان کی کال آئی۔ اپنی بے ترتیب سانس پر قابو پاتے ہوئے وہ جاگنگ کرتے کرتے رک گیا اور ٹریک کے پاس ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔

"ہیلو پاپا! السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام.... ٹریک پر ہو؟" انہوں نے اس کے پھولے ہوئے سانس سے اندازہ لگایا۔

"جی.... آپ کیسے ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں......"

"ممی کیسی ہیں؟"

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔" سالار ان کی طرف سے کچھ مزید کہنے یا پوچھنے کا انتظار کرتا رہا۔ دوسری طرف اب خاموشی تھی پھر چند لمحوں کے بعد وہ بولے۔

"میں آج تمہارا اسکول دیکھ کر آیا ہوں۔"

"رئیلی … !" سالار نے بے ساختہ کہا۔

"کیسا لگا آپ کو؟"

"تم نے یہ سب کیسے کیا ہے سالار؟"

"کیا … ؟"

"وہ سب کچھ جو وہاں پر ہے۔"

"پتا نہیں۔ بس ہوتا گیا۔ مجھے پتا ہوتا تو میں آپ کو خود ساتھ لے جاتا۔ کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی؟" سالار کو تشویش ہوئی۔

"وہاں سالار سکندر کے باپ کو کوئی پرابلم ہو سکتی ہے؟" انہوں نے جواباً کہا۔ سالار جانتا تھا وہ سوال نہیں تھا۔

"تم کس طرح کے آدمی ہو سالار؟"

"پتا نہیں … آپ کو پتا ہونا چاہئے، میں آپ کا بیٹا ہوں۔"

"نہیں مجھے … مجھے تو کبھی بھی پتا نہیں چل سکا۔" سکندر کا لہجہ عجیب تھا۔ سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔

"مجھے بھی کبھی پتا نہیں چل سکا۔ میں تو اب بھی اپنے آپ کو جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"تم … تم … سالار ایک انتہائی احمق، کمینے اور خبیث انسان ہو۔"

سالار ہنسا

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں واقعی ایسا ہوں … اور کچھ … ؟"

"اور … یہ کہ میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ تم میری اولاد ہو۔" سکندر عثمان کی آواز لرز رہی تھی۔ اس بار چپ رہنے کی باری سالار کی تھی۔

"مجھے اس اسکول کے ہر ماہ کے اخراجات کے بارے میں بتا دینا۔ میری فرم ہر ماہ اس رقم کا چیک تمہیں بھجوا دیا کرے گی۔"

اس سے پہلے کہ سالار کچھ کہتا فون بند ہو چکا تھا۔ سالار نے پارک میں پھیلی تاریکی میں ہاتھ میں پکڑے موبائل کی روشن اسکرین کو دیکھا۔ پھر جاگنگ ٹریک پر لگی روشنیوں میں وہاں دوڑتے لوگوں کو کچھ دیر وہ یونہی خالی الذہنی کے عالم میں ان لوگوں کو دیکھتا رہا پھر اٹھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ٹریک پر آ گیا۔

☆ ☆ ☆

رمشہ سے سالار کی پہلی ملاقات لاہور آنے کے ایک سال بعد ہوئی تھی۔ وہ لندن اسکول آف

اکنامکس کی گریجویٹ تھی اور سالار کے بینک میں اس کی تعیناتی ہوئی تھی۔ اس کے والد بہت عرصے سے اس بینک کے کسٹمرز میں سے تھے اور سالار انہیں ذاتی طور پر جانتا تھا۔

رمشہ بہت خوب صورت، ذہین اور خوش مزاج لڑکی تھی اور اس نے وہاں آنے کے کچھ عرصے کے بعد ہی ہر ایک سے خاصی بے تکلفی پیدا کر لی تھی۔ ایک کولیگ کے طور پر سالار کے ساتھ بھی اس کی اچھی سلام دعا تھی اور کچھ اس کے والد کے حوالے سے بھی وہ اس کی خاصی عزت کرتا تھا۔ بینک میں کام کرنے والی چند دوسری لڑکیوں کی نسبت رمشہ سے اس کی کچھ زیادہ بے تکلفی تھی۔

لیکن سالار کو قطعاً اندازہ نہیں ہوا کہ کس وقت رمشہ نے اسے کچھ زیادہ سنجیدگی سے لینا شروع کر دیا۔ وہ سالار کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ وہ اس کے آفس میں بھی زیادہ آنے جانے لگی تھی اور آفس کے بعد بھی اکثر اوقات اسے کال کرتی رہتی۔ سالار کو چند بار اس کا رویہ کچھ خلافِ معمول لگا لیکن اس نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے شبہات کو جھٹک دیا مگر اس کا یہ اطمینان پورے ایک سال کے بعد ایک واقعے کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

سالار صبح آفس میں داخل ہوا اور داخل ہوتے ہی چونک گیا۔ اس کی ٹیبل پر ایک بہت بڑا اور خوب صورت بکے پڑا ہوا تھا۔ اپنا بریف کیس ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے وہ بکے اٹھا کر اس پر موجود کارڈ کھولا۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو سالار سکندر"

رمشہ ہمدانی

سالار نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ آج اس کی سالگرہ تھی مگر رمشہ یہ کیسے جانتی تھی۔ وہ کچھ دیر کسی سوچ میں گم ٹیبل کے پاس کھڑا رہا پھر اس نے بکے ٹیبل پر ایک طرف رکھ دیا۔ اپنا کوٹ اتار کر اس نے ریوالونگ چیئر کی پشت پر لٹکایا اور چیئر پر بیٹھ گیا۔ بکے کے نیچے ٹیبل پر بھی ایک کارڈ پڑا ہوا تھا۔ اس نے بیٹھنے کے بعد اس کارڈ کو کھولا۔ چند لمحے تک وہ اس میں لکھی ہوئی تحریر پڑھتا رہا پھر کارڈ بند کر کے اس نے اپنی دراز میں رکھ دیا۔ وہ نہیں جانتا تھا اس کارڈ اور اس بکے پر کس ردعمل کا اظہار کرے۔ چند لمحے وہ کچھ سوچتا رہا پھر اس نے کندھے جھٹک کر اپنا بریف کیس کھولنا شروع کر دیا۔ وہ اس میں سے اپنا لیپ ٹاپ نکال کر بریف کیس کو نیچے کارپٹ پر اپنی ٹیبل کے ساتھ رکھ رہا تھا جب رمشہ اندر داخل ہوئی۔

"ہیپی برتھ ڈے سالار۔" اس نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔

سالار مسکرایا۔

"تھینکس ..." رمشہ اب ٹیبل کے سامنے پڑی کرسی کھینچ کر بیٹھ رہی تھی، جب کہ سالار لیپ ٹاپ کو کھولنے میں مصروف تھا۔

"کیک اور کارڈ کے لئے بھی شکریہ۔ یہ ایک خوشگوار سرپرائز تھا۔"

سالار نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا وہ اب اپنا فون لیپ ٹاپ کے ساتھ اٹیچ کرنے میں مصروف تھا۔

"مگر تمہیں میری برتھ ڈے کے بارے میں پتا کیسے چلا؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

"جناب یہ تو میں نہیں بتاؤں گی۔ بس پتا چلانا تھا۔ پتا لیا۔" رمشہ نے شگفتگی سے کہا۔ "اور ویسے بھی دوست آپس میں یہ سوال کبھی نہیں کرتے۔ اگر دوستوں کو ایسی چیزوں کا بھی پتہ نہیں ہوگا تو پھر وہ دوست تو نہیں ہوئے۔"

سالار لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظریں جمائے مسکراتے ہوئے اس کی بات سنتا رہا۔

"اب میں سارے اسٹاف کی طرف سے پارٹی کی ڈیمانڈ کے لئے آئی ہوں۔ آج کا ڈنر تمہیں ارینج کرنا چاہئے۔" سالار نے لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔

"رمشہ! میں اپنی برتھ ڈے سیلیبریٹ نہیں کرتا۔"

"کیوں ؟"

"ویسے ہی ..."

"کوئی وجہ تو ہوگی۔"

"کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ بس میں ویسے ہی سیلیبریٹ نہیں کرتا۔"

"پہلے نہیں کرتے ہوگے مگر اس بار تو کرنی پڑے گی۔ اس بار تو سارے اسٹاف کی ڈیمانڈ ہے۔" رمشہ نے بے تکلفی سے کہا۔

"میں کسی بھی دن آپ سب لوگوں کو کھانا کھلا سکتا ہوں۔ میرے گھر پر، ہوٹل میں، جہاں آپ چاہیں مگر میں برتھ ڈے کے سلسلے میں نہیں کھلا سکتا۔" سالار نے صاف گوئی سے کہا۔

"یعنی تم چاہتے ہو کہ ہم تمہارے لئے پارٹی ارینج کر دیں۔" رمشہ نے کہا۔

"میں نے ایسا نہیں کہا۔" وہ کچھ حیران ہوا۔

"اگر تم پورے اسٹاف کو پارٹی نہیں بھی دے سکتے تو کم از کم مجھے ڈنر پر تو لے جا سکتے ہو۔"

"رمشہ! میں آج رات کچھ مصروف ہوں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ۔" سالار نے ایک بار پھر معذرت کی۔

"کوئی بات نہیں، میں بھی آ جاؤں گی۔" رمشہ نے کہا۔

"نہیں یہ مناسب نہیں ہوگا۔"

"کیوں ؟"

"وہ سب مرد ہیں اور تم ان سے واقف بھی نہیں ہو۔" اس نے بہانا بنایا۔

"میں سمجھتی ہوں۔" رمشہ نے کہا۔

"پھر کل چلتے ہیں؟"

"کل نہیں .... پھر کبھی چلیں گے۔ میں تمہیں بتا دوں گا۔"

رمشہ کچھ مایوس ہوئی مگر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اسے فی الحال باہر کہیں لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔

"او کے ...." وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"مجھے امید ہے، تم نے مائنڈ نہیں کیا ہوگا۔" سالار نے اسے اٹھتے دیکھ کر کہا۔

"نہیں بالکل نہیں۔ It's alright" وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ سالار اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کا خیال تھا سالگرہ کا وہ معاملہ وہیں ختم ہو گیا۔ یہ اس کی غلط فہمی تھی۔

لنچ آور کے دوران اس کے لئے ایک سرپرائز پارٹی تیار تھی۔ اس کے باس مسٹر پال طر نے بڑی گرم جوشی سے سالگرہ پر مبارکباد دی تھی۔ وہ پارٹی رمشہ نے ارینج کی تھی اور کیک اور دوسرے لوازمات کو دیکھتے ہوئے وہ پہلی بار صحیح معنوں میں تشویش میں مبتلا ہوا تھا اگر پہلے رمشہ ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنا پسندیدگی ظاہر کر رہی تھی تو اس دن اس نے بہت واضح انداز میں یہ بات ظاہر کر دی تھی۔ وہ لنچ آور کے بعد تقریباً آدھ گھنٹہ اپنے آفس میں بیٹھا پہلی بار رمشہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس سے کون سی ایسی غلطی ہوئی تھی، جس سے رمشہ کو اس میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ بہت خوب صورت تھی۔ پچھلے کچھ عرصے میں ملنے والی چند اچھی لڑکیوں میں سے ایک تھی مگر وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس میں انوالو ہونے لگے۔ وہ پچھلے کچھ عرصے سے رمشہ کے اپنے لئے خاص رویے کو اس کی خوش اخلاقی سمجھ کر نظر انداز کر رہا تھا، مگر اس دن آفس سے نکلتے ہوئے اس کی طرف سے دیئے جانے والے چند پیکٹس کو گھر جا کر کھولنے پر اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ وہ ابھی ان تحائف کو دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہو رہا تھا، جب فرقان آ گیا۔ ڈرائنگ روم میں پڑے وہ پیکٹس فوراً اس کی نظر میں آ گئے۔

"واؤ، آج تو خاصے تحائف اکٹھے ہو رہے ہیں۔ دیکھ لوں؟" فرقان نے صوفہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

سالار نے صرف سر ہلایا، گھڑی، پرفیومز، ٹائیاں، شرٹس، وہ یکے بعد دیگرے ان چیزوں کو نکال نکال کر دیکھتا رہا۔

"یہ تمہاری برتھ ڈے کا سامان اکٹھا نہیں ہو گیا؟" فرقان نے مسکراتے ہوئے تبصرہ کیا۔ "خاصا دل

کھول کر گفٹس دیے ہیں تمہارے کولیگز نے۔"

"صرف ایک کولیگ نے۔" سالار نے مداخلت کی۔

"یہ سب کچھ ایک نے دیا ہے؟" فرقان کچھ حیران ہوا۔

"ہاں۔"

"کس نے؟"

"رمشہ نے۔"

فرقان نے اپنے ہونٹ سکوڑے۔

"تم جانتے ہو یہ تمام گفٹس ایک ڈیڑھ لاکھ کی رینج میں ہوں گے۔" وہ اب دوبارہ ان چیزوں پر نظر ڈال رہا تھا۔"

صرف یہ گھڑی ہی پچاس ہزار کی ہے۔ کوئی صرف کولیگ سمجھ کر تو اتنی مہنگی چیزیں نہیں دے گا۔ تم لوگوں کے درمیان کوئی ... "فرقان بات کرتے کرتے رُک گیا۔

"ہم دونوں کے درمیان کچھ نہیں ہے۔ کم از کم میری طرف سے، مگر آج میں پہلی بار پریشان ہو گیا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ رمشہ .... مجھ میں کچھ ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔" سالار نے ان چیزوں پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھی بات ہے۔ چلو تم میں بھی کسی لڑکی نے دلچسپی لی۔" فرقان نے ان پیکٹس کو واپس سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ویسے بھی تم بہت کنوارے رہ لئے۔ لگے ہاتھوں اس سال یہ کام کر لو۔"

"جب مجھے شادی نہیں کرنی تو میں اس سلسلے کو آگے کیوں بڑھاؤں۔"

"سالار دن بہ دن تم بہت impractical کیوں ہوتے جا رہے ہو؟ تمہیں اب سیٹل ڈاؤن ہونے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہئے۔ ہر لڑکی سے کب تک اس طرح بھاگتے پھرو گے۔ تمہیں اپنی ایک فیملی شروع کر لینی چاہئے۔ رمشہ اچھی لڑکی ہے۔ میں اس کی فیملی کو جانتا ہوں۔ کچھ ماڈرن ضرور ہے مگر اچھی لڑکی ہے اور چلو اگر رمشہ نہیں تو پھر تم کسی اور کے ساتھ شادی کر لو۔ میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ تم اپنے پیرنٹس کی مدد لے سکتے ہو مگر اب تمہیں اس معاملے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہئے۔ تمہیں ان تمام باتوں کے بارے میں غور کرنا چاہئے اور کم از کم دوسرے کی بات کے جواب میں کچھ کہہ ضرور دینا چاہئے۔"

فرقان نے آخری جملے پر زور دیتے ہوئے کہا اس کا اشارہ اس کی خاموشی کی طرف تھا۔

"اس سے دوسرے کو یہ تسلی ہو جاتی ہے کہ وہ کسی مجمعے کے سامنے تقریر نہیں کر تا رہا۔" فرقان نے کہا۔

"تم کبھی اپنی شادی کے بارے میں سوچتے نہیں ہو؟"

"کون اپنی شادی کے بارے میں نہیں سوچتا؟" سالار نے مدھم آواز میں کہا۔ "میں بھی سوچتا ہوں مگر میں اس طرح نہیں سوچتا جس طرح تم سوچتے ہو۔ چائے پیو گے؟"

"آخری جملے کے بجائے تمہیں کہنا چاہئے تھا کہ بکواس بند کرو۔"

فرقان نے ناراضی سے کہا۔ سالار نے مسکرا کر کندھے اچکا دیئے وہ اب چیزیں سمیٹ رہا تھا۔

☆...☆...☆

رمشہ نے حیرانی سے اپنے سامنے پڑے ان پیکٹس کو دیکھا۔ "لیکن سالار! یہ سب چیزیں تمہارا برتھ ڈے گفٹ ہیں۔"

سالار آج صبح ایک ٹائی چھوڑ کر تمام چیزیں واپس اٹھا لایا تھا اور اب وہ رمشہ کے آفس میں تھا۔

"میں کسی سے اتنا مہنگا تحفہ نہیں لیا کرتا۔ ایک ٹائی کافی ہے۔"

"سالار، میں اپنے فرینڈز کو اتنے ہی مہنگے گفٹس دیتی ہوں۔" رمشہ نے وضاحت کی کوشش کی۔

"یقیناً تم دیتی ہو گی مگر میں نہیں لیتا .. اگر تم نے زیادہ اصرار کیا تو میں وہ ٹائی بھی لا کر واپس تمہیں دے دوں گا ...." سالار نے کہا اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے نکل آیا۔ رمشہ پھیکے چہرے کے ساتھ اسے کمرے سے نکلتا دیکھتی رہی۔

باب ۷

سالار اس دن ہمیشہ کی طرح ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ابھی اپنا لیکچر شروع نہیں کیا تھا جب ان کے پاس بیٹھے ایک ادھیڑ عمر آدمی نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! آدمی کو پیرِ کامل مل جائے تو اس کی تقدیر بدل جاتی ہے۔"

سالار نے گردن موڑ کر اس شخص کو دیکھا، وہ وہاں پچھلے چند دن سے آ رہا تھا۔

"اس کی نسلیں سنور جاتی ہیں۔ میں جب سے آپ کے پاس آنے لگا ہوں، مجھے لگتا ہے میں ہدایت پا گیا ہوں۔ میرے الٹے کام سیدھے ہونے لگے ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ مجھے پیرِ کامل مل گیا ہے۔ میں..... میں آپ کے ہاتھوں پر بیعت کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ بڑی عقیدت مندی سے ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ پکڑے ہوئے کہنے لگا۔ کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے نرمی سے اس شخص کے ہاتھ پر تھپکی دیتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"تقی صاحب! میں نے زندگی میں آج تک کسی سے بیعت نہیں لی۔ آپ کے منہ سے پیرِ کامل کا ذکر سنا پیرِ کامل کون ہوتا ہے..... پیرِ کامل کس کو کہتے ہیں .. وہ کیا کرتا ہے..... ؟ اس کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟"

وہ بڑی سنجیدگی سے اس شخص سے پوچھ رہے تھے۔

"آپ پیرِ کامل ہیں۔" اس شخص نے کہا۔

"نہیں، میں پیرِ کامل نہیں ہوں۔" ڈاکٹر سبط علی نے کہا۔

"آپ سے مجھے ہدایت ملتی ہے۔" اس شخص نے اصرار کیا۔

"ہدایت تو استاد بھی دیتا ہے، ماں باپ بھی دیتے ہیں، لیڈرز بھی دیتے ہیں، دوست احباب بھی دیتے ہیں، کیا وہ پیرِ کامل ہو جاتے ہیں؟"

"آپ ..... آپ گناہ نہیں کرتے۔" وہ آدمی گڑبڑا گیا۔

"ہاں، دانستہ طور پر نہیں کرتا، اس لئے نہیں کرتا، کیونکہ گناہ سے مجھے خوف آتا ہے۔ یہاں پر بیٹھے بہت سے لوگ دانستہ طور پر گناہ نہیں کرتے ہوں گے، کیونکہ میری طرح انہیں بھی گناہ سے خوف آتا ہو گا مگر نادانستگی میں مجھ سے کیا سرزد ہو جاتا ہے، اسے میں نہیں جانتا۔ ہو سکتا ہے نادانستگی میں مجھ سے بھی گناہ سرزد ہو جاتے ہوں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کی دعا قبول ہوتی ہے۔" وہ آدمی اپنے مؤقف سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

"دعا تو ماں باپ کی بھی قبول ہوتی ہے، مجبور اور مظلوم کی بھی قبول ہوتی ہے اور بھی بہت سے لوگوں کی قبول ہوتی ہے۔"

"لیکن آپ کی تو ہر دعا قبول ہو جاتی ہے۔" اس نے اصرار کیا۔

ڈاکٹر سبط علی صاحب نے انکار میں سر ہلایا۔

"نہیں، ہر دعا تو قبول نہیں ہوتی۔ میں کئی سالوں سے ہر روز مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی دعا کرتا ہوں، ابھی تک تو قبول نہیں ہوئی۔ ہر روز میری کی جانے والی کئی دعائیں قبول نہیں بھی ہوتیں۔"

"لیکن آپ کے پاس جو شخص دعا کروانے کے لئے آتا ہے، اس کے لئے آپ کی دعا ضرور قبول ہو جاتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

"آپ کے لئے کی جانے والی دعا قبول ہو گئی ہو گی، یہاں بہت سے ایسے ہیں جن کے لئے میری دعا قبول نہیں ہوتی یا نہیں ہوئیں۔"

وہ اب کچھ بول نہیں سکا۔

"آپ میں سے اگر کوئی بتا سکے کہ پیر کامل کون ہوتا ہے؟"

وہاں موجود لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے پھر ایک نے کہا۔

"پیر کامل نیک شخص ہوتا ہے، عبادت گزار شخص، پارسا آدمی۔"

ڈاکٹر سبط علی نے سر ہلایا۔

"بہت سے لوگ نیک ہوتے ہیں، عبادت گزار ہوتے ہیں، پارسا ہوتے ہیں۔ آپ کے ارد گرد ایسے بہت سارے لوگ ہوتے ہیں تو کیا وہ سب پیر کامل ہوتے ہیں؟"

"نہیں، پیر کامل وہ آدمی ہوتا ہے جو دکھاوے کے لئے عبادت نہیں کرتا۔ دل سے عبادت کرتا ہے، صرف اللہ کے لئے۔ اس کی نیکی اور پارسائی ڈھونگ نہیں ہوتی۔" ایک اور شخص نے اپنی رائے دی۔

"اپنے حلقہ احباب میں آپ میں سے ہر ایک کسی نہ کسی ایسے شخص کو ضرور جانتا ہوگا، جس کی عبادت کے بارے میں اسے یہ شبہ نہیں ہوتا کہ وہ ڈھونگ ہے، جس کی نیکی اور پارسائی کا بھی آپ کو یقین ہوتا ہے تو کیا وہ شخص پیر کامل ہے؟"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ایک اور شخص نے کہا۔

"پیر کامل ایک ایسا شخص ہوتا ہے، جس کے الفاظ میں تاثیر ہوتی ہے کہ وہ انسان کا دل بدل دیتے ہیں۔"

"تاثیر بھی بہت سے لوگوں کے الفاظ میں ہوتی ہے۔ کچھ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ میں، کچھ کے قلم سے نکلنے والے الفاظ میں، تاثیر تو اسٹیج پر کھڑے ایک کمپیئر اور اخبار کا کالم لکھنے والے ایک جرنلسٹ کے الفاظ میں بھی ہوتی ہے تو کیا وہ پیر کامل ہوتے ہیں؟"

ایک اور شخص بولا۔ "پیر کامل وہ ہوتا ہے جسے الہام اور وجدان ہو، جو مستقبل کو بوجھ سکے۔"

"ہم میں سے بہت سارے لوگ ایسے خواب دیکھتے ہیں جن میں مستقبل میں درپیش آنے والے حالات سے ہمیں آگہی ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ استخارہ بھی کرتے ہیں اور چیزوں کے بارے میں کسی حد تک جان جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے، وہ خطروں کو بھانپ جاتے ہیں۔"

"پیر کامل کون ہوتا ہے؟" ڈاکٹر صاحب کچھ دیر خاموش رہے، انہوں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"پیر کامل کون ہو سکتا ہے؟" سالار الجھن آمیز انداز میں ڈاکٹر سبط علی کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"کیا ڈاکٹر سبط علی کے علاوہ کوئی اور پیر کامل ہو سکتا تھا اور اگر وہ نہیں تھے تو پھر کون تھا اور کون ہو سکتا ہے؟"

وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے دل و دماغ میں ایک ہی گونج تھی۔ ڈاکٹر سبط علی ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہے تھے، پھر ان کے چہرے کی مسکراہٹ آہستہ آہستہ معدوم ہو گئی۔

"پیر کامل میں کاملیت ہوتی ہے۔ کاملیت ان تمام چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہے جو آپ کہہ رہے تھے۔ پیر کامل وہ شخص ہوتا ہے جو دل سے اللہ کی عبادت کرتا ہے، نیک اور پارسا ہوتا ہے۔ اس کی ہر دعا قبول ہوتی ہے۔ اس حد تک جس حد تک اللہ چاہے۔ اس کے الفاظ میں تاثیر بھی ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کو ہدایت بھی دیتا ہے مگر اسے الہام نہیں ہوتا، اسے وجدان ہوتا ہے۔ وحی اترتی ہے اس پر اور وحی کسی عام انسان پر نہیں اترتی۔ صرف پیغمبر پر اترتی ہے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کامل تھا مگر پیر کامل وہ ہے جس پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا جاتا ہے۔

ہر انسان کو زندگی میں کبھی نہ کبھی کسی پیر کامل کی ضرورت ضرور پڑتی ہے۔ کبھی نہ کبھی انسانی زندگی اس موڑ پر آکر ضرور کھڑی ہو جاتی ہے جب یہ لگتا ہے کہ ہمارے لبوں اور دل سے نکلنے والی دعائیں بے اثر ہو گئی ہیں۔ ہمارے سجدے اور ہمارے پھیلے ہوئے ہاتھ رحمتوں اور نعمتوں کو اپنی طرف موڑ نہیں پا رہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی تعلق تھا جو ٹوٹ گیا ہے پھر آدمی کا دل چاہتا ہے اب اس کے لئے کوئی اور ہاتھ اٹھائے، کسی اور کے لب اس کی دعا اللہ تک پہنچائیں، کوئی اور اللہ کے سامنے اس کے لئے گڑگڑائے۔ کوئی ایسا شخص جس کی دعائیں قبول ہوتی ہوں، جس کے لبوں سے نکلنے والی التجائیں اس کے اپنے لفظوں کی طرح واپس نہ موڑ دی جاتی ہوں پھر انسان پیر کامل کی تلاش شروع کرتا ہے، بھاگتا پھرتا ہے، دنیا میں کسی ایسے شخص کے لئے جو کاملیت کی کسی نہ کسی سیڑھی پر کھڑا ہو۔

پیر کامل کی یہ تلاش انسانی زندگی کے ارتقاء سے اب تک جاری ہے۔ یہ تلاش وہ خواہش ہے جو اللہ خود انسان کے دل میں پیدا کرتا ہے۔ انسان کے دل میں یہ خواہش، یہ تلاش نہ اتاری جاتی تو وہ پیغمبروں پر کبھی یقین نہ لاتا۔ کبھی ان کی پیروی اور اطاعت کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ پیر کامل کی یہ تلاش ہی انسان کو ہر زمانے میں اتارے جانے والے پیغمبروں کی طرف لے جاتی رہی پھر پیغمبروں کی مبعوثیت کا یہ سلسلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ختم کر دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی اور پیر کامل کی گنجائش نہیں رکھی گئی۔

کون ہے جسے اب یا آئندہ آنے والے زمانے میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر کوئی مقام دیا جائے؟

کون ہے جسے آج یا آئندہ آنے والے زمانے میں کسی شخص کے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کاملیت دے دی جائے؟

کون ہے جو آج یا آئندہ آنے والے زمانے میں کسی شخص کے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر شفاعت کا دعویٰ کر سکے؟

جامد اور مستقل خاموشی کی صورت میں آنے والا نفی میں یہ جواب ہم سے صرف ایک سوال

کرتا ہے۔

پیرِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھوڑ کر ہم دنیا میں اور کس وجود کو کھوجنے نکل کھڑے ہوئے ہیں؟ پیرِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیعت شدہ ہوتے ہوئے ہمیں دوسرے کس شخص کی بیعت کی ضرورت رہ گئی ہے؟

پیرِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے پر چلنے کے بجائے ہمیں دوسرا کون سا راستہ اپنی طرف کھینچ رہا ہے؟

کیا مسلمانوں کے لئے ایک اللہ، ایک قرآن، ایک رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی سنت کافی نہیں؟

اللہ اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کی کتاب کے علاوہ اور کون سا شخص کون سا کلام ہے جو ہمیں دنیا اور آخرت کی تکلیفوں سے بچا سکے گا؟

جو ہماری دعاؤں کو قبولیت بخشے، جو ہم پر نعمتیں اور رحمتیں نازل کر سکے؟

کوئی پیرِ کامل کا فرقہ بتا سکتا ہے؟ نہیں بتا سکتا۔"

ڈاکٹر سبط علی کہہ رہے تھے۔

"وہ صرف مسلمان تھے، وہ مسلمان جو یہ یقین رکھتے تھے کہ اگر وہ صراطِ مستقیم پر چلیں گے تو وہ جنت میں جائیں گے، اس راستے سے ہٹیں گے تو اللہ کے عذاب کا نشانہ بنیں گے۔

اور صراطِ مستقیم وہ راستہ ہے جو اللہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے قرآن پاک میں بتاتا ہے۔ صاف، دو ٹوک اور واضح الفاظ میں۔ وہ کام کریں جس کا حکم اللہ اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے دیتا ہے اور اس کام سے رُک جائیں جس سے منع کیا جاتا ہے۔

اللہ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کسی بات میں کوئی ابہام نہیں رکھتے۔ قرآن کو کھولئے، اگر اس میں کہیں دو ٹوک اور غیر مبہم الفاظ میں کسی دوسرے پیرِ کامل یا پیغمبر کا ذکر ملے تو اس کی تلاش کرتے رہیے اور اگر ایسا کچھ نظر نہیں آتا تو پھر صرف خوف کھائیے کہ آپ اپنے پیروں کو کس دلدل میں لئے جا رہے ہیں۔ اپنی پچاس ساٹھ سالہ زندگی کو کس طرح اپنی ابدی زندگی کی تباہی کے لئے استعمال کر رہے ہیں کس طرح خسارے کا سودا کر رہے ہیں۔ ہدایت کی تلاش ہے، قرآن کھولئے۔ کیا ہے جو وہ آپ کو نہیں بتا دیتا۔ وہ آپ کو معصوم، انجان اور بے خبر نہیں رہنے دیتا۔ آپ کا اصل آپ کے منہ پر دے مارتا ہے۔ کیا اللہ انسان کو نہیں جانتا ہوگا؟ اس مخلوق کو، جو اس کی اربوں کھربوں تخلیقات میں سے ایک ہے۔

دعا قبول نہیں ہوتی تو آسرے اور وسیلے تلاش کرنے کے بجائے صرف ہاتھ اٹھا لیجئے، اللہ سے

خود مانگیں۔ دے دے تو شکر کریں، نہ دے تو صبر...... مگر ہاتھ آپ خود ہی اٹھائیں۔

زندگی کا قرینہ اور سلیقہ نہیں آ رہا تو اسوۂ حسنہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف چلے جائیں، سب کچھ مل جائے گا آپ کو۔

احترام ہر ایک کا کریں۔ ہر ولی کا، ہر مومن کا، ہر بزرگ کا، ہر شہید کا، ہر صالح کا، ہر پارسا کا ....

مگر اپنی زندگیوں میں ہدایت اور رہنمائی صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لیں کیونکہ انہوں نے آپ تک اپنے ذاتی احکامات نہیں پہنچائے جو کچھ بتایا ہے وہ اللہ کا نازل کردہ ہے۔

ڈاکٹر سید سبط علی کون ہے، کیا ہے، کون جانتا ہے اسے؟ آپ .. ؟ آپ کے علاوہ چند سو لوگ ... چند ہزار لوگ مگر جس پیرِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کر رہا ہوں انہیں تو ایک ارب کے قریب لوگ اپنا روحانی پیشوا مانتے ہیں۔ میں تو وہی کچھ کہتا، دہراتا پھر رہا ہوں، جو چودہ سو سال پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما چکے ہیں۔ کیا نئی بات کہی میں نے؟"

ڈاکٹر سبط علی خاموش ہو گئے تھے۔ کمرے میں موجود ہر شخص پہلے ہی خاموش تھا۔ انہوں نے وہاں بیٹھے ہر شخص کو جیسے آئینہ دکھا دیا تھا اور آئینے میں نظر آنے والا عکس کسی کو ہلا رہا تھا، کسی کو لرزا رہا تھا۔

وہاں سے باہر آکر سالار بہت دیر تک اپنی گاڑی کی سیٹ پر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھوں پر بندھی آخری پٹی بھی آج کھول دی گئی تھی۔

کئی سال پہلے جب امامہ ہاشم سوچے سمجھے بغیر گھر سے نکل پڑی تھی تو وہ اس لڑکی کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ اس کے نزدیک وہ حماقت تھی۔ بعد میں اس نے اپنے خیالات میں ترمیم کر لی تھی۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ کوئی بھی واقعی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اس حد تک گرفتار ہو سکتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ دے۔

اس نے اسلام کے بارے میں جاننا شروع کیا تو اسے پتا چلا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی اسی طرح کی قربانیاں دیا کرتے تھے۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک ان گنت لوگ تھے اور ہر زمانے میں تھے اور سالار سکندر نے اقرار کر لیا تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اتنی طاقت تھی کہ وہ کسی کو بھی کچھ بھی چھوڑنے پر مجبور کر دیتی۔ اس نے کبھی اس محبت کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ آج وہاں بیٹھا پہلی بار یہ کام کر رہا تھا۔

یہ صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نہیں تھی، جس نے امامہ ہاشم کو گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ صراطِ مستقیم کو دیکھ کر اس طرف چلی گئی تھی۔ اس صراطِ مستقیم کی طرف جسے وہ کسی زمانے میں اندھوں کی طرح ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ وہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اسی صراطِ مستقیم کی طرف جاتے تھے۔

امامہ ہاشم نے کئی سال پہلے پیرِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پا لیا تھا۔ وہ بے خوفی اسی ہدایت اور رہنمائی کی عطا کردہ تھی جو اسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے ملی تھی۔ وہ آج تک

پیرِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خود شناخت نہیں کر پایا تھا اور امامہ ہاشم نے ہر کام خود کیا تھا۔ شناخت سے اطاعت تک اس کو سالار سکندر کی طرح دوسروں کے کندھوں کی ضرورت نہیں پڑی۔

سالار سکندر نے پچھلے آٹھ سالوں میں امامہ ہاشم کے لئے ہر جذبہ محسوس کیا تھا۔ حقارت، تضحیک، پچھتاوا، نفرت، محبت، سب کچھ مگر آج وہاں بیٹھے پہلی بار اسے امامہ ہاشم سے حسد ہو رہا تھا۔ تھی کیا وہ؟ ایک عورت ذرا سی عورت .... آسمان کی حور نہیں تھی سالار سکندر جیسے آدمی کے سامنے کیا اوقات تھی اس کی۔

کیا میرے جیسا آئی کیو تھا اس کا؟

کیا میرے جیسی کامیابیاں تھیں اس کی؟

کیا میرے جیسا کام کر سکتی تھی وہ؟

کیا میرے جیسا نام کما سکتی تھی؟

کچھ بھی نہیں تھی وہ اور اس کو سب کچھ پلیٹ میں رکھ کر دے دیا اور میں.... میں جس کا آئی کیو لیول ۱۵۰+ ہے مجھے سامنے کی چیزیں دیکھنے کے قابل نہیں رکھا؟

وہ اب آنکھوں میں نمی لئے اندھیرے میں ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔

"مجھے بس اس قابل کر دیا کہ میں باہر نکلوں اور دنیا فتح کر لوں۔ وہ دنیا جس کی کوئی وقعت ہی نہیں ہے اور وہ وہ"

وہ رک گیا۔ اسے امامہ پر غصہ آ رہا تھا۔ آٹھ سال پہلے کا وقت ہوتا تو وہ اسے "نچ" کہتا، تب امامہ پر غصہ آنے پر وہ اسے یہی کہا کرتا تھا مگر آٹھ سال کے بعد آج وہ زبان پر اس کے لئے گالی نہیں لا سکتا تھا۔ وہ امامہ ہاشم کے لئے کوئی برا لفظ نکالنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ صراطِ مستقیم پر خود سے بہت آگے کھڑی اس عورت کے لئے کون زبان سے برا لفظ نکال سکتا تھا؟

اپنے گلاسز اتار کر اس نے اپنی آنکھیں مسلیں۔ اس کے انداز میں شکست خوردگی تھی۔

"پیرِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ صراطِ مستقیم۔" آٹھ سال لگے تھے، مگر تلاش ختم ہو گئی تھی۔ جواب مل چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ دونوں ایک ریسٹورانٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رمشہ آج خاص طور پر تیار ہو کر آئی تھی۔ وہ خوش تھی اور کوئی بھی اس کے چہرے سے اس کی خوشی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ سالار بھی۔

ویٹر سے مینو کارڈ لے کر سالار نے بند کر کے ٹیبل پر رکھ دیا۔ رمشہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ اپنا کارڈ کھولے ہوئے تھی۔

"لنچ میری طرف سے ہے مگر مینو آپ طے کریں۔" سالار نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"او کے۔" رمشہ بے اختیار مسکرائی پھر وہ مینو کارڈ پر نظر دوڑانے لگی اور سالار قرب و جوار میں۔

رمشہ نے ویٹر کو کچھ ڈشز نوٹ کروائیں۔ جب ویٹر چلا گیا تو اس نے سالار سے کہا۔

"تمہاری طرف سے لنچ کی یہ دعوت بڑا اچھا سرپرائز ہے میرے لئے۔ پہلے تو کبھی تم نے ایسی کوئی دعوت نہیں دی؟ بلکہ میری دعوت بھی رد کرتے رہے۔"

"ہاں لیکن اب ہم دونوں کے لئے کچھ باتیں کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ مجھے اسی لئے تمہیں یہاں بلانا پڑا۔" سالار نے کہا۔

رمشہ نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"کچھ باتیں؟ کون سی باتیں؟"

"پہلے لنچ کر لیں، اس کے بعد کریں گے۔" سالار نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

"مگر لنچ آنے اور کھانے میں کافی وقت لگے گا۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم وہ باتیں ابھی کر لیں؟" رمشہ نے قدرے بے تابی سے کہا۔

"نہیں، یہ بہتر نہیں ہے۔ لنچ کے بعد۔" سالار نے مسکراتے ہوئے مگر حتمی انداز میں کہا۔

رمشہ نے اس بار اصرار نہیں کیا۔ وہ دونوں ہلکی پھلکی گفتگو کرنے لگے پھر لنچ آ گیا اور وہ دونوں لنچ میں مصروف ہو گئے۔

لنچ سے فارغ ہونے میں تقریباً پون گھنٹہ لگا، پھر سالار نے ویٹر سے کافی منگوائی۔

"میرا خیال ہے، اب بات شروع کرنی چاہئے۔"

رمشہ نے کافی کا پیالا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ سالار اب بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنی کافی میں چمچ ہلا رہا تھا۔ رمشہ کی بات پر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں تم سے اس کارڈ کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں، جو تم نے دو دن پہلے مجھے بھیجا ہے۔"

رمشہ کا چہرہ قدرے سرخ ہو گیا۔

دو دن پہلے جب وہ شام کو اپنے فلیٹ پر پہنچا تو وہاں ایک کارڈ اور بکے اس کا منتظر تھا۔ وہ ایک ہفتہ بانگ کانگ میں بینک کے کسی کام کے لئے رہا تھا اور اسی شام واپس آیا تھا۔ کارڈ رمشہ کا بھیجا ہوا تھا۔

"تمہیں دوبارہ دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی اس کا اظہار ناممکن ہے۔"

سالار کارڈ پر لکھے پیغام کو پڑھ کر چند لمحوں کے لئے ساکت رہ گیا۔ اس کے بدترین خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔ رمشہ اس کے لئے اپنے احساسات کا اظہار کر رہی تھی۔

سالار نے اگلے دو دن اس کارڈ کے بارے میں رمشہ سے کوئی تذکرہ نہیں کیا لیکن اس نے ویک

اینڈ پراسٹ لنچ کی دعوت دے ڈالی۔ رمشہ کے ساتھ اب ان تمام باتوں کو کلیئر کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

"تمہیں کارڈ برا لگا؟" رمشہ نے کہا۔

"نہیں، پیغام۔"

رمشہ کچھ شرمندہ ہو گئی۔

"آئی ایم سوری، مگر میں صرف...... سالار! میں تمہیں بتانا چاہ رہی تھی کہ میں نے تمہیں کتنا مس کیا۔"

سالار نے کافی کا ایک گھونٹ لیا۔

"تم مجھے اچھے لگتے ہو، میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

رمشہ نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔

"ہو سکتا ہے یہ پرپوزل تمہیں عجیب لگے لیکن میں بہت عرصے سے اس سلسلے میں تم سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ میں تم سے فلرٹ نہیں کر رہی ہوں جو کچھ کارڈ میں میں نے لکھا ہے میں واقعی تمہارے لئے وہی جذبات رکھتی ہوں۔"

سالار نے اسے بات مکمل کرنے دی۔ اب وہ کافی کا کپ نیچے رکھ چکا تھا۔

"لیکن میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔" جب وہ خاموش ہو گئی تو اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"کیوں؟"

"کیا اس سوال کا جواب ضروری ہے؟" سالار نے کہا۔

"نہیں، ضروری نہیں ہے مگر بتانے میں کیا حرج ہے۔"

"تم مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتی ہو؟" سالار نے جواباً پوچھا۔

"کیونکہ تم مختلف ہو۔"

سالار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"عام مردوں جیسے نہیں ہو، وقار ہے تم میں، کلچرڈ اور گروئمڈ ہو۔"

"میں ایسا نہیں ہوں۔"

"ثابت کرو۔" رمشہ نے اسے جیسے چیلنج کیا۔

"کر سکتا ہوں مگر نہیں کروں گا۔" اس نے کافی کا کپ دوبارہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہر مرد سالار سکندر سے بہتر ہے۔"

"کس لحاظ سے؟"

"ہر لحاظ سے۔"

"میں نہیں مانتی۔"

"تمہارے نہ ماننے سے حقیقت نہیں بدلے گی۔"

"میں تمہیں جانتی ہوں، ڈیڑھ سال سے تمہارے ساتھ کام کر رہی ہوں۔"

"مردوں کے بارے میں اتنی جلدی کسی رائے پر پہنچنا مناسب نہیں ہوتا۔"

"تمہاری کوئی بات تمہارے بارے میں میری رائے کو تبدیل نہیں کر سکتی۔" رمشہ اب بھی اپنی بات پر قائم تھی۔

"تم جس فیملی سے تعلق رکھتی ہو، جس سوسائٹی میں موو کرتی ہو، وہاں تمہیں مجھ سے زیادہ اچھے مرد مل سکتے ہیں۔"

"تم مجھ سے صرف اپنی بات کرو۔"

"رمشہ! میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔"

اس نے بالآخر کہہ دیا۔ اس ساری گفتگو میں پہلی بار رمشہ کی رنگت زرد پڑی۔

"تم نے ... تم نے کبھی... کبھی نہیں بتایا۔"

سالار آہستہ سے مسکرایا۔ "ہمارے درمیان اتنی بے تکلفی تو کبھی بھی نہیں رہی۔"

"تم اس سے شادی کر رہے ہو؟"

دونوں کے درمیان اس بار خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔

"ہو سکتا ہے کچھ مشکلات کی وجہ سے میری وہاں شادی نہ ہو سکے۔" سالار نے کہا۔

"میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکی۔ تم کسی سے محبت کر رہے ہو، یہ جانتے ہوئے کہ وہاں تمہاری شادی نہیں ہو سکتی؟"

"کچھ ایسا ہی ہے۔"

"سالار! تم... تم اتنے جذباتی تو نہیں ہو۔ ایک پریکٹیکل آدمی ہو کر تم کس طرح کی عجیب بات کر رہے ہو۔"

رمشہ استہزائیہ انداز میں ہنس دی۔

"فرض کیا کہ وہاں تمہاری شادی نہیں ہوئی تو پھر   پھر کیا تم کبھی شادی نہیں کرو گے؟"

"نہیں۔"

رمشہ نے نفی میں سر ہلایا۔ I can't believe it (مجھے یقین نہیں آ رہا)۔

"مگر ایسا ہی ہے، میں نے اگر کبھی شادی کا سوچا بھی تو دس پندرہ سال بعد ہی سوچوں گا اور دس پندرہ سال تک ضروری نہیں کہ میں زندہ رہوں۔"

اس نے بے حد خشک لہجے میں کہتے ہوئے ویٹر کو ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔

"میں چاہتا ہوں رمشہ! کہ آج کی اس گفتگو کے بعد ہم دونوں کے درمیان دوبارہ ایسا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو۔ ہم اچھے کولیگ ہیں۔ میں چاہتا ہوں یہ تعلق ایسے ہی رہے۔ میرے لئے اپنا وقت ضائع مت کرو، میں وہ نہیں ہوں، جو تم مجھے سمجھ رہی ہو۔"

ویٹر قریب آ گیا تھا۔ سالار اس کا لایا ہوا بل ادا کرنے لگا۔

رمشہ، سالار کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ اب کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

سالار اس روز کسی کام سے لنچ بریک کے بعد آفس سے نکل آیا۔ ریلوے کراسنگ پر ٹریفک کا اژدحام دیکھ کر اس نے دور سے ہی گاڑی موڑ لی۔ وہ اس وقت کسی ٹریفک جام میں پھنس کر وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔

گاڑی کو پیچھے موڑ کر اس نے ایک دوسری سڑک پر ٹرن لے لیا۔ وہ اس سڑک پر تھوڑا ہی آگے گیا تھا جب اس نے سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر ایک بوڑھی خاتون کو بیٹھے دیکھا۔ وہ ایک بائی روڈ تھی اور اس وقت بالکل سنسان تھی۔ خاتون اپنے لباس اور چہرے سے کسی بہت اچھے گھرانے کی نظر آ رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں سونے کی کچھ چوڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں اور سالار کو خدشہ ہوا کہ اس اکیلی سڑک پر وہ کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس نے گاڑی ان کے قریب لے جا کر روک دی۔ خاتون کی سفید رنگت اس وقت سرخ تھی اور سانس پھولا ہوا تھا اور شاید وہ اپنا سانس ٹھیک کرنے کے لئے ہی سڑک کے کنارے بیٹھی تھیں۔

"السلام علیکم اماں! کیا مسئلہ ہے، آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟"

سالار نے اپنے سن گلاسز اتارتے ہوئے کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔

"بیٹا! مجھے رکشہ نہیں مل رہا۔"

سالار ان کی بات پر حیران ہوا۔ وہ مین روڈ نہیں تھی۔ ایک رہائشی علاقے کی بائی روڈ تھی اور وہاں رکشہ ملنے کا امکان نہیں تھا۔

"اماں جی! یہاں سے تو آپ کو رکشہ مل بھی نہیں سکتا۔ آپ کو جانا کہاں ہے؟"

اس خاتون نے اسے اندرون شہر کے ایک علاقے کا نام بتایا۔ سالار کے لئے بالکل ممکن نہیں تھا کہ وہ انہیں وہاں چھوڑ آتا۔

"آپ میرے ساتھ آ جائیں۔ میں آپ کو مین روڈ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ وہاں سے آپ کو رکشہ مل جائے گا۔"

سالار نے پچھلے دروازے کا لاک کھولا اور پھر اپنی سیٹ سے اتر گیا مگر اماں جی اسے خاصی متامل نظر آئیں۔ وہ ان کے اندیشوں کو بھانپ گیا۔

"اماں جی! ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں شریف آدمی ہوں۔ آپ کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں صرف آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ اس سڑک سے تو آپ کو رکشہ ملے گا نہیں اور اس وقت سڑک سنسان ہے، آپ نے زیور پہنا ہوا ہے، کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے آپ کو۔"

سالار نے نرمی سے ان کے اندیشے دور کرنے کی کوشش کی۔ خاتون نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے اپنی چوڑیوں کو دیکھا اور پھر سالار سے کہا۔

"او ... یہ سارا زیور تو نقلی ہے۔"

"چنیں، یہ تو بہت اچھی بات ہے مگر کوئی بھی غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے۔ کوئی آپ سے یہ تھوڑی پوچھے گا کہ یہ زیور اصلی ہے یا نقلی۔"

سالار نے ان کے جھوٹ کا پردہ رکھتے ہوئے کہا۔

وہ اب سوچ میں پڑ گئیں۔ سالار کو دیر ہو رہی تھی۔

"ٹھیک ہے اماں جی! آپ اگر مناسب نہیں ...."

اس نے واپس اپنی گاڑی کی طرف قدم بڑھائے تو اماں جی فوراً بول اٹھیں۔

"نہیں، نہیں۔ میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔ پہلے ہی ٹانگیں ٹوٹ رہی ہیں چل چل کے۔"

وہ ٹانگوں پر زور دیتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

سالار نے ان کا بازو پکڑ کر انہیں اٹھایا۔ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر انہیں اندر بٹھا دیا۔ بائی روڈ کو تیزی سے کراس کر کے وہ مین روڈ پر آ گیا۔ اب وہ کسی خالی رکشہ کی تلاش میں تھا مگر اسے رکشہ نظر نہیں آیا۔ وہ آہستہ آہستہ گاڑی چلاتے ہوئے کسی خالی رکشے کی تلاش میں ٹریفک پر نظریں دوڑانے لگا۔

"نام کیا ہے بیٹا تمہارا؟" انہوں نے پوچھا۔

"سالار۔"

"سالار؟" انہوں نے جیسے تصدیق چاہی۔ وہ بے اختیار مسکرایا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنے نام کو بگڑتے سنا تھا۔ تصحیح کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ پنجابی خاتون تھیں اور اس سے بمشکل اردو میں بات کر رہی تھیں۔

"جی۔" سالار نے تصدیق کی۔

"یہ کیا نام ہوا، مطلب کیا ہے اس کا؟" انہوں نے یک دم دلچسپی لی۔

سالار نے انہیں اپنے نام کا مطلب اس بار پنجابی میں سمجھایا۔ اماں جی کو اس کے پنجابی بولنے پر خاصی خوشی ہوئی اور اب وہ پنجابی میں گفتگو کرنے لگیں۔

سالار کے نام کا مطلب پوچھنے کے بعد انہوں نے کہا۔

"میری بڑی بہو کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔"

وہ حیران ہوا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ نام کا مطلب جاننے کے بعد ان کا اگلا جملہ یہ ہوگا۔

"جی... مبارک ہو۔" فوری طور پر اسے یہی سوجھا۔

"خیر مبارک۔"

انہوں نے خاصی مسرت سے اس کی مبارکباد وصول کی۔

"میری بہو کا فون آیا تھا، پوچھ رہی تھی کہ امی! آپ نام بتائیں۔ میں تمہارا نام دے دوں؟"

اس نے بیک ویو مرر سے کچھ حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

"دے دیں۔"

"چلو یہ مسئلہ تو حل ہوا۔"

اماں جی اب اطمینان سے عینک اُتار کر اپنی بڑی سی چادر کے پلو سے اس کے شیشے صاف کرنے لگیں۔ سالار کو ابھی تک کوئی رکشہ نظر نہیں آیا تھا۔

"عمر کتنی ہے تمہاری؟" انہوں نے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں سے توڑا تھا۔

"تیس سال۔"

"شادی شدہ ہو؟"

سالار سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ہاں کہنا چاہتا تھا مگر اس کا خیال تھا کہ ہاں کی صورت میں سوالات کا سلسلہ مزید دراز ہو جائے گا اس لئے بہتر یہی تھا کہ انکار کر دے اور اس کا یہ اندازہ اس دن کی سب سے فاش غلطی ثابت ہوا۔

"نہیں۔"

"شادی کیوں نہیں کی؟"

"بس ایسے ہی۔ خیال نہیں آیا۔" اس نے جھوٹ بولا۔

"اچھا۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ سالار دعائیں کرتا رہا کہ اسے رکشہ جلدی مل جائے۔ اسے دیر ہو رہی تھی۔

"کیا کرتے ہو تم؟"

"میں بینک میں کام کرتا ہوں۔"

"کیا کام کرتے ہو؟"

سالار نے اپنا عہدہ بتایا۔ اسے اندازہ تھا کہ اماں جی کے سر کے اوپر سے گزرے گا مگر وہ اس وقت ہکا بکا رہ گیا جب انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"یہ افسر ہوتا ہے نا؟"

وہ بے اختیار ہنسا۔ اس سے زیادہ اچھی وضاحت کوئی اس کے کام کی نہیں دے سکتا تھا۔

"جی اماں جی! "افسر" ہوتا ہے۔" وہ محظوظ ہوا۔

"کتنا پڑھے ہو تم؟"

"سولہ جماعتیں۔"

اس بار سالار نے اماں جی کا فارمولا استعمال کرتے ہوئے اپنی تعلیم کو آسان لفظوں میں پیش کیا۔

اماں جی کا جواب اس بار بھی حیران کن تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی سولہ جماعتیں ؟ ایم بی اے کیا ہے یا ایم اے اکنامکس؟"

سالار نے بے اختیار پلٹ کر اماں جی کو دیکھا۔ وہ اپنی عینک کے شیشوں سے اسے گھور رہی تھیں۔

"اماں جی! آپ کو پتا ہے ایم بی اے کیا ہوتا ہے یا ایم اے اکنامکس کیا ہوتا ہے؟" وہ واقعی حیران تھا۔

"لو مجھے نہیں پتا ہوگا؟ میرے بڑے بیٹے نے پہلے ایم اے اکنامکس کیا ادھر پاکستان سے پھر انگلینڈ جا کر اس نے ایم بی اے کیا۔ وہ بھی بینک میں ہی کام کرتا ہے مگر ادھر انگلینڈ میں۔ اسی کا تو بیٹا ہوا ہے۔"

سالار نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے گردن واپس موڑ لی۔

"تو پھر تم نے بتایا نہیں؟"

"کیا؟"

سالار کو فوری طور پر یاد نہیں آیا کہ انہوں نے کیا پوچھا تھا۔

"اپنی تعلیم کے بارے میں؟"

"میں نے ایم بی اے کیا ہے۔"

"کہاں سے؟"

"امریکہ سے۔"

"اچھا ماں باپ ہیں تمہارے؟"

"جی۔"

"کتنے بہن بھائی ہیں؟" سوالات کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا تھا۔

"پانچ۔" سالار کو کوئی جائے فرار نظر نہیں آ رہی تھی۔

"کتنی بہنیں اور کتنے بھائی؟"

"ایک بہن اور چار بھائی۔"

"شادیاں کتنوں کی ہوئی ہیں؟"

"میرے علاوہ سب کی۔"

"تم سب سے چھوٹے ہو؟"

"نہیں، چوتھے نمبر پر ہوں۔ ایک بھائی چھوٹا ہے۔"

سالار کو اب پہلی بار اپنے "سوشل ورک" پر پچھتاوا ہونے لگا۔

"اس کی بھی شادی ہو گئی؟"

"جی۔"

"تو پھر تم نے شادی کیوں نہیں کی؟ کوئی محبت کا چکر تو نہیں ہے؟"

اس بار سالار کے پیروں کے نیچے سے حقیقت میں زمین کھسک گئی۔ وہ ان کی قیافہ شناسی کا قائل ہونے لگا۔

"اماں جی! رکشہ نہیں مل رہا۔ آپ مجھے ایڈریس بتا دیں، میں آپ کو خود چھوڑ آتا ہوں۔"

سالار نے ان کے سوال کا جواب گول کر دیا۔

دیر تو اسے پہلے ہی ہو چکی تھی اور رکشے کا ابھی بھی کہیں نام و نشان نہیں تھا اور وہ اس بوڑھی خاتون کو کہیں سڑک پر بھی کھڑا نہیں کر سکتا تھا۔

اماں جی نے اسے پتا بتایا۔

سالار کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک چوک میں کھڑے ٹریفک کانسٹیبل کو اس نے دوبارہ دوبارہ کر مدد کرنے کے لئے کہا۔ کانسٹیبل نے اسے علاقے کا راستہ سمجھایا۔

سالار نے دوبارہ گاڑی چلانا شروع کی۔

"تو پھر تم نے مجھے بتایا نہیں کہ کہیں محبت کا چکر تو نہیں تھا؟"

سالار کا دل چاہا وہ کہیں ڈوب کر مر جائے۔ وہ خاتون ابھی تک اپنا سوال نہیں بھولی تھیں جبکہ وہ صرف اس سوال کے جواب سے بچنے کے لئے انہیں گھر چھوڑنے پر تیار ہوا تھا۔

"نہیں اماں جی! ایسی کوئی بات نہیں۔"

اس بار اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"الحمد للہ۔" وہ اماں جی کی اس "الحمد للہ" کا سیاق و سباق سمجھ نہیں پایا اور اس نے اس کا تردد بھی نہیں کیا۔

اماں جی اب اس کے ماں باپ کے بارے میں کرید کرید کر معلومات حاصل کرنے کی کوشش فرما رہی تھیں۔ سالار واقعی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

سب سے بڑی گڑبڑ اس وقت ہوئی جب وہ اماں جی کے بتائے ہوئے علاقے میں پہنچا اور اس نے اماں جی سے مطلوبہ گلی کی طرف رہنمائی کرنے کی درخواست فرمائی اور اماں جی نے کمال اطمینان سے کہا۔

"اب یہ تو مجھے پتہ ہے کہ اس علاقے میں گھر ہے مگر پتہ مجھے معلوم نہیں۔"

وہ بھونچکا رہ گیا۔

"اماں جی! تو گھر کیسے پہنچاؤں میں آپ کو۔ پتے کے بغیر اس علاقے میں آپ کو کہاں ڈراپ کروں؟"

وہ اپنے گھر پر لکھا نمبر اور نام بتانے لگیں۔

"نہیں اماں جی! آپ مجھے گلی کا نام بتائیں۔"

وہ گلی کے نام کی بجائے نشانیاں بتانے لگیں۔

"حلوائی کی ایک دکان ہے گلی کے کونے میں..... بہت کھلی گلی ہے۔ .. پرویز صاحب کا گھر بھی وہیں ہے، جن کے بیٹے نے جرمنی میں شادی کی ہے پچھلے ہفتے ..... پہلی بیوی اس کی ادھر ہی ہے ہمارے محلے میں شادی کی اطلاع ملنے پر بے چاری نے رو رو کر محلہ سر پر اٹھا لیا۔"

وہ نشانیاں بتاتے بتاتے کہیں اور نکل گئیں۔

سالار نے سڑک کے کنارے گاڑی کھڑی کر دی۔

"اماں جی! آپ کے شوہر کا کیا نام ہے؟ گھر کے بارے میں اور گلی کے بارے میں کچھ تفصیل سے بتائیں، اس طرح تو میں کبھی بھی آپ کو گھر نہیں پہنچا سکوں گا۔"

اس نے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"میں سعید اماں کے نام سے جانی جاتی ہوں۔ میاں بے چارے تو دس سال پہلے فوت ہو گئے۔ ان کو تو لوگ بھول بھال گئے اور گلی کا میں تمہیں بتا رہی ہوں، بہت بڑی گلی ہے۔ تین دن پہلے گٹر کے دو ڈھکن لگا کر گئے ہیں، بالکل نئے۔ سیمنٹ سے جوڑ کر گئے ہیں۔ ہر ماہ کوئی نہ کوئی اُتار کر لے جاتا تھا، اب بے فکری ہو گئی ہے۔"

سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔

"اماں جی! کیا میں یہ کہہ کر لوگوں سے آپ کی گلی کا پوچھوں کہ گٹر کے دو نئے ڈھکنوں والی گلی آپ وہاں کے کسی ایسے شخص کا نام بتائیں جسے لوگ جانتے ہوں جو قدرے معروف ہو۔"

"وہ مرتضیٰ صاحب ہیں جن کے بیٹے مظفر کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی کل صبح۔"

"اماں جی! یہ کوئی تعارف نہیں ہوتا۔"

وہ اس کی بات پر برا مان گئیں۔

"لو بھلا، اب کیا ہر گھر میں ٹانگ ٹوٹتی ہے کسی نہ کسی کی۔"

سالار چپ چاپ گاڑی سے اُتر گیا۔ آس پاس کی دکانوں سے اس نے سعیدہ اماں کے بتائے ہوئے "کوائف" کے مطابق گھر کی تلاش کرنا شروع کی، مگر جلد ہی اسے پتہ چل گیا کہ ان نشانیوں کے ساتھ وہ کم از کم آج کی تاریخ میں گھر نہیں ڈھونڈ سکتا۔

وہ مایوس ہو کر واپس لوٹا۔

"اماں جی! گھر میں فون ہے آپ کے؟" گاڑی کے اندر گھستے ہی اس نے پوچھا۔

"ہاں ہے۔"

سالار نے سکون کا سانس لیا۔

"اس کا نمبر بتائیں مجھے۔" سالار نے اپنا موبائل نکالتے ہوئے کہا۔

"نمبر کا تو مجھے نہیں پتا۔"

وہ ایک بار پھر دھک سے رہ گیا۔

"فون نمبر بھی نہیں پتا؟" اس نے شدید صدمے کے عالم میں کہا۔

"بیٹا! میں نے کون سا کبھی فون کیا ہے۔ میرے بیٹے خود کر لیتے ہیں، رشتے دار بھی خود کر لیتے ہیں یا ضرورت ہو تو بیٹی فون ملا دیتی ہے۔"

"ادھر ماڈل ٹاؤن میں کس کے پاس گئی تھیں؟"

سالار کو یک دم خیال آیا۔

"ادھر کچھ رشتے دار ہیں میرے۔ پوتے کی مٹھائی دینے گئی تھی۔"

انہوں نے فخریہ بتایا۔

سالار نے سکون کا سانس لیتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"ٹھیک ہے، اُدھر ہی چلتے ہیں۔ وہاں کا پتہ بتائیں۔"

"پتہ تو مجھے نہیں پتا۔"

سالار اس بار صدمے سے کچھ دیر کے لئے بول بھی نہ سکا۔

"تو پھر گئی کیسے تھیں آپ؟"

"بیٹا! اصل میں جہاں جانا ہو ہمسائے کے بچے چھوڑ آتے ہیں، ان ہی کو گھر کا پتہ ہے۔ پچھلے دس سال سے مجھے وہی لے کر جا رہے ہیں۔ وہ چھوڑ آتے ہیں اور پھر وہاں سے بلال وغیرہ واپس چھوڑ جاتے

ہیں۔ اصل میں یہ بلال وغیرہ بھی پہلے میرے محلے میں ہی رہتے تھے۔ یہی کوئی دس بارہ سال پہلے اُدھر گئے ہیں اس لئے میرے پورے محلے کو ان کے گھر کا پتہ ہے۔"

سالار نے کچھ نہیں کہا۔ اسے اب بھی اُمید تھی کہ جہاں سے اس نے ان خاتون کو پک کیا ہے بلال وغیرہ کا گھر وہیں کہیں ہوگا۔

سعیدہ اماں کی گفتگو جاری تھی۔

"آج تو ایسا ہوا کہ بلال کے گھر پر کوئی تھا ہی نہیں، صرف ملازمہ تھی۔ میں کچھ دیر بیٹھی رہی پھر بھی وہ لوگ نہیں آئے تو میں نے سوچا کہ خود گھر چلی جاؤں اور پھر ماشاء اللہ تم مل گئے۔"

"اماں جی! آپ رکشے والے کو کیا بتاتیں؟"

"وہی جو تمہیں بتایا ہے۔"

وہ ان کی ذہانت پر باغ باغ ہو گیا۔

"اس سے پہلے کبھی آپ اس طرح پتہ بتا کر گھر پہنچی ہیں؟"

اس نے قدرے افسوس بھرے لہجے میں گاڑی کو ریورس کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہ... کبھی نہیں ... ضرورت ہی نہیں پڑی۔"

سعیدہ اماں کا اطمینان قابلِ رشک تھا۔ سالار مزید کچھ کہے بغیر گاڑی سڑک پر لے آیا۔

"اب تم کہاں جا رہے ہو؟"

سعیدہ اماں زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکیں۔

"جہاں سے میں نے آپ کو لیا تھا گھر اسی سڑک پر ہوگا۔ آپ نے کوئی ٹرن تو نہیں لیا تھا؟"

سالار نے بیک ویو مرر سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، میں نے نہیں لیا۔"

سعیدہ اماں نے قدرے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

سالار نے ان کے لہجے پر غور نہیں کیا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کا مطلب تھا گھر اس سڑک پر ہی کہیں تھا اور گلیوں کی نسبت کالونی میں گھر تلاش کرنا آسان تھا۔ وہ بھی اس صورت میں جب اسے صرف ایک سڑک کے گھر دیکھنے تھے۔

"تم سگریٹ پیتے ہو؟"

خاموشی یک دم ٹوٹی۔ وہ گاڑی ڈرائیو کرتے کرتے چونک گیا۔

"میں...؟"

اس نے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ سعیدہ اماں بھی بیک ویو مرر میں ہی دیکھ رہی تھیں۔

"آ..... نہیں۔"

وہ سوال کو سمجھ نہیں سکا تھا۔

"کوئی اور نشہ وغیرہ۔"

وہ اس بار سوال سے زیادہ ان کی بے تکلفی پر حیران ہوا۔

"آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"بس ویسے ہی۔ اب اتنا لمبا راستہ میں خاموش کیسے رہوں گی۔"

انہوں نے اپنی مجبوری بتائی۔

"آپ کو کیا لگتا ہے، میں کرتا ہوں کا کوئی نشہ؟"

سالار نے جواباً ان سے پوچھا۔

"نہیں، کبھی اسی لئے تو میں پوچھ رہی ہوں تو پھر نہیں کرتے؟"

ان کے انداز نے اس بار سالار کو محظوظ کیا۔

"نہیں۔" اس نے مختصراً کہا۔ وہ اب سگنل پر رکے ہوئے تھے۔

"کوئی گرل فرینڈ ہے؟" سالار کو لگا اسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اس نے پلٹ کر سعیدہ اماں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ نے کیا پوچھا ہے؟"

"میں نے کہا ہے، کوئی گرل فرینڈ ہے؟" سعیدہ اماں نے "گرل فرینڈ" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

سالار کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"آپ کو پتا ہے گرل فرینڈ کیا ہوتی ہے؟"

سعیدہ اماں اس کے سوال پر برا مان گئیں۔

"کیوں بھئی... دو بیٹے ہیں میرے۔ مجھے پتا نہیں ہوگا کہ گرل فرینڈ کیا ہوتی ہے۔ جب انہیں باہر پڑھنے کے لئے بھیجا تھا تو کہہ کر بھیجا تھا میرے شوہر نے کہ گرل فرینڈ نہیں ہونی چاہئے اور پھر مہینے میں ایک بار فون آتا تھا دونوں کا۔"

سگنل کھل گیا۔ سالار مسکراتے ہوئے سیدھا ہو گیا اور ایکسیلیٹر پر پاؤں دبا دیا۔

سعیدہ اماں نے بات جاری رکھی۔

"میں دونوں سے کہتی تھی کہ قسم کھا کر بتائیں، انہوں نے کوئی گرل فرینڈ بنائی تو نہیں۔ جب تک شادیاں نہیں ہو گئیں۔ ہر بار فون پر سب سے پہلے دونوں قسم کھا کر یہی بتایا کرتے تھے مجھے۔ سلام بھی بعد میں کیا کرتے تھے۔"

وہ فخریہ انداز میں بتاتی جا رہی تھیں۔

"بڑے تابعدار بچے ہیں میرے۔ دونوں نے گرل فرینڈز نہیں بنائی۔"

"آپ نے اپنی پسند سے دونوں کی کہیں شادیاں کی ہیں؟"

سالار نے پوچھا۔

"نہیں، دونوں نے ادھر ہی اپنی پسند سے شادیاں کی ہیں۔"

انہوں نے سادگی سے کہا۔ سالار کے حلق سے بے اختیار قہقہہ نکلا۔

"کیا ہوا؟" سعیدہ اماں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں، آپ کی بہوئیں انگریز ہیں؟"

"نہیں، پاکستانی ہیں مگر وہیں رہتی تھیں۔ میرے بیٹوں کے ساتھ کام کرتی تھیں مگر تم ہنسے کیوں؟"

سعیدہ اماں نے اپنا سوال دہرایا۔

"کوئی خاص بات نہیں۔"

سعیدہ اماں کچھ دیر خاموش رہیں پھر انہوں نے کہا۔

"تو تم نے بتایا نہیں کہ گرل فرینڈ ...."

سالار نے بات کاٹ دی۔

"نہیں ہے سعیدہ اماں! گرل فرینڈ بھی نہیں ہے۔"

"ماشاءاللہ ماشاءاللہ۔" وہ ایک بار پھر اس ماشاءاللہ کا سیاق و سباق سمجھنے میں ناکام رہا۔

"گھر اپنا ہے؟"

"نہیں کرائے کا ہے۔"

"کوئی ملازم وغیرہ ہے؟"

"مستقل تو نہیں ہے مگر صفائی وغیرہ کے لئے ملازم رکھا ہوا ہے۔"

"اور یہ گاڑی تو اپنی ہی ہو گی؟"

"جی۔"

"اور تنخواہ کتنی ہے؟"

سالار روانی سے جواب دیتے دیتے ایک بار پھر چونکا۔ گفتگو کس نوعیت پر جا رہی تھی، فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"سعیدہ اماں! آپ یہاں اکیلی کیوں رہتی ہیں۔ اپنے بیٹوں کے پاس کیوں نہیں چلی جاتیں؟"

سالار نے موضوع بدلا۔

"ہاں، میرا ابھی ارادہ ہے۔ پہلے تو میرا دل نہیں چاہتا تھا مگر اب یہ سوچا ہے کہ بیٹی کی شادی کر لوں تو پھر باہر چلی جاؤں گی۔ اکیلے رہتے رہتے تنگ آگئی ہوں۔"

سالار اب اس سڑک پر آگیا تھا جہاں سے اس نے سعیدہ اماں کو پک کیا تھا۔

"میں نے آپ کو یہاں سے لیا تھا۔ آپ بتائیں، ان میں سے کون سا گھر ہے؟" سالار نے گاڑی کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے دائیں طرف کے گھروں پر نظر ڈالی۔

"نمبر کا نہیں پتہ، گھر کی تو پہچان ہوگی آپ کو؟"

سعیدہ اماں بغور گھروں کو دیکھ رہی تھیں۔

"ہاں.... ہاں گھر کی پہچان ہے۔"

وہ گھر کی نشانیاں بتانے لگیں جو اتنی ہی مبہم تھیں، جتنا ان کے اپنے گھر کا پتہ۔ وہ سڑک کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ سعیدہ اماں گھر نہیں پہچان سکیں۔ سالار، بلال کے والد کا نام پوچھ کر گاڑی سے نیچے اتر گیا اور باری باری دونوں اطراف کے گھروں سے سعیدہ اماں کے بارے میں پوچھنے لگا۔

آدھ گھنٹہ کے بعد وہ اس سڑک پر موجود ہر گھر میں جا چکا تھا۔ مطلوبہ نام کے کسی آدمی کا گھر وہاں نہیں تھا۔

"آپ کو ان کا نام ٹھیک سے یاد ہے؟"

وہ تھک ہار کر سعیدہ اماں کے پاس آیا۔

"ہاں.... لو بھلا اب مجھے نام بھی پتا نہیں ہوگا۔"

سعیدہ اماں نے برا مانا۔

"لیکن اس نام کے کسی آدمی کا گھر یہاں نہیں ہے، نہ ہی کوئی آپ کے بارے میں جانتا ہے۔"

سالار نے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو.... یہ ساتھ والی سڑک پر دیکھ لو۔"

سعیدہ اماں نے کچھ فاصلے پر ایک اور سڑک کی طرف اشارہ کیا۔

"لیکن سعیدہ اماں! آپ نے کہا تھا کہ گھر اسی سڑک پر ہے۔" سالار نے کہا۔

"میں نے کب کہا تھا؟" وہ معترض ہوئیں۔

"میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ نے ٹرن تو نہیں لیا۔ آپ نے کہا نہیں۔" سالار نے انہیں یاد کروایا۔

"وہ تو میں نے کہا تھا مگر یہ ہوتا کیا ہے؟"

سالار کا دل ڈوبا۔

"ٹرن؟"

"ہاں، یہی۔"

"آپ کسی اور سڑک سے مڑ کر تو یہاں نہیں آئیں؟"

"او تو اس طرح کہو نا۔" سعیدہ اماں کو تسلی ہوئی۔

"میں کیوں یہاں بیٹھ گئی تھی۔ تھک گئی تھی چل چل کر اور یہ سڑک تو چھوٹی سی ہے۔ یہاں میں چل کر کیا تھک سکتی تھی؟"

سالار نے گاڑی اسٹارٹ کرلی۔ وہ دن بہت خراب تھا۔

"کس سڑک سے مڑ کر یہاں آئی تھیں آپ؟"

اس نے سعیدہ اماں سے کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھائی۔

"میرا خیال ہے.... " وہ پہلی سڑک کو دیکھتے ہوئے الجھیں۔

"یہ ہے۔" انہوں نے کہا۔

سالار کو یقین تھا وہ سڑک نہیں ہوگی مگر اس نے گاڑی اس سڑک پر موڑ لی۔ یہ تو طے تھا کہ آج اس کا سارا دن اسی طرح ضائع ہوتا تھا۔

اگلا ایک ڈیڑھ گھنٹہ وہ وہاں آس پاس کی مختلف سڑکوں پر سعیدہ اماں کو لے کر پھرتا رہا مگر اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ سعیدہ اماں کو ہر گھر دور سے شناسا لگتا۔ پاس جانے پر وہ کہنا شروع کر دیتیں۔

"نہ.... نہ.... نہ.... یہ نہیں ہے۔"

وہ بالآخر کالونی میں تلاش چھوڑ کر انہیں واپس اسی محلے میں لے آیا جہاں وہ پہلے ان کا گھر ڈھونڈتا رہا تھا۔

مزید ایک ڈیڑھ گھنٹہ وہاں ضائع کرنے کے بعد جب وہ تھک کر واپس گاڑی کے پاس آیا تو شام ہو چکی تھی۔

سعیدہ اماں اس کے برعکس اطمینان سے گاڑی میں بیٹھی تھیں۔

"ملا؟"

انہوں نے سالار کے اندر بیٹھتے ہی پوچھا۔

"نہیں، اب تو رات ہو رہی ہے، تلاش بے کار ہے۔ میں پولیس میں رپورٹ کروا دیتا ہوں آپ کی۔ آپ کی بیٹی یا آپ کے محلے والے آپ کے نہ ملنے پر پولیس سے رابطہ تو کریں گے ہی.... پھر وہ لے جائیں گے آپ کو۔"

سالار نے ایک بار پھر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے تجویز پیش کی۔

"ہاں، میرا یہی ارادہ ہے۔ پہلے تو میرا دل نہیں چاہتا تھا مگر اب یہ سوچا ہے کہ بیٹی کی شادی کر دوں تو پھر باہر چلی جاؤں گی۔ اکیلے رہتے رہتے تنگ آگئی ہوں۔"

سالار اب اس سڑک پر آگیا تھا جہاں سے اس نے سعیدہ اماں کو پک کیا تھا۔

"میں نے آپ کو یہاں سے لیا تھا۔ آپ بتائیں، ان میں سے کون سا گھر ہے؟" سالار نے گاڑی کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے دائیں طرف کے گھروں پر نظر ڈالی۔

"نمبر کا نہیں پتہ، گھر کی تو پہچان ہوگی آپ کو؟"

سعیدہ اماں بغور گھروں کو دیکھ رہی تھیں۔

"ہاں.... ہاں گھر کی پہچان ہے۔"

وہ گھر کی نشانیاں بتانے لگیں جو اتنی ہی مبہم تھیں، جتنا ان کے اپنے گھر کا پتہ۔ وہ سڑک کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ سعیدہ اماں گھر نہیں پہچان سکیں۔ سالار، بلال کے والد کا نام پوچھ کر گاڑی سے نیچے اتر گیا اور باری باری دونوں اطراف کے گھروں سے سعیدہ اماں کے بارے میں پوچھنے لگا۔

آدھ گھنٹہ کے بعد وہ اس سڑک پر موجود ہر گھر میں جا چکا تھا۔ مطلوبہ نام کے کسی آدمی کا گھر وہاں نہیں تھا۔

"آپ کو ان کا نام ٹھیک سے یاد ہے؟"

وہ تھک ہار کر سعیدہ اماں کے پاس آیا۔

"ہاں.... لو بھلا اب مجھے نام بھی پتا نہیں ہوگا۔"

سعیدہ اماں نے برا مانا۔

"لیکن اس نام کے کسی آدمی کا گھر یہاں نہیں ہے، نہ ہی کوئی آپ کے بارے میں جانتا ہے۔"

سالار نے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو.... یہ ساتھ والی سڑک پر دیکھ لو۔"

سعیدہ اماں نے کچھ فاصلے پر ایک اور سڑک کی طرف اشارہ کیا۔

"لیکن سعیدہ اماں! آپ نے کہا تھا کہ گھر اسی سڑک پر ہے۔" سالار نے کہا۔

"میں نے کب کہا تھا؟" وہ معترض ہوئیں۔

"میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ نے ٹرن تو نہیں لیا۔ آپ نے کہا نہیں۔" سالار نے انہیں یاد کروایا۔

"وہ تو میں نے کہا تھا مگر یہ ہوتا کیا ہے؟"

سالار کا دل ڈوبا۔

"ٹرن؟"

"ہاں، یہی۔"

"آپ کسی اور سڑک سے مڑ کر تو یہاں نہیں آئیں؟"

"او تو اس طرح کہو نا۔" سعیدہ اماں کو تسلی ہوئی۔

"میں کیوں یہاں بیٹھ گئی تھی۔ تھک گئی تھی چل چل کر اور یہ سڑک تو چھوٹی سی ہے۔ یہاں میں چل کر کیا تھک سکتی تھی؟"

سالار نے گاڑی اسٹارٹ کر لی۔ وہ دن بہت خراب تھا۔

"کس سڑک سے مڑ کر یہاں آئی تھیں آپ؟"

اس نے سعیدہ اماں سے کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھائی۔

"میرا خیال ہے...." وہ پہلی سڑک کو دیکھتے ہوئے الجھیں۔

"یہ ہے۔" انہوں نے کہا۔

سالار کو یقین تھا وہ سڑک نہیں ہوگی مگر اس نے گاڑی اس سڑک پر موڑ لی۔ یہ تو طے تھا کہ آج اس کا سارا دن اسی طرح ضائع ہونا تھا۔

اگلا ایک ڈیڑھ گھنٹہ وہ وہاں آس پاس کی مختلف سڑکوں پر سعیدہ اماں کو لے کر پھرتا رہا مگر اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ سعیدہ اماں کو ہر گھر دور سے شناسا لگتا۔ پاس جانے پر وہ کہنا شروع کر دیتیں۔

"نہ.... نہ.... نہ.... یہ نہیں ہے۔"

وہ بالآخر کالونی میں تلاش چھوڑ کر انہیں واپس اسی محلے میں لے آیا جہاں وہ پہلے ان کا گھر ڈھونڈ رہا تھا۔

مزید ایک ڈیڑھ گھنٹہ وہاں ضائع کرنے کے بعد جب وہ تھک کر واپس گاڑی کے پاس آیا تو شام ہو چکی تھی۔

سعیدہ اماں اس کے برعکس اطمینان سے گاڑی میں بیٹھی تھیں۔

"ملا؟"

انہوں نے سالار کے اندر بیٹھتے ہی پوچھا۔

"نہیں، اب تو رات ہو رہی ہے، تلاش بے کار ہے۔ میں پولیس میں رپورٹ کروا دیتا ہوں آپ کی۔ آپ کی بیٹی یا آپ کے محلے والے آپ کے نہ ملنے پر پولیس سے رابطہ تو کریں گے ہی.... پھر وہ لے جائیں گے آپ کو۔"

سالار نے ایک بار پھر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے تجویز پیش کی۔

"جی..... جی ..... آمنہ بے چاری پریشان ہو رہی ہو گی۔"

سعیدہ اماں کو اپنی بیٹی کا خیال آیا۔ سالار کا دل چاہا وہ ان سے کہے کہ وہ ان کی بیٹی سے زیادہ پریشان ہے مگر وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتے ہوئے گاڑی پولیس اسٹیشن لے آیا۔

رپورٹ درج کروانے کے بعد وہ اُٹھ کر وہاں سے نکلنے لگا۔ سعیدہ اماں بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

"آپ بیٹھیں ... آپ یہیں رہیں گی۔"

سالار نے ان سے کہا۔

"نہیں ... ہم انہیں یہاں کہاں رکھیں گے، آپ انہیں ساتھ لے جائیں، کسی نے ہم سے رابطہ کیا تو ہم انہیں آپ کا پتا دے دیں گے۔" پولیس انسپکٹر نے کہا۔

"لیکن میں تو انہیں آپ کے حوالے کر دینا چاہتا ہوں۔" سالار معترض ہوا۔

"دیکھیں، بوڑھی خاتون ہیں، اگر کوئی رابطہ نہیں کرتا ہم سے تو رات کہاں رہیں گی یہ اور اگر کچھ دن اور گزر گئے "

پولیس انسپکٹر کہتا گیا۔ سعیدہ اماں نے اسے بات مکمل کرنے نہیں دی۔

"نہیں، مجھے ادھر نہیں رہنا۔ بیٹا! میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گی۔ میں ادھر کہاں بیٹھوں گی آدمیوں میں۔"

سالار نے انہیں پہلی بار گھبرائے ہوئے دیکھا۔

"لیکن میں تو "اکیلا رہتا ہوں، وہ کہتے کہتے رُک گیا، پھر اسے فرقان کے گھر کا خیال آیا۔

"اچھا ٹھیک ہے، چلیں۔" اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

باہر گاڑی میں آ کر اس نے موبائل پر فرقان سے رابطہ قائم کیا۔ وہ انہیں فرقان کے ہاں ٹھہرانا چاہتا تھا۔ فرقان ابھی ہاسپٹل میں ہی تھا۔ اس نے موبائل پر ساری صورت حال اسے بتائی۔

"نوشین تو گاؤں گئی ہوئی ہے۔" فرقان نے اسے بتایا۔

"مگر کوئی مسئلہ نہیں، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ انہیں اپنے فلیٹ پر لے جاؤں گا۔ وہ کون سی کوئی نوجوان خاتون ہیں کہ مسئلہ ہو جائے گا۔ تم ضرورت سے کچھ زیادہ ہی محتاط ہو رہے ہو۔"

"نہیں، میں ان کے آرام کے حوالے سے کہہ رہا تھا۔ آکورڈ نہ لگے انہیں۔" سالار نے کہا۔

"نہیں لگتا یار! پوچھ لینا تم ان سے، ورنہ پھر کسی ساتھ والے فلیٹ میں ٹھہرا دیں گے، عالم صاحب کی فیملی کے ساتھ۔"

"اچھا، تم آؤ پھر دیکھتے ہیں۔"

سالار نے موبائل بند کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں بیٹا! میں تمہارے پاس ہی رہ لوں گی۔ تم میرے بیٹے کے برابر ہو، مجھے اعتماد ہے تم پر۔"

سعیدہ اماں نے مطمئن لہجے میں کہا۔

"سالار نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

اس نے راستے میں رُک کر ایک ریسٹورنٹ سے کھانا لیا۔ بھوک سے اس کا برا حال ہو رہا تھا اور یک دم اسے احساس ہوا کہ سعیدہ اماں بھی دوپہر سے اس کے ساتھ کچھ کھائے پیئے بغیر ہی پھر رہی ہیں۔ اسے ندامت کا احساس ہوا۔ اپنے فلیٹ کی طرف جاتے ہوئے اس نے راستے میں ایک جگہ رُک کر سعیدہ اماں کے ساتھ سیب کا تازہ جوس پیا۔ وہ زندگی میں پہلی بار کسی بوڑھے شخص کے ساتھ اتنا وقت گزار رہا تھا اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہ کام آسان نہیں تھا۔

فلیٹ میں پہنچ کر وہ ابھی سعیدہ اماں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا جب فرقان آ گیا۔

اس نے سعیدہ اماں سے خود ہی اپنا تعارف کروایا اور پھر کھانا کھانے لگا۔ چند منٹوں میں ہی وہ سعیدہ اماں کے ساتھ اتنی بے تکلفی کے ساتھ ٹھیٹھ پنجابی میں گفتگو کر رہا تھا کہ سالار کو رشک آنے لگا۔ اس نے فرقان سے اچھی گفتگو کرنے والا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے گفتگو کے انداز میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور تھا کہ دوسرا اپنا دل اس کے سامنے کھول کر رکھ دینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اتنے سالوں سے دوستی کے باوجود وہ فرقان کی طرح گفتگو کرنا نہیں سیکھ سکا تھا۔

دس منٹ کے بعد وہ وہاں خاموشی سے کھانا کھانے والے ایک سامع کی حیثیت اختیار کر چکا تھا جبکہ فرقان اور سعیدہ اماں مسلسل گفتگو میں مصروف تھے۔ سعیدہ اماں یہ جان کر کہ فرقان ڈاکٹر ہے، اس سے طبی مشورے لینے میں مصروف تھیں۔ کھانے کے خاتمے تک وہ فرقان کو مجبور کر چکی تھیں کہ وہ اپنا میڈیکل باکس لا کر ان کا چیک اپ کرے۔

فرقان نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ اونکولوجسٹ تھا۔ وہ بڑی تحمل مزاجی سے اپنا بیگ لے آیا۔ اس نے سعیدہ اماں کا بلڈ پریشر چیک کیا پھر اسٹیتھو سکوپ سے ان کے دل کی رفتار کو ماپا اور آخر میں نبض چیک کرنے کے بعد انہیں یقین دلایا کہ وہ بے حد تندرست حالت میں ہیں اور بلڈ پریشر یا دل کی کوئی بیماری انہیں نہیں ہے۔

سعیدہ اماں یک دم بے حد ہشاش بشاش نظر آنے لگیں۔ سالار ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتے ہوئے کچن میں برتن دھوتا رہا۔ وہ دونوں لاؤنج کے صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

پھر اسی دوران اس نے فون کی گھنٹی سنی۔ فرقان نے فون اُٹھایا تھا۔ دوسری طرف ڈاکٹر سبط علی تھے۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے کہا۔

"سالار نے پولیس اسٹیشن پر کسی سعیدہ نام کی خاتون کے بارے میں اطلاع دی تھی۔"

فرقان حیران ہوا۔

"جی وہ یہیں ہیں، ہمارے پاس۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" ڈاکٹر سبط علی نے بے اختیار کہا۔

"ہاں، وہ میری عزیزہ ہیں، ہم انہیں تلاش کر رہے تھے چند گھنٹوں سے۔ پولیس سے رابطہ کیا تو سالار کا نام اور نمبر دے دیا انہوں نے۔"

فرقان نے انہیں سعیدہ اماں کے بارے میں بتایا پھر سعیدہ اماں کی بات فون پر ان سے کروائی۔ سالار بھی باہر لاؤنج میں آگیا۔

سعیدہ اماں فون پر گفتگو میں مصروف تھیں۔

"ڈاکٹر صاحب کی عزیزہ ہیں یہ۔"

فرقان نے دھیمی آواز میں اس کے قریب آکر کہا۔

"ڈاکٹر سبط علی صاحب کی؟" سالار حیران ہوا۔

"ہاں، ان ہی کی۔"

سالار نے بے اختیار اطمینان بھرا سانس لیا۔

"بھائی صاحب کہہ رہے ہیں تم سے بات کروانے کو۔"

سعیدہ اماں نے فرقان سے کہا۔

فرقان تیزی سے ان کی طرف بڑھا اور ریسیور لے کر کاغذ پر کچھ نوٹ کرنے لگا۔ ڈاکٹر سبط علی اسے ایڈریس لکھوا رہے تھے۔

سعیدہ اماں نے قدرے حیرانی سے لاؤنج کے دروازے میں کھڑے سالار کو دیکھا۔

"تم کیا کر رہے ہو؟" ان کی نظریں سالار کے ایپرن پر جمی تھیں۔

وہ کچھ شرمندہ ہو گیا۔

"میں برتن دھو رہا تھا۔"

سالار واپس کچن میں آیا اور اس نے ایپرن اتار دیا۔ ویسے بھی برتن وہ تقریباً دھو چکا تھا۔

"سالار! آؤ پھر انہیں چھوڑ آتے ہیں۔"

اسے اپنے عقب میں فرقان کی آواز آئی۔

"یہ کام بعد میں کر لینا۔"

"تم گاڑی کی چابی لو، میں ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔" سالار نے کہا۔

اگلے دس منٹ میں وہ پیچھے سالار کی گاڑی میں تھے۔ فرقان اگلی سیٹ پر تھا اور اس کے باوجود پچھلی سیٹ پر بیٹھی سعیدہ اماں سے گفتگو میں مصروف تھا۔ ساتھ ساتھ وہ سالار کو راستے کے بارے میں ہدایات بھی دیتا جا رہا تھا۔

بہت تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ بیس منٹ میں مطلوبہ محلے اور گلی میں تھے۔ بڑی گلی میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد وہ دونوں انہیں اندر گلی میں ان کے گھر تک چھوڑنے گئے۔ سعیدہ اماں کو اب رہنمائی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنی گلی کو پہچانتی تھیں۔

وہ فخریہ انداز میں کچھ جتاتے ہوئے سالار کو بتاتی گئیں۔

"حلوائی کی دکان   گٹر کے سیمنٹ والے ڈھکن   پرویز صاحب کا گھر ....."

"جی!" سالار مسکراتے ہوئے سر ہلاتا رہا۔

اس نے ان کو یہ نہیں بتایا کہ ان کی بتائی ہوئی ساری نشانیاں صحیح تھیں۔ صرف وہ اسے ایک غلط راستے میں لے گئی تھیں۔

"آمنہ بے چاری پریشان ہو رہی ہوگی۔" انہوں نے سرخ اینٹ کی بنی ہوئی ایک حویلی نما دو منزلہ مکان کے سامنے رکتے ہوئے ۲۷۵ دفعہ کہا۔

فرقان نے آگے بڑھ کر بیل بجائی۔ سالار قدرے ستائشی انداز میں حویلی پر نظریں دوڑاتا رہا۔ وہ یقیناً کافی پرانی حویلی تھی مگر مسلسل دیکھ بھال کی وجہ سے وہ اس گلی میں سب سے باوقار لگ رہی تھی۔

"تم لوگوں کو اب میں نے چائے پیئے بغیر جانے نہیں دینا۔" سعیدہ اماں نے کہا۔

"میری وجہ سے تم لوگوں کو بہت پریشانی ہوئی۔ خاص طور پر سالار کو۔ بچہ مجھے سارا دن لئے پھرتا رہا۔" سعیدہ اماں نے سالار کے کندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں، سعیدہ اماں! چائے ہم پھر کبھی پئیں گے، آج نہیں دیر ہو رہی ہے۔"

"ہاں سعیدہ اماں! آج چائے نہیں پئیں گے۔ کبھی آکر آپ کے پاس کھانا کھائیں گے۔"

فرقان نے بھی جلدی سے کہا۔

"دیکھ لینا، ایسا نہ ہو کہ یاد ہی نہ رہے تمہیں۔"

"لیں، بھلا کھانا کیسے بھولیں گے ہم۔ وہ جو آپ پالک گوشت کی ترکیب بتا رہی تھیں، وہی بنا کر کھلائیے گا۔"

فرقان نے کہا۔ اندر سے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ سعیدہ اماں کی بیٹی دروازہ کھولنے آرہی تھی اور اس نے دروازے سے کچھ فاصلے پر ہی سعیدہ اماں اور فرقان کی آوازیں سن لی تھیں، اس لئے اس نے کچھ بھی پوچھے بغیر دروازے کا بولٹ اندر سے اتارتے ہوئے دروازہ تھوڑا سا کھول دیا۔

"اچھا سعیدہ اماں! خدا حافظ۔" فرقان نے سعیدہ اماں کو دروازے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ سالار اس سے پہلے ہی پلٹ چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کرتے ہوئے سالار نے فرقان سے کہا۔

"تمہاری سب سے ناپسندیدہ ڈش، پالک گوشت ہے اور تم ان سے کیا کہہ رہے تھے؟"

فرقان نے قہقہہ لگایا۔ "کہنے میں کیا حرج ہے۔ ویسے ہو سکتا ہے وہ واقعی اتنا اچھا پکائیں کہ میں کھانے پر مجبور ہو جاؤں۔"

"تم جاؤ گے ان کے گھر؟"

سالار گاڑی مین روڈ پر لاتے ہوئے حیران ہوا۔

"بالکل جاؤں گا، وعدہ کیا ہے میں نے اور تم؟"

"میں تو نہیں جاؤں گا۔" سالار نے انکار کیا۔

"جان نہ پہچان، منہ اٹھا کر ان کے گھر کھانا کھانے پہنچ جاؤں۔"

"ڈاکٹر سبط علی صاحب کی فرسٹ کزن ہیں وہ اور مجھ سے زیادہ تو تمہاری جان پہچان ہے ان کے ساتھ۔" فرقان نے کہا۔

"وہ اور معاملہ تھا، انہیں مدد کی ضرورت تھی، میں نے مدد کر دی اور بس اتنا ہی کافی ہے۔ ان کے بیٹے یہاں ہوتے تو اور بات تھی لیکن اس طرح اکیلی عورتوں کے گھر میں تو کبھی نہیں جاؤں گا۔" سالار سنجیدہ تھا۔

"میں کون سا اکیلا جانے والا ہوں یار! بیوی بچوں کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ جانتا ہوں میرا اکیلا ان کے ہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ نوشین بھی ان سے مل کر خوش ہو گی۔"

"ہاں، بھابھی کے ساتھ چلے جانا، کوئی حرج نہیں۔" سالار مطمئن ہوا۔

"میں جاؤں؟ تم کو بھی ساتھ چلنا ہے، انہوں نے تمہیں بھی دعوت دی ہے۔"

"میں تو نہیں جاؤں گا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ تم ہو آنا، کافی ہے۔" سالار نے لاپروائی سے کہا۔

"تم ان کے خاص مہمان ہو، تمہارے بغیر تو سب کچھ پھیکا رہے گا۔"

سالار کو اس کا لہجہ کچھ عجیب سا لگا۔ اس نے گردن موڑ کر فرقان کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"میرا خیال ہے انہیں تم داماد کے طور پر پسند آ گئے ہو۔"

"فضول باتیں مت کیا کرو۔" سالار نے اسے ناراضی سے دیکھا۔

"اچھا دیکھ لینا، پروپوزل آئے گا تمہارا اس گھر سے۔ سعیدہ اماں کو تم ہر طرح سے اچھے لگے ہو۔ ہر بات پوچھی ہے انہوں نے مجھ سے تمہارے بارے میں۔ یہ بھی کہ تمہارا شادی کا کوئی ارادہ ہے کہ نہیں اور ہے تو کب تک کرنے کا ارادہ ہے۔ میں نے کہا کہ جیسے ہی کوئی اچھا پروپوزل ملا وہ فوراً کر لے گا پھر وہ اپنی بیٹی کے بارے میں بتانے لگیں۔ اب جتنی تعریفیں وہ اپنی بیٹی کی کر رہی تھیں اگر ہم اس میں سے پچاس فیصد بھی سچ سمجھ لیں تو بھی وہ لڑکی... کیا نام لے رہی تھیں..... ہاں آمنہ تمہارے لئے بہترین ہو گی۔"

"شرم آنی چاہئے تمہیں ڈاکٹر سبط علی صاحب کی رشتہ دار ہیں وہ اور تم ان کے بارے میں فضول باتیں کر رہے ہو۔" سالار نے اسے جھڑکا۔

فرقان سنجیدہ ہو گیا۔

"میں کوئی غلط بات نہیں کر رہا ہوں، تمہارے لئے تو یہ اعزاز کی بات ہونی چاہئے کہ تمہاری شادی ڈاکٹر سبط علی صاحب کے خاندان میں ہو....."

"جسٹ اسٹاپ اٹ فرقان! یہ مسئلہ کافی ڈسکس ہو گیا، اب ختم کرو۔" سالار نے سختی سے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے، ختم کرتے ہیں پھر کبھی بات کریں گے۔"

فرقان نے اطمینان سے کہا۔ سالار نے گردن موڑ کر چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

"ڈرائیونگ کر رہے ہو، سڑک پر دھیان رکھو۔" فرقان نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ سالار کچھ ناراضی کے عالم میں سڑک کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

سعیدہ اماں کے ساتھ ان کا رابطہ وہیں ختم نہیں ہوا۔

کچھ دنوں کے بعد وہ ایک شام ڈاکٹر سبط علی کے ہاں تھے جب انہوں نے اپنے لیکچر کے بعد ان دونوں کو روک لیا۔

"سعیدہ آپا آپ لوگوں سے ملنا چاہتی ہیں، مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ میں آپ لوگوں کے ہاں انہیں لے جاؤں۔ میں نے ان کو بتایا کہ شام کو وہ لوگ میری طرف آئیں گے، آپ یہیں مل لیں۔ آپ لوگوں نے شاید کوئی وعدہ کیا تھا ان کے ہاں جانے کا، مگر گئے نہیں۔"

فرقان نے معنی خیز نظروں سے سالار کو دیکھا۔ وہ نظریں چرا گیا۔

"نہیں، ہم لوگ سوچ رہے تھے مگر کچھ مصروفیت تھی اس لئے نہیں جا پائے۔" فرقان نے جواباً کہا۔

وہ دونوں ڈاکٹر سبط علی کے ساتھ ان کے ڈائننگ روم میں چلے آئے جہاں کچھ دیر بعد سعیدہ اماں

بھی آ گئیں اور آتے ہی ان کی شکایات اور ناراضی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فرقان انہیں مطمئن کرنے میں مصروف رہا جبکہ سالار خاموشی سے بیٹھا رہا۔

اگلے ویک اینڈ پر فرقان نے سالار کو سعیدہ اماں کی طرف جانے کے پروگرام کے بارے میں بتایا۔ سالار کو اسلام آباد اور پھر وہاں سے گاؤں جانا تھا۔ اس لئے اس نے اپنی مصروفیت بتا کر سعیدہ اماں سے معذرت کر لی۔

ویک اینڈ گزرنے کے بعد لاہور واپسی پر فرقان نے اسے سعیدہ اماں کے ہاں گزارے جانے والے وقت کے بارے میں بتایا۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ وہاں گیا تھا۔

"سالار! میں سعیدہ اماں کی بیٹی سے بھی ملا تھا۔"

فرقان نے بات کرتے ہوئے اچانک کہا۔

"بہت اچھی لڑکی ہے۔ سعیدہ اماں کے برعکس خاصی خاموش طبع ہے۔ بالکل تمہاری طرح۔ تم دونوں کی بڑی اچھی گزرے گی۔ نوشین کو بھی بہت اچھی لگی ہے۔"

"فرقان! تم صرف دعوت تک ہی رہو تو بہتر ہے۔" سالار نے اسے ٹوکا۔

"میں بہت سیریس ہوں سالار!" فرقان نے کہا۔

"میں بھی سیریس ہوں۔" سالار نے اسی انداز میں کہا۔ "تمہیں پتا ہے فرقان! تم جتنا شادی پر اصرار کرتے ہو، میرا شادی سے اتنا ہی دل اُلجھتا جاتا ہے اور یہ سب تمہاری ان باتوں کی وجہ سے ہے۔"

سالار نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"میری باتوں کی وجہ سے نہیں۔ تم صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم امامہ کی وجہ سے شادی نہیں کرنا چاہتے۔"

فرقان یک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"او کے...... صاف صاف کہہ دیتا ہوں، میں امامہ کی وجہ سے شادی کرنا نہیں چاہتا پھر...... ؟"

سالار نے سرد مہری سے کہا۔

"یہ ایک بچگانہ سوچ ہے۔" فرقان اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

"او کے، فائن۔ بچگانہ سوچ ہے پھر؟" سالار نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

"Then you should get rid of it." (تب تمہیں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہئے)۔ فرقان نے نرمی سے کہا۔

"I don't want to get rid of it.... so?" (میں اس سے چھٹکارا نہیں چاہتا...... پھر؟)۔

سالار نے ترکی بہ ترکی کہا۔ فرقان کچھ دیر لاجواب ہو کر اسے دیکھتا رہا۔

"میرے سامنے دوبارہ تم سعیدہ اماں کی بیٹی کی بات مت کرنا اور اگر تم سے وہ اس بارے میں بات کریں بھی تو تم صاف صاف کہہ دینا کہ مجھے شادی نہیں کرنی، میں شادی شدہ ہوں۔"

"او کے، نہیں کروں گا اس بارے میں تم سے بات۔ غصے میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

فرقان نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے صلح جوئی سے کہا۔

☆......☆......☆

"مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں اس لئے تمہیں بلوایا ہے۔" سکندر نے مسکراتے ہوئے سالار کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ طیبہ کے ساتھ اس وقت لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے اور سالار ان کے فون کرنے پر اس ویک اینڈ پر اسلام آباد آیا ہوا تھا۔

سکندر عثمان نے قدرے ستائشی نظروں سے اپنے تیسرے بیٹے کو دیکھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ان کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد اب کپڑے تبدیل کر کے ان کے پاس آیا تھا۔ سفید شلوار قمیص اور گھر میں پہنی جانے والی سیاہ چپل میں وہ اپنے عام سے حلیے کے باوجود بہت باوقار لگ رہا تھا۔ شاید یہ اس کے چہرے کی سنجیدگی تھی یا پھر شاید وہ آج پہلی بار کئی سالوں کے بعد اسے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے اور وہ اعتراف کر رہے تھے کہ اس کی شخصیت میں بہت وقار اور ٹھہراؤ آ گیا ہے۔

انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ سالار کی وجہ سے انہیں اپنے سوشل سرکل میں اہمیت اور عزت ملے گی۔ وہ جانتے تھے بہت جگہوں پر اب ان کا تعارف سالار سکندر کے حوالے سے ہوتا تھا اور انہیں اس پر خوشگوار حیرت ہوتی تھی۔ اس نے اپنی پوری ٹین ایج میں انہیں بری طرح خوار اور پریشان کیا تھا اور ایک وقت تھا، جب انہیں اپنے اس بیٹے کا مستقبل سب سے تاریک لگتا تھا۔ اپنی تمام غیر معمولی صلاحیتوں اور قابلیت کے باوجود مگر ان کے اندازے اور خدشات صحیح ثابت نہیں ہوئے تھے۔

طیبہ نے خشک میوے کی پلیٹ سالار کی طرف بڑھائی۔

سالار نے چند کاجو اٹھا لئے۔

"میں تمہاری شادی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

کاجو منہ میں ڈالتے ہوئے وہ ایک دم رُک گیا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ سکندر عثمان اور طیبہ بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔

"اب تمہیں شادی کر ہی لینی چاہئے سالار!"

سکندر نے کہا۔ سالار نے غیر محسوس انداز میں ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاجو دوبارہ خشک میوے کی پلیٹ میں رکھ دیئے۔

"میں اور طیبہ تو حیران ہو رہے تھے کہ اتنے رشتے تو تمہارے بھائیوں میں سے کسی کے نہیں آئے

جتنے تمہارے لئے آ رہے ہیں۔"

سکندر نے بڑے شگفتہ انداز میں کہا۔

"میں نے سوچا، کچھ بات وات کریں تم سے۔"

وہ چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا۔

"زاہد ہمدانی صاحب کو جانتے ہو؟" سکندر عثمان نے ایک بڑی ملٹی نیشنل کمپنی کے ہیڈ کا نام لیا۔

"جی۔ ان کی بیٹی میری کولیگ ہے۔"

"رمشہ نام ہے شاید؟"

"جی۔"

"کیسی لڑکی ہے؟"

وہ سکندر عثمان کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ ان کا سوال بہت "واضح" تھا۔

"اچھی ہے۔" اس نے چند لمحوں کے بعد کہا۔

"تمہیں پسند ہے؟"

"کس لحاظ سے؟"

"میں رمشہ کے پروپوزل کی بات کر رہا ہوں۔" سکندر عثمان نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"زاہد پچھلے کئی ہفتے سے مجھ سے اس سلسلے میں بات کر رہا ہے۔ اپنی وائف کے ساتھ وہ ایک دو بار ہماری طرف آیا بھی ہے۔ ہم لوگ بھی ان کی طرف گئے ہیں۔ پچھلے ویک اینڈ پر رمشہ سے بھی ملے ہیں۔ مجھے اور طیبہ کو تو بہت اچھی لگی ہے۔ خوب صورت ہے، بہت well behaved ہے اور تمہارے ساتھ بھی اس کی اچھی خاصی دوستی ہے۔ ان لوگوں کی خواہش ہے بلکہ اصرار ہے کہ تمہارے ذریعے دونوں فیملیز میں کوئی رشتہ داری بن جائے۔"

"پاپا! میری رمشہ کے ساتھ دوستی نہیں ہے۔" سالار نے مدھم اور ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"وہ میری کولیگ ہے، جان پہچان ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت اچھی لڑکی ہے مگر میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"تم کہیں اور انٹرسٹڈ ہو؟"

سکندر نے اس سے پوچھا۔ وہ خاموش رہا۔ سکندر اور طیبہ کے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا۔

"اگر تمہاری کہیں اور دلچسپی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں بلکہ ہمیں خوشی ہو گی وہاں تمہاری شادی کی بات کرتے ہوئے اور یقیناً ہم تم پر بھی کوئی دباؤ نہیں ڈالیں گے اس سلسلے میں۔"

سکندر نے نرمی سے کہا۔

"میں بہت عرصہ پہلے شادی کر چکا ہوں۔"

ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔ سکندر کو کوئی دشواری نہیں ہوئی یہ سمجھنے میں کہ اس کا اشارہ کس طرف تھا۔ ان کے چہرے پر یک دم سنجیدگی آ گئی۔

"امامہ کی بات کر رہے ہو؟"

وہ خاموش رہا۔ سکندر بہت دیر تک بے یقینی سے اسے دیکھتے رہے۔

"اتنے عرصے سے اس لئے شادی نہیں کر رہے؟"

سکندر کو جیسے ایک شاک لگا تھا۔ ان کا خیال تھا وہ اسے بھلا چکا تھا۔ آخر یہ آٹھ سال پرانی بات تھی۔

"اب تک تو وہ شادی کر چکی ہو گی، اپنی زندگی آرام سے گزار رہی ہو گی۔ تمہاری اور اس کی شادی تو کب کی ختم ہو چکی۔"

سکندر نے اس سے کہا۔

"نہیں پاپا! اس کے ساتھ میری شادی ختم نہیں ہوئی۔" اس نے پہلی بار سر اٹھا کر کہا۔

"تم نے اسے نکاح نامے میں طلاق کا اختیار دیا تھا اور...... مجھے یاد ہے تم اسے ڈھونڈنا چاہتے تھے تاکہ طلاق دے سکو۔"

سکندر نے جیسے اسے یاد کروایا۔

"میں نے اسے ڈھونڈا تھا مگر وہ مجھے نہیں ملی اور وہ یہ بات نہیں جانتی کہ اس کے پاس طلاق کا اختیار ہے۔ وہ جہاں بھی ہو گی ابھی تک میری ہی بیوی ہو گی۔"

"سالار! آٹھ سال گزر چکے ہیں۔ ایک دو سال کی بات تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ یہ جان گئی ہو کہ طلاق کا اختیار اس کے پاس ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اب بھی تمہاری بیوی ہی ہو۔"

سکندر نے قدرے مضطرب ہو کر کہا۔

"میرے علاوہ کوئی دوسرا تو اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا اور میں نے اسے اس حق کے بارے میں نہیں بتایا اور جب تک وہ میرے نکاح میں ہے مجھے کہیں اور شادی نہیں کرنی۔"

"تمہارا کانٹیکٹ ہے اس کے ساتھ؟" سکندر نے بہت مدھم آواز میں کہا۔

"نہیں۔"

"آٹھ سال سے اس سے تمہارا رابطہ نہیں ہوا۔ اگر ساری عمر نہ ہوا تب تم کیا کرو گے؟"

وہ خاموش رہا۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

سکندر عثمان کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرتے رہے۔

"تم نے مجھ سے کبھی یہ نہیں کہا کہ تم اس لڑکی کے ساتھ ایموشنلی انوالوڈ ہو۔ تم نے تو مجھے یہی بتایا

تھا کہ تم نے صرف وقتی طور پر اس کی مدد کی تھی وہ کسی اور لڑکے سے شادی کرنا چاہتی تھی وغیرہ وغیرہ۔"

سالار اس بار بھی خاموش رہا۔

سکندر عثمان چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔ وہ اپنے اس تیسرے بیٹے کو کبھی نہیں جان سکے تھے۔ اس کے دل میں کیا تھا وہ اس تک کبھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ جس لڑکی کے لئے وہ آٹھ سال ضائع کر چکا تھا اور باقی کی زندگی ضائع کرنے کے لئے تیار تھا، اس کے ساتھ اس کے جذباتی تعلق کی شدت کیسی ہو سکتی تھی یہ اب شاید اسے لفظوں میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کمرے میں خاموشی کا ایک لمبا وقفہ آیا پھر سکندر عثمان اٹھ کر اپنے ڈریسنگ روم میں چلے گئے۔ ان کی واپسی چند منٹوں کے بعد ہوئی۔ صوفے پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے سالار کی طرف ایک لفافہ بڑھا دیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے وہ لفافہ پکڑ لیا۔

"امامہ نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔"

وہ سانس نہیں لے سکا۔ سکندر عثمان ایک بار پھر صوفے پر بیٹھ چکے تھے۔

"یہ پانچ چھ سال پہلے کی بات ہے وہ تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔" فون ناصرہ نے اٹھایا تھا اور اس نے امامہ کی آواز پہچان لی۔ "تب تم پاکستان میں تھے، ناصرہ نے تمہاری بجائے مجھ سے اس کی بات کروائی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے اس کی بات کرواؤں۔ میں نے اس سے کہا کہ تم مر چکے ہو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ تم سے رابطہ کرے اور جس مصیبت سے ہم چھٹکارا پا چکے ہیں اس میں دوبارہ پڑیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میری بات پر یقین کر لے گی کیونکہ تم کئی بار خودکشی کی کوشش کر چکے تھے۔ وہ وسیم کی بہن تھی تمہارے بارے میں یہ سب کچھ جانتی ہو گی۔ کم از کم ایک ایسی کوشش کی تو وہ خود گواہ تھی۔ میں اسے نکاح نامے میں موجود طلاق کے اختیار کے بارے میں نہیں بتا سکا نہ ہی اس طلاق نامے کے بارے میں جو میں نے تمہاری طرف سے تیار کروایا تھا۔ تمہیں جب میں نے امریکہ بھجوایا تھا تو تم سے ایک سادہ کاغذ پر سائن لئے تھے، میں چاہتا تھا کہ مجھے ضرورت پڑے تو میں خود ہی طلاق نامہ تیار کروا لوں۔ یہ قانونی یا جائز تھا کہ نہیں اس کا پتہ نہیں مگر میں نے اسے تیار کروا لیا تھا اور میں امامہ کو اس کے بارے میں بتانا چاہتا تھا اور اسے تمام پیپرز بھی دینا چاہتا تھا مگر اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے نمبر ٹریس آؤٹ کروایا وہ کسی پی سی او کا تھا۔ اس کے کچھ دنوں بعد بیس ہزار کے کچھ ٹریولرز چیک بھی اس نے ڈاک کے ذریعے بھجوائے اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ شاید تم نے اسے کچھ رقم دی تھی۔ اس نے وہ واپس کی تھی۔ میں نے تمہیں اس لئے نہیں بتایا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم دوبارہ اس معاملے میں انوالو ہو۔ میں امامہ کی فیملی سے خوفزدہ تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ تب بھی تمہاری تاک میں ہوں گے اور میں چاہتا تھا تم اپنا کیریئر بناتے رہو۔"

وہ لفافہ ہاتھ میں پکڑے رنگ بدلتے ہوئے چہرے کے ساتھ سکندر عثمان کو دیکھتا رہا، کسی نے بہت آہستگی کے ساتھ اس کے وجود سے جان نکال لی تھی۔ اس نے لفافے کو ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ طیبہ اور سکندر اس کے ہاتھ کی کپکپاہٹ کو دیکھ سکیں ...وہ دیکھ چکے تھے مگر اس کے حواس چند لمحوں کے لئے بالکل کام کرنا چھوڑ گئے تھے۔ اپنے سامنے پڑی ٹیبل پر رکھے اس لفافے پر ہاتھ رکھے وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اسے ٹیبل پر رکھے رکھے اس نے اس کے اندر موجود کاغذ کو نکال لیا۔

ڈیئر انکل سکندر!

مجھے آپ کے بیٹے کی موت کے بارے میں جان کر بہت افسوس ہوا۔ میری وجہ سے آپ لوگوں کو چند سال پہلے بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا، میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے سالار کو کچھ رقم ادا کرنی تھی۔ وہ میں آپ کو بھجوا رہی ہوں۔

خدا حافظ

امامہ ہاشم

سالار کو لگا وہ واقعی مر گیا ہے۔ سفید چہرے کے ساتھ اس نے کاغذ کے اس ٹکڑے کو دوبارہ لفافے میں ڈال دیا۔ کچھ بھی کہے بغیر اس نے لفافہ تھاما اور اٹھ کر کھڑا ہوا۔ سکندر اور طیبہ دم بخود اسے دیکھ رہے تھے جب وہ سکندر کے پاس سے گزرنے لگا تو وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"سالار ...!"

وہ رک گیا۔ سکندر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"جو کچھ بھی ہوا ...نادانستگی میں ہوا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم.... اگر تم نے کبھی مجھے امامہ کے بارے میں اپنی فیلنگز بتائی ہوتیں تو میں کبھی یہ سب نہ کرتا۔ میں اس سارے معاملے کو کسی اور طرح ہینڈل کرتا یا پھر اس کے ساتھ تمہارا رابطہ کرواتا۔ میرے بارے میں اپنے دل میں کوئی شکایت یا گلہ مت رکھنا۔"

سالار نے سر نہیں اٹھایا۔ ان سے نظر نہیں ملائی مگر سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ اسے ان سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ سکندر نے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا لیا۔

وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا، سکندر چاہتے تھے وہ وہاں سے چلا جائے۔ انہوں نے اس کے ہونٹوں کو کسی بچے کی طرح کپکپاتے دیکھا تھا۔ وہ بار بار انہیں بھینچ کر خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند منٹ اور وہیں رہتا تو شاید پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ سکندر اپنے پچھتاوے میں مزید اضافہ نہیں چاہتے تھے۔

طیبہ نے اس ساری گفتگو میں کوئی مداخلت نہیں کی، مگر سالار کے باہر جانے کے بعد انہوں نے

سکندر کی دل دہی کرنے کی کوشش کی۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے جو کچھ کیا اس کی بہتری کے لئے کیا۔ وہ سمجھ جائے گا۔"

وہ سکندر کے چہرے سے ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا سکتی تھیں۔ سکندر ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے کمرے میں چکر لگا رہے تھے۔

"یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ مجھے سالار سے پوچھے بغیر یا اس کو بتائے بغیر یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مجھے امامہ سے اس طرح کا جھوٹ بھی نہیں بولنا چاہئے تھا... مجھے..."

وہ بات ادھوری چھوڑ کر تاسف آمیز انداز میں ایک ہاتھ کو مٹھی کی صورت میں بھینچتے ہوئے کھڑکی میں جا کر کھڑے ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

گاڑی بہت محتاط انداز میں اس سڑک پر پھسل رہی تھی۔ سالار کئی سال بعد پہلی بار اس سڑک پر رات کے اس پہر گاڑی چلا رہا تھا۔ وہ رات اس کی آنکھوں کے سامنے کسی فلم کی طرح چل رہی تھی۔ اسے لگا آٹھ سال اُڑ کر غائب ہو گئے تھے۔ سب کچھ وہی تھا۔ وہیں تھا۔

کوئی بڑی آہستگی سے اس کے برابر میں آ بیٹھا۔ اس نے اپنے آپ کو فریب کی گرفت میں آنے دیا۔ گردن موڑ کر برابر والی سیٹ کو نہیں دیکھا۔ الوژن کو حقیقت بننے دیا۔ جانتے بوجھتے کھلی آنکھوں کے ساتھ۔ کوئی اب سسکیوں کے ساتھ رو رہا تھا۔

"ڈیئر انکل سکندر!

مجھے آپ کے بیٹے کی موت پر بہت افسوس ہوا۔ چند سال پہلے میری وجہ سے آپ کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی، میں اس کے لئے آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے سالار کو کچھ رقم ادا کرنی تھی۔ وہ اب میں آپ کو بھیج رہی ہوں۔"

خدا حافظ

امامہ ہاشم

ایک بار پھر اس خط کی تحریر اس کے ذہن میں گونجنے لگی تھی۔

وہ سکندر عثمان کے پاس سے آ کر بہت دیر تک خط لئے اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔

اس نے امامہ کو کوئی رقم نہیں دی تھی مگر وہ جانتا تھا اس نے اس کا کون سا قرض لوٹایا تھا۔ موبائل فون کی قیمت اور اس کے بلز، وہ خالی الذہنی کے عالم میں اپنے بیڈ پر بیٹھے نیم تاریک کمرے کی کھڑکیوں سے باہر اس کے گھر کی عمارت کو دیکھتا رہا۔ ساری دنیا یک دم جیسے ہر زندہ شے سے خالی ہو گئی تھی۔

اس نے خط پر تاریخ پڑھی، وہ امامہ کے گھر سے جانے کے تقریباً ڈھائی سال بعد بھیجا گیا تھا۔

ڈھائی سال کے بعد اگر وہ بیس ہزار روپے اسے بھجوا رہی تھی تو اس کا مطلب تھا وہ خیریت سے تھی۔ کم از کم اس کے امامہ کے بارے میں بدترین اندیشے درست ثابت نہیں ہوئے تھے۔ اسے خوشی تھی لیکن اگر اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ سالار مر چکا تھا تو پھر وہ اس کی زندگی سے بھی نکل گیا تھا اور اس کا کیا مطلب تھا وہ یہ بھی جانتا تھا۔

کئی گھنٹے وہ اسی طرح وہیں بیٹھا رہا پھر پتا نہیں اس کے دل میں کیا آیا، اپنا بیگ پیک کر کے وہ گھر سے نکل آیا۔

اور اب وہ اس سڑک پر تھا۔ اسی دھند میں، اسی موسم میں، سب کچھ جیسے دھواں بن رہا تھا یا پھر دھند چند گھنٹوں کے بعد وہ اسی ہوٹل نما سروس اسٹیشن کے پاس جا پہنچا۔ اس نے گاڑی روک لی۔ دھند میں ملفوف وہ عمارت اب بالکل بدل چکی تھی۔ گاڑی کو موڑ کر وہ سڑک سے اُتار کر اندر لے آیا۔ پھر دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ آٹھ سال پہلے کی طرح آج بھی وہاں خاموشی کا راج تھا۔ صرف لائٹس کی تعداد پہلے سے زیادہ تھی، اس نے ہارن نہیں دیا۔ اس لئے اندر سے کوئی نہیں نکلا۔ برآمدے میں اب وہ پانی کا ذرہ نہیں تھا۔ وہ برآمدے سے گزرتے ہوئے اندر جانے لگا، تب ہی اندر سے ایک شخص نکل آیا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا سالار نے اس سے کہا۔

"میں چائے پینا چاہتا ہوں۔"

اس نے جماہی لی اور واپس مڑ گیا۔

"آ جائیں"

سالار اندر چلا گیا۔ یہ وہی کمرہ تھا مگر اندر سے کچھ بدل چکا تھا۔ پہلے کی نسبت میزوں اور کرسیوں کی تعداد زیادہ تھی اور کمرے کی حالت بھی بہت بہتر ہو چکی تھی۔

"چائے لیں گے یا ساتھ کچھ اور بھی؟" اس آدمی نے مڑ کر اچانک پوچھا۔

"صرف چائے۔"

سالار ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

آدمی کاؤنٹر کے عقب میں اب اسٹو جلانے میں مصروف ہو چکا تھا۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟" اس نے چائے کے لئے کیتلی اوپر رکھتے ہوئے سالار سے پوچھا۔

جواب نہیں آیا۔

اس شخص نے گردن موڑ کر دیکھا۔ چائے پینے کے لئے آنے والا وہ شخص کمرے کے ایک کونے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ بالکل پتھر کے کسی مجسمے کی طرح بے حس و حرکت۔

وہ نماز پڑھ کر اس کے بالمقابل میز کے دوسری جانب کرسی پر آ بیٹھی تھی۔ کچھ کہے بغیر اس نے میز پر پڑا چائے کا کپ اُٹھایا اور اسے پینے لگی۔ لڑکا تب تک برگر لے آیا تھا اور اب ٹیبل پر برگر رکھ رہا تھا۔ سالار تیکھی نظروں کے ساتھ اس برگر کی پلیٹ کو دیکھ رہا تھا، جو اس کے سامنے رکھی جا رہی تھی۔ جب لڑکے نے پلیٹ رکھ دی تو سالار نے کانٹے کے ساتھ برگر کا اوپر والا حصہ اُٹھایا اور تنقیدی نظروں سے فلنگ کا جائزہ لیا پھر چھری اُٹھا کر اس نے لڑکے سے کہا جو اب امامہ کے برگر کی پلیٹ اس کے سامنے رکھ چکا تھا۔

"یہ شامی کباب ہے۔"

وہ filling کی اوپر والی تہہ کو الگ کر رہا تھا۔

"یہ آملیٹ ہے۔" اس نے نیچے موجود آملیٹ کو چھری کی مدد سے تھوڑا اونچا کیا۔

"اور یہ کیچپ، تو چکن کہاں ہے؟ میں نے تمہیں چکن برگر لانے کو کہا تھا نا؟"

اس نے اکھڑ لہجے میں لڑکے سے کہا۔

امامہ تب تک خاموشی سے برگر اُٹھا کر کھانے میں مصروف ہو چکی تھی۔

"یہ چکن برگر ہے۔" لڑکے نے قدرے گڑبڑا کر کہا۔

"کیسے چکن برگر ہے؟ اس میں کہیں چکن نہیں۔" سالار نے چیلنج کیا۔

"ہم اسے ہی چکن برگر کہتے ہیں۔" وہ لڑکا اب نروس ہو رہا تھا۔

"اور جو سادہ برگر ہے اس میں کیا ڈالتے ہو؟"

"اس میں بس شامی کباب ہوتا ہے۔ انڈہ نہیں ہوتا۔"

"اور انڈہ ڈال کر سادہ برگر چکن برگر بن جاتا ہے، چونکہ انڈے سے مرغی نکلتی ہے اور مرغی کے گوشت کو چکن کہتے ہیں اس لئے directly نہیں تو indirectly یہ چکن برگر بنتا ہے۔"

سالار نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ وہ لڑکا کھسیانے انداز میں ہنسا۔ امامہ ان دونوں کی گفتگو پر توجہ دیئے بغیر ہاتھ میں پکڑا برگر کھانے میں مصروف تھی۔

"ٹھیک ہے جاؤ۔" سالار نے کہا۔

لڑکے نے یقیناً سکون کا سانس لیا اور وہاں سے غائب ہو گیا۔ چھری اور کانٹے کو رکھ کر سالار نے بائیں ہاتھ سے برگر کو اُٹھا لیا۔ برگر کھاتے ہوئے امامہ نے پہلی بار پلیٹ سے سالار کے ہونٹوں تک بائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے برگر کے سفر کو تعجب آمیز نظروں سے دیکھا اور یہ تعجب ایک لمحہ میں غائب ہو گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر برگر کھانے میں مصروف تھی۔ سالار نے اپنے برگر کو دانتوں سے کاٹا ایک لمحہ کے لئے منہ چلایا اور پھر برگر کو اپنی پلیٹ میں اُچھال دیا۔

"فضول برگر ہے۔ تم کس طرح کھا رہی ہو؟" سالار نے لقمے کو بمشکل حلق سے نگلتے ہوئے کہا۔

"اتنا برا نہیں ہے جتنا تمہیں لگ رہا ہے۔" امامہ نے بے تاثر انداز میں کہا۔

"ہر چیز میں تمہارا اسٹینڈرڈ بڑا لو ہے امامہ! وہ چاہے برگر ہو یا شوہر۔"

برگر کھاتے ہوئے امامہ کا ہاتھ رُک گیا۔ سالار نے اس کے سفید چہرے کو ایک پل میں سُرخ ہوتے دیکھا۔ سالار کے چہرے پر ایک تپا دینے والی مسکراہٹ آئی۔

"میں جلال انصر کی بات کر رہا ہوں۔" اس نے جیسے امامہ کو یاد دلایا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" امامہ نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"میرا اسٹینڈرڈ واقعی بہت لو ہے۔" وہ ایک بار پھر برگر کھانے لگی۔

"میں نے سوچا تم برگر میرے منہ پر دے مارو گی۔" سالار نے دبی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"میں رزق جیسی نعمت کو کیوں ضائع کروں گی۔"

یہ اتنا برا برگر نعمت ہے؟" اس نے تضحیک آمیز انداز میں کہا۔

"اور کون کون سی نعمتیں ہیں اس وقت تمہارے پاس ... "

"انسان اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتا۔ یہ میری زبان پر ذائقہ چکھنے کی جو حس ہے یہ کتنی بڑی نعمت ہے کہ میں اگر کوئی چیز کھاتی ہوں تو میں اس کا ذائقہ محسوس کر سکتی ہوں۔ بہت سے لوگ اس نعمت سے بھی محروم ہوتے ہیں۔"

"اور ان لوگوں میں ٹاپ آف دی لسٹ، سالار سکندر کا نام ہو گا ہے نا؟"

اس نے امامہ کے بات مکمل کرنے سے پہلے ہی تیز آواز میں اس کی بات کاٹی۔

"سالار سکندر کم از کم اس طرح کی چیزیں کھا کر انجوائے نہیں کر سکتا۔"

اس شخص نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھ دیا۔ سالار یک دم چونک گیا۔ سامنے والی کرسی اب خالی تھی۔

"ساتھ میں کچھ اور چاہئے؟" آدمی نے کھڑے کھڑے پھر پوچھا۔

"نہیں، بس چائے کافی ہے۔" سالار نے چائے کا کپ اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"آپ اسلام آباد سے آئے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں...."

"لاہور جا رہے ہیں؟" اس نے ایک اور سوال کیا۔

اس بار سالار نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔ وہ اب چائے کا گھونٹ لے رہا تھا۔ اس آدمی کو شبہ ہوا اس نے چائے پینے والے شخص کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی دیکھی ہے۔

"میں کچھ دیر یہاں اکیلا بیٹھنا چاہتا ہوں۔" اس نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے سر اٹھائے بغیر کہا۔

وہ شخص کچھ تعجب سے اسے دیکھتا واپس کچن میں چلا گیا اور ثانوی نوعیت کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ دور سے سالار پر نظریں دوڑاتا رہا۔

پورے پندرہ منٹ بعد اس نے سالار کو ٹیبل چھوڑ کر کمرے سے نکلتے دیکھا۔ وہ آدمی بڑی تیز رفتاری کے ساتھ کچن سے کمرے میں آیا مگر اس سے پہلے کہ وہ سالار کے پیچھے باہر جاتا، میز پر خالی کپ کے نیچے پڑے ایک نوٹ نے اسے روک لیا۔ وہ بھونچکا سا اس نوٹ کو دیکھتا رہا، پھر اس نے آگے بڑھ کر اس نوٹ کو پکڑا اور تیزی سے کمرے سے باہر آ گیا۔ سالار کی گاڑی اس وقت ریورس ہوتے ہوئے مین روڈ پر جا رہی تھی۔ اس آدمی نے حیرانی سے اس دور جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھا پھر ہاتھ میں پکڑے اس ہزار روپے کے نوٹ کو برآمدے میں لگی ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دیکھا۔

"نوٹ اصلی ہے مگر آدمی بے وقوف......"

اس نے اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے زیر لب تبصرہ کیا اور نوٹ کو جیب میں ڈال لیا۔

☆......☆......☆

سکندر عثمان صبح ناشتے کی میز پر آئے تو بھی ان کے ذہن میں سب سے پہلے سالار کا ہی خیال آیا تھا۔

"سالار کہاں ہے؟ اسے بلواؤ۔"

انہوں نے ملازم سے کہا۔ "سالار صاحب تو رات کو ہی چلے گئے۔"

طیبہ اور سکندر نے بے اختیار ایک دوسرے کا چہرہ دیکھا۔

"کہاں چلے گئے ...... ؟ گاؤں ؟"

"نہیں، واپس لاہور چلے گئے، کہہ رہے تھے کوئی ضروری کام ہے، میں صبح آپ کو بتا دوں۔"

سکندر یک دم اٹھ کر فون کی طرف چلے گئے۔ انہوں نے سالار کا نمبر ڈائل کیا۔ موبائل آف تھا۔ انہوں نے اس کے فلیٹ کا نمبر ڈائل کیا۔

وہاں جوابی مشین لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے پیغام ریکارڈ کروائے بغیر فون بند کر دیا۔ کچھ پریشان سے وہ دوبارہ ناشتے کی میز پر آ بیٹھے۔

"فون پر کانٹیکٹ نہیں ہوا؟" طیبہ نے پوچھا۔

"نہیں موبائل آف ہے۔ اس کے فلیٹ پر آنسر فون لگا ہوا ہے۔ پتا نہیں کیوں چلا گیا؟"

"آپ پریشان نہ ہوں ...... ناشتہ کریں۔" طیبہ نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

"تم کرو ...... میرا موڈ نہیں ہے۔"

وہ اٹھ کر باہر نکل گئے۔ طیبہ بے اختیار سانس لے کر رہ گئیں۔

☆......☆......☆

سالار نے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا، باہر فرقان تھا۔ وہ پلٹ کر اندر آ گیا۔

"تم کب آئے؟" فرقان نے قدرے حیرانی سے اس کے پیچھے اندر آتے ہوئے کہا۔

"آج صبح ......" سالار نے صوفے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"کیوں ...... ؟ تمہیں گاؤں جانا تھا؟" فرقان نے اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تو پارکنگ میں تمہاری گاڑی دیکھ کر آ گیا۔ بندہ آتا ہے تو بتا ہی دیتا ہے۔"

سالار جواب میں کچھ کہے بغیر صوفہ پر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا؟" فرقان نے پہلی بار اس کے چہرے کو دیکھا اور تشویش میں مبتلا ہوا۔

"کیا ہوا؟" سالار نے جواباً کہا۔

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں، تمہیں کیا ہوا ہے؟" فرقان نے اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔"

"گھر میں سب خیریت ہے؟"

"ہاں ...."

"تو پھر تم ...... سر میں درد ہے؟ میگرین؟"

فرقان اب اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"نہیں ......" سالار نے مسکرانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کا فائدہ بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو مسلا۔

"تو پھر ہوا کیا ہے تمہیں؟ آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔"

"میں رات سویا نہیں۔ ڈرائیو کرتا رہا ہوں۔"

سالار نے بڑے عام سے انداز میں کہا۔

"تو اب سو جاتے۔ یہاں آ کر فلیٹ پر، صبح سے کیا کر رہے ہو؟" فرقان نے کہا۔

"کچھ بھی نہیں ......"

"سوئے کیوں نہیں ...... ؟"

"نیند نہیں آ رہی ....."

"تم تو سلیپنگ پلز لے کر سو جاتے ہو، پھر نیند نہ آنا کیا معنی رکھتا ہے؟"

فرقان کو تعجب ہوا۔

"بس آج نہیں لینا چاہتا تھا میں۔ یا یہ سمجھ لو کہ آج میں سونا نہیں چاہتا تھا۔"

"کھانا کھایا ہے؟"

"نہیں، بھوک نہیں تھی..."

"دو بج رہے ہیں۔" فرقان نے جیسے اسے جتایا۔

"میں کھانا بھجواتا ہوں کھالو... تھوڑی دیر سو جاؤ پھر رات کو نکلتے ہیں آؤٹنگ کے لئے۔"

"نہیں، کھانا مت بھجواتا۔ میں سونے جا رہا ہوں۔ شام کو اٹھوں گا تو باہر جا کر کہیں کھاؤں گا۔"

سالار کہتے ہوئے صوفہ پر لیٹ گیا اور اپنا بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ فرقان کچھ دیر بیٹھا اسے دیکھتا رہا، پھر اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟"

رمشہ نے سالار کے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔ اس نے ریسپشن کی طرف جاتے ہوئے سالار کے کمرے کی کھڑکیوں کے چند کھلے ہوئے بلائنڈز میں اسے اندر دیکھا تھا۔ کوریڈور میں سے گزر جانے کی بجائے وہ رک گئی۔ سالار ٹیبل پر اپنی کہنیاں ٹکائے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے ہوئے تھا۔ رمشہ جانتی تھی کہ اسے کبھی کبھار میگرین کا درد ہوتا تھا۔ وہ ریسپشن کی طرف جانے کے بجائے اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔

سالار اسے دیکھ کر سیدھا ہو گیا۔ وہ اب ٹیبل پر رکھی ایک فائل کو دیکھ رہا تھا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟" رمشہ نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اس نے رمشہ کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ رمشہ واپس جانے کے بجائے آگے بڑھ آئی۔

"نہیں تم ٹھیک نہیں لگ رہے؟" اس نے سالار کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم پلیز اس فائل کو لے جاؤ۔ اسے دیکھ لو۔ میں دیکھ نہیں پا رہا..."

سالار نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے فائل بند کر کے ٹیبل پر اس کی طرف کھسکا دی۔

"میں دیکھ لیتی ہوں، تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہے تو گھر چلے جاؤ۔"

رمشہ نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

"ہاں، بہتر ہے۔ میں گھر چلا جاؤں۔" اس نے اپنا بریف کیس نکال کر اسے کھولا اور اپنی چیزیں اندر رکھنا شروع کر دیں۔ رمشہ بغور اس کا جائزہ لیتی رہی۔

☆ ☆ ☆

وہ گیارہ بجے آفس سے واپس گھر آ گیا تھا۔ یہ چوتھا دن تھا جب وہ مسلسل اسی حالت میں تھا۔ یک دم، ہر چیز میں اس کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔

بینک میں اپنی جاب۔

لمز (LUMS) کے لیکچرز۔

ڈاکٹر سبط علی کے ساتھ نشست...

فرقان کی کمپنی۔

گاؤں کا اسکول۔

مستقبل کے منصوبے اور پلاننگ۔

اسے کوئی چیز بھی اپنی طرف کھینچ نہیں پا رہی تھی۔

وہ جس امکان کے پیچھے کئی سال پہلے سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آ گیا تھا وہ "امکان" ختم ہو گیا تھا اور اسے کبھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے ختم ہونے سے اس کے لئے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ وہ مسلسل اپنے آپ کو اس حالت سے باہر لانے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا اور وہ مسلسل ناکام ہو رہا تھا۔

محض یہ تصور کہ وہ کسی اور شخص کی بیوی بن کر کسی اور کے گھر میں رہ رہی ہو گی۔ سالار سکندر کے لئے اتنا ہی جان لیوا تھا جتنا ماضی کا یہ اندیشہ کہ وہ غلط ہاتھوں میں نہ چلی گئی ہو اور اس ذہنی حالت میں اس نے عمرہ پر جانے کا فیصلہ کیا تھا وہ واحد جگہ تھی جو اس کی زندگی میں اچانک آ جانے والی اس بے معنویت کو ختم کر سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ احرام باندھے خانہ کعبہ کے صحن میں کھڑا تھا۔ خانہ کعبہ میں کوئی نہیں تھا۔ دور دور تک کسی وجود کا نشان نہیں تھا۔ رات کے پچھلے پہر آسمان پر چاند اور ستاروں کی روشنی نے صحن کے ماربل سے منعکس ہو کر وہاں کی ہر چیز کی ایک عجیب سی دودھیا روشنی میں نہلا دیا تھا۔ چاند اور ستاروں کے علاوہ وہاں اور کوئی روشنی نہیں تھی۔

خانہ کعبہ کے غلاف پر لکھی ہوئی آیات، سیاہ غلاف پر عجیب طرح سے روشن تھیں۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا اور اس گہرے سکوت کو صرف ایک آواز توڑ رہی تھی۔ اس کی آواز اس کی اپنی آواز... وہ مقام ملتزم کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی نظریں خانہ کعبہ کے دروازے پر تھیں اور وہ سر اٹھائے بلند آواز سے کہنے لگا۔

"لبيك اللهم لبيك ٥ لبيك لاشريك لك لبيك ٥ ان الحمد والنعمنه لك والملك لا شريك لك٥"

(حاضر ہوں میرے اللہ میں حاضر ہوں، حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، بیشک حمد و ثنا تیرے لئے ہے، نعمت تیری ہے، بادشاہی تیری ہے کوئی تیرا شریک نہیں)۔

پوری قوت سے گونجتی ہوئی اس کی آواز خانہ کعبہ کے سکوت کو توڑ رہی تھی۔ اس کی آواز خلا کی وسعتوں تک جا رہی تھی۔

"لبیک اللھم لبیک ."

ننگے پاؤں، نیم برہنہ وہیں کھڑا وہ اپنی آواز پہچان رہا تھا۔

"لبیک لا شریک لک لبیک وہ صرف اس کی آواز تھی۔ ان الحمد والنعمتہ لک والملک۔"

اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو اس کی ٹھوڑی سے نیچے اس کے پیروں کی انگلیوں پر گر رہے تھے۔

"لاشریک لک "

اس کے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے تھے۔

"لبیک اللھم لبیک ... "

اس نے خانہ کعبہ کے غلاف پر کندہ آیات کو یک دم بہت روشن دیکھا۔ اتنا روشن کہ وہ جگمگانے لگی تھیں۔ آسمان پر ستاروں کی روشنی بھی اچانک بڑھ گئی تھی۔ وہ ان آیات کو دیکھ رہا تھا۔ مبہوت سحر زدہ۔ کسی معمول کی طرح، زبان پر ایک ہی جملہ لئے ... اس نے خانہ کعبہ کے دروازے کو بہت آہستہ آہستہ کھلتے دیکھا۔

"لبیک اللھم لبیک "

اس کی آواز اور بلند ہو گئی۔ ایک ورد کی طرح۔ ایک سانس۔ ایک لے۔

"لبیک لا شریک لک لبیک "

اس وقت پہلی بار اس نے اپنی آواز میں کسی اور آواز کو مدغم ہوتے محسوس کیا۔

"ان الحمد والنعمتہ "

اس کی آواز کی طرح وہ آواز بلند نہیں تھی۔ کسی سرگوشی کی طرح تھی۔ کسی گونج کی طرح، مگر وہ پہچان سکتا تھا وہ اس کی آواز کی گونج نہیں تھی۔ وہ کوئی اور آواز تھی۔

"لک والملک "

اس نے پہلی بار خانہ کعبہ میں اپنے علاوہ کسی اور کی موجودگی کو محسوس کیا۔

"لاشریک لک "

خانہ کعبہ کا دروازہ کھل رہا تھا۔

"لبیک اللھم لبیک "

وہ اس نسوانی آواز کو پہچانتا تھا۔

"لبیک لا شریک لک."

وہ اس کے ساتھ وہی الفاظ دہرا رہی تھی۔

"لبیک ان الحمد والنعمتہ"

آواز دائیں طرف نہیں تھی، بائیں طرف تھی۔ کہاں ..... اس کی پشت پر۔ چند قدم کے فاصلے پر۔

"لک والملک لا شریک لک."

اس نے جھک کر اپنے پاؤں پر گرنے والے آنسوؤں کو دیکھا اس کے پاؤں بھیگ چکے تھے۔

اس نے سر اُٹھا کر خانہ کعبہ کے دروازے کو دیکھا۔ دروازہ کھل چکا تھا۔ اندر روشنی تھی۔ وہ دودھیا روشنی۔ اتنی روشنی کہ اس نے بے اختیار گھٹنے ٹیک دیئے۔ وہ اب سجدہ کر رہا تھا، روشنی کم ہو رہی تھی۔ اس نے سجدے سے سر اُٹھایا۔ روشنی اور کم ہو رہی تھی۔

وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ خانہ کعبہ کا دروازہ اب بند ہو رہا تھا۔ روشنی اور کم ہوتی جا رہی تھی اور تب اس نے ایک بار پھر سرگوشی کی صورت میں وہی نسوانی آواز سنی۔

اس بار اس نے مڑ کر دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

سالار کی آنکھ کھل گئی۔ وہ حرم شریف کے ایک برآمدے کے ستون سے سر ٹکائے ہوئے تھا۔ وہ کچھ دیر ستانے کے لئے وہاں بیٹھا تھا مگر نیند نے عجیب انداز میں اس پر غلبہ پایا۔

وہ امامہ تھی۔ بے شک امامہ تھی۔ سفید احرام میں اس کے پیچھے کھڑی۔ اس نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی مگر ایک جھلک بھی اسے یقین دلانے کے لئے کافی تھی کہ وہ امامہ کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ خالی الذہنی کے عالم میں لوگوں کو ادھر سے اُدھر جاتے دیکھ کر بے اختیار اس کا دل بھر آیا۔

آٹھ سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا اسے اس عورت کو دیکھے جسے اس نے آج وہاں حرم شریف میں خواب میں دیکھا تھا کسی زخم کو پھر ادھیڑا گیا تھا۔ اس نے گلاسز اُتار دیئے اور دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ لیا۔

آنکھوں سے ابلتے گرم پانی کو رگڑتے، آنکھوں کو مسلتے اسے خیال آیا۔ یہ حرم شریف تھا۔ یہاں اسے کسی سے آنسو چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں سب آنسو بہانے کے لئے ہی آتے تھے۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا لئے۔ اس پر رقت طاری ہو رہی تھی۔ وہ سر جھکائے بہت دیر وہاں بیٹھا روتا رہا۔

پھر اسے یاد آیا وہ ہر سال وہاں عمرہ کرنے کے لئے آیا کرتا تھا۔ وہ امامہ ہاشم کی طرف سے بھی عمرہ کیا کرتا تھا۔

وہ اس کی عافیت اور لمبی زندگی کے لئے بھی دعا مانگا کرتا تھا۔

وہ امامہ ہاشم کو ہر پریشانی سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی دعا مانگا کرتا تھا۔

اس نے وہاں حرم شریف میں اتنے سالوں میں اپنے اور امامہ کے لئے ہر دعا مانگ چھوڑی تھی جہاں بھر کی دعائیں، مگر اس نے وہاں حرم شریف میں کبھی امامہ کو اپنے لئے نہیں مانگا تھا۔ عجیب بات تھی مگر اس نے وہاں کبھی امامہ کے حصول کے لئے دعا نہیں کی تھی۔ اس کے آنسو یک دم تھم گئے۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وضو کے بعد اس نے عمرے کے لئے احرام باندھا۔ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے اس بار اتفاقاً اسے مقام ملتزم کے پاس جگہ مل گئی۔ وہاں، جہاں اس نے اپنے آپ کو خواب میں کھڑے دیکھا تھا۔

اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے اس نے دعا کرنا شروع کی۔

"یہاں کھڑے ہو کر تجھ سے انبیاء دعا مانگا کرتے تھے۔ ان کی دعاؤں میں اور میری دعا میں بہت فرق ہے۔"

وہ گڑگڑا رہا تھا۔

"میں نبی ہوتا تو نبیوں جیسی دعا کرتا مگر میں تو عام بشر ہوں اور گناہگار بشر۔ میری خواہشات، میری آرزوئیں سب عام ہیں۔ یہاں کھڑے ہو کر کبھی کوئی کسی عورت کے لئے نہیں رویا ہوگا، میری ذلت اور پستی کی اس سے زیادہ انتہا کیا ہو گی کہ میں یہاں کھڑا..... حرم پاک میں کھڑا ایک عورت کے لئے گڑگڑا رہا ہوں مگر مجھے نہ اپنے دل پر اختیار ہے نہ اپنے آنسوؤں پر۔

یہ میں نہیں تھا جس نے اس عورت کو اپنے دل میں جگہ دی، یہ تو نے کیا۔ کیوں میرے دل میں اس عورت کے لئے اتنی محبت ڈال دی کہ میں تیرے سامنے کھڑا بھی اس کو یاد کر رہا ہوں؟ کیوں مجھے اس قدر بے بس کر دیا کہ مجھے اپنے وجود پر بھی کوئی اختیار نہیں رہا؟ میں وہ بشر ہوں جسے تو نے ان تمام کمزوریوں کے ساتھ بنایا۔ میں وہ بشر ہوں جسے تیرے سوا کوئی راستہ دکھانے والا نہیں اور وہ عورت وہ میری زندگی کے ہر راستے پر کھڑی ہے۔ مجھے کہیں جانے کہیں پہنچنے نہیں دے رہی یا تو اس کی محبت کو اس طرح میرے دل سے نکال دے کہ مجھے کبھی اس کا خیال تک نہ آئے یا پھر اسے مجھے دے دے۔ وہ نہیں ملے گی تو میں ساری زندگی اس کے لئے ہی روتا رہوں گا۔ وہ مل جائے گی تو تیرے علاوہ میں کسی کے لئے آنسو نہیں بہا سکوں گا۔ میرے آنسوؤں کو خالص ہونے دے۔

میں یہاں کھڑا تجھ سے پاک عورتوں میں سے ایک کو مانگتا ہوں۔

میں امامہ ہاشم کو مانگتا ہوں۔

میں اپنی نسل کے لئے اس عورت کو مانگتا ہوں، جس نے آپ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی محبت میں کسی کو شریک نہیں کیا۔ جس نے ان کے لئے اپنی زندگی کی تمام آسائشات کو چھوڑ دیا۔

اگر میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی نیکی کی ہے، تو مجھے اس کے عوض امامہ ہاشم دے دے۔ تو چاہے تو یہ اب بھی ہو سکتا ہے۔ اب بھی ممکن ہے۔

مجھے اس آزمائش سے نکال دے۔ میری زندگی کو آسان کر دے۔

آٹھ سال سے میں جس تکلیف میں ہوں مجھے اس سے رہائی دے دے۔

سالار سکندر پر ایک بار پھر رحم کر، وہی جو تیری صفات میں افضل ترین ہے۔

وہ سر جھکائے وہاں بلک رہا تھا اسی جگہ پر جہاں اس نے خود کو خواب میں دیکھا تھا مگر اس بار اس کی پشت پر امامہ ہاشم نہیں تھی۔

بہت دیر تک وہاں گڑگڑانے کے بعد وہ وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ آسمان پر ستاروں کی روشنی اب بھی مدھم تھی۔ خانہ کعبہ روشنیوں سے اب بھی بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ لوگوں کا ہجوم رات کے اس پہر بھی اسی طرح تھا۔ خواب کی طرح خانہ کعبہ کا دروازہ بھی نہیں کھلا تھا۔ اس کے باوجود وہاں سے ہٹتے ہوئے سالار سکندر کو اپنے اندر سکون اترتا محسوس ہوا تھا۔

وہ اس کیفیت سے باہر آ رہا تھا جس میں وہ پچھلے ایک ماہ سے تھا۔ ایک عجیب سا قرار تھا جو اس دعا کے بعد اسے ملا تھا اور وہ اسی قرار اور طمانیت کو لئے ہوئے ایک ہفتہ کے بعد پاکستان لوٹ آیا تھا۔

☆ — ☆ ...... ☆

"میں اگلے سال پی ایچ ڈی کے لئے امریکہ جا رہا ہوں۔"

فرقان نے بے اختیار چونک کر سالار کو دیکھا۔

"کیا مطلب ..؟" سالار حیرانی سے مسکرایا۔

"کیا مطلب کا کیا مطلب؟ میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہوں۔"

"یوں اچانک ..!"

"اچانک تو نہیں۔ پی ایچ ڈی کرنی تو تھی مجھے۔ بہتر ہے ابھی کر لوں۔" سالار اطمینان سے بتا رہا تھا۔

وہ دونوں فرقان کے گاؤں سے واپس آ رہے تھے۔ فرقان ڈرائیو کر رہا تھا جب سالار نے اچانک اسے اپنی پی ایچ ڈی کے ارادے کے بارے میں بتایا۔

"میں نے بینک کو بتا دیا ہے، میں نے ریزائن کرنے کا سوچا ہے، لیکن وہ مجھے چھٹی دینا چاہ رہے ہیں۔ ابھی میں نے سوچا نہیں ہے کہ ان کی اس آفر کو قبول کر لوں یا پھر ریزائن کر دوں۔"

"تم ساری پلاننگ کئے بیٹھے ہو۔"

"ہاں یار ..... میں مذاق نہیں کر رہا میں واقعی اگلے سال پی ایچ ڈی کے لئے جا رہا ہوں۔"

"چند ماہ پہلے تک تو تمہارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

"ارادے کا کیا ہے، وہ تو ایک دن میں بن جاتا ہے۔"

سالار نے کندھے جھٹکتے ہوئے کھڑکی کے شیشے سے باہر نظر آنے والے کھیتوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں ویسے بھی بینکنگ سے متعلق ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں مگر یہاں میں پچھلے کچھ سالوں میں اتنا مصروف رہا ہوں کہ اس پر کام نہیں کر سکا۔ میں چاہتا ہوں پی ایچ ڈی کے دوران میں یہ کتاب لکھ کر شائع بھی کروا دوں۔ میرے پاس کچھ فرصت ہوگی تو میں یہ کام آسانی سے کر لوں گا۔"

فرقان کچھ دیر خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتا رہا پھر اس نے کہا۔

"اور اسکول اس کا کیا ہوگا؟"

"اس کا کچھ نہیں ہوگا۔ یہ ایسے ہی چلتا رہے گا۔ اس کا انفراسٹرکچر بھی بہتر ہوتا جائے گا۔ بورڈ آف گورنرز ہے، وہ لوگ آتے جاتے رہیں گے۔ تم ہو میں نے پاپا سے بھی بات کی ہے وہ بھی آیا کریں گے یہاں پر میرے نہ ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ یہ اسکول بہت پہلے سالار سکندر کی بیساکھیاں چھوڑ چکا ہے۔ آئندہ بھی اسے ان کی ضرورت نہیں پڑے گی مگر میں مکمل طور پر اس سے قطع تعلق نہیں کر رہا ہوں۔ میں اس کو دیکھتا رہوں گا۔ کبھی میری مدد کی ضرورت پڑی تو آجایا کروں گا۔ پہلے بھی تو ایسا ہی کیا کرتا تھا۔"

وہ اب تھرمس میں سے چائے کپ میں ڈال رہا تھا۔

"پی ایچ ڈی کے بعد کیا کرو گے؟" فرقان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"واپس آؤں گا۔ پہلے کی طرح یہیں پر کام کروں گا۔ ہمیشہ کے لئے نہیں جا رہا ہوں۔"

سالار نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے کو تھپکا۔

"کیا چند سال بعد نہیں جا سکتے تم؟"

"نہیں، جو کام آج ہونا چاہئے اسے آج ہی ہونا چاہئے۔ میرا موڈ ہے آگے پڑھنے کا۔ چند سال بعد شاید خواہش نہ رہے۔"

سالار نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے کہا وہ اب بائیں ہاتھ سے ریڈیو کو ٹیون کرنے میں مصروف تھا۔

"روٹری (Rotary) کلب والے اگلے ویک اینڈ پر ایک فنکشن کر رہے ہیں۔ میرے پاس انویٹیشن آیا ہے۔ چلو گے؟"

اس نے ریڈیو کو ٹیون کرتے ہوئے فرقان سے پوچھا۔

"کیوں نہیں، چلوں گا۔ ان کے پروگرام دلچسپ ہوتے ہیں۔"

فرقان نے جواباً کہا۔ گفتگو کا موضوع بدل چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس دن اتوار تھا۔ سالار صبح دیر سے اُٹھا۔

اخبار لے کر سرخیوں پر نظر دوڑاتے ہوئے وہ کچن میں ناشتہ تیار کرنے لگا۔ اس نے صرف منہ ہاتھ دھویا تھا۔ شیو نہیں کی۔ نائٹ ڈریس کے اوپر ہی اس نے ایک ڈھیلا ڈھالا سویٹر پہن لیا اس نے کیتلی میں چائے کا پانی ابھی رکھا ہی تھا جب ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ وہ اخبار ہاتھ میں پکڑے کچن سے باہر آ گیا، دروازہ کھولنے پر اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا جب اس نے سعیدہ اماں کو وہاں کھڑا پایا۔ سالار نے دروازہ کھول دیا۔

"السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟"

اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے اس نے کہا۔

"اللہ کا شکر ہے میں بالکل ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو؟"

انہوں نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ اس کے سر پر اپنے دونوں ہاتھ پھیرے۔

"میں بھی ٹھیک ہوں، آپ اندر آئیں۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک لگ تو نہیں رہے ہو۔ کمزور ہو گئے ہو، چہرہ بھی کالا ہو رہا ہے۔" انہوں نے اپنی عینک کے شیشوں کے پیچھے سے اس کے چہرے پر غور کیا۔

"رنگ کالا نہیں ہوا۔ میں نے شیو نہیں کی۔" سالار نے بے اختیار اپنی مسکراہٹ روکی۔ وہ ان کے ساتھ چلتا ہوا اندر آ گیا۔

"تو بھلا شیو کیوں نہیں کی۔ اچھا داڑھی رکھنا چاہتے ہو بہت اچھی بات ہے۔ نیکی کا کام ہے۔ بہت اچھا کر رہے ہو۔"

وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"نہیں اماں! داڑھی نہیں رکھ رہا ہوں۔ آج اتوار ہے۔ دیر سے اُٹھا ہوں کچھ دیر پہلے ہی، اس لئے شیو نہیں کی۔" وہ ان کی بات پر محظوظ ہوا۔

"دیر سے کیوں اُٹھے ہو بیٹا! دیر سے نہ اُٹھا کرو۔ صبح جلدی اٹھ کر فجر کی نماز پڑھا کرو۔ چہرے پر رونق آتی ہے۔ اسی لئے تو تمہارا چہرہ مرجھایا ہوا ہے۔ صبح نماز پڑھ کر بندہ قرآن پڑھے پھر سیر

کو چاہا جائے۔ صحت بھی ٹھیک رہتی ہے اور اللہ بھی خوش ہوتا ہے۔"

سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔

"میں نماز پڑھ کر سویا تھا۔ صرف اتوار والے دن ہی دیر تک سوتا ہوں۔ ورنہ روز صبح وہی کرتا ہوں جو آپ کہہ رہی ہیں۔"

وہ اس کی وضاحت پر بے حد خوش نظر آنے لگیں۔

"بہت اچھی بات ہے ..... اسی لئے تو تمہارا چہرہ چمک رہا ہے۔ رونق نظر آرہی ہے۔"

انہوں نے اپنے بیان میں ایک بار پھر تبدیلی کی۔

"آپ کیا لیں گی؟"

وہ اپنے چہرے پر کوئی تبصرہ نہیں سننا چاہتا تھا اس لئے اس نے موضوع بدلا۔

"ناشتا کریں گی؟"

"نہیں، میں ناشتا کر کے آئی ہوں۔ صبح چھ سات بجے میں ناشتا کر لیتی ہوں۔ گیارہ ساڑھے گیارہ تو میں دوپہر کا کھانا بھی کھا لیتی ہوں۔"

انہوں نے اپنے معمولات سے آگاہ کیا۔

"تو پھر دوپہر کا کھانا کھا لیں۔ ساڑھے دس تو ہو رہے ہیں۔"

"نہیں ابھی تو مجھے بھوک ہی نہیں ہے۔ تم میرے پاس آ کر بیٹھو۔"

"میں آتا ہوں ابھی۔"

وہ ان کے انکار کے باوجود کچن میں آ گیا۔

"پورے چھ ہفتے سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ تم نے ایک بار بھی شکل نہیں دکھائی۔ حالانکہ وعدہ کیا تھا تم نے۔"

اسے کچن میں ان کی آواز سنائی دی۔

"میں بہت مصروف تھا اماں جی۔"

اس نے اپنے لئے چائے تیار کرتے ہوئے کہا۔

"لو ایسی بھی کیا مصروفیت ارے بچے! مصروف وہ ہوتے ہیں، جن کے بیوی بچے ہوتے ہیں نہ تم نے گھر بسایا، نہ تم گھر والوں کے ساتھ رہ رہے ہو — پھر بھی کہتے ہو مصروف تھا ....."

وہ فریزر سے سامان نکالتے ہوئے ان کی بات پر مسکرایا۔

"اب یہی دیکھو، یہ تمہارے کرنے کے کام تو نہیں ہیں۔"

وہ اسے چائے کی ٹرے لاتے دیکھ کر خفگی سے بولیں۔

"میں تو کہتی ہوں یہ کام مرد کے کرنے والے ہی نہیں ہیں۔"

وہ کچھ کہے بغیر مسکراتے ہوئے میز پر برتن رکھنے لگا۔

"اب دیکھو بیوی ہوتی تو یہ کام بیوی کر رہی ہوتی۔ مرد اچھا لگتا ہی نہیں ایسے کام کرتے ہوئے۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں اماں جی! مگر اب مجبوری ہے۔ اب بیوی نہیں ہے تو کیا کیا جا سکتا ہے۔"

سالار نے چائے کا کپ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ انہیں اس کی بات پر جھٹکا لگا۔

"یہ کیا بات ہوئی، کیا کیا جا سکتا ہے؟ ارے بچے اونیا لڑکیوں سے بھری ہوئی ہے۔ تمہارے تو اپنے ماں باپ بھی ہیں۔ ان سے کہو .... تمہارا رشتہ طے کریں۔ یا تم چاہو تو میں کوشش کروں۔"

سالار کو یک دم صورت حال کی سنگینی کا احساس ہونے لگا۔

"نہیں، نہیں اماں جی! آپ چائے پئیں میں بہت خوش ہوں، اپنی زندگی سے — جہاں تک گھر کے کاموں کا تعلق ہے تو وہ تو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی کر لیا کرتے تھے۔"

"لو، اب تم کہیں سے کہاں پہنچ گئے۔ میں تو تمہاری بات کر رہی ہوں۔" وہ کچھ گڑبڑا گئیں۔

"آپ یہ بسکٹ لیں اور کیک بھی...."

سالار نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"ارے ہاں، جس کام کے لئے میں آئی ہوں وہ تو بھول ہی گئی۔"

"انہیں اچانک یاد آیا، اپنے ہاتھ میں پکڑا بڑا سا بیگ انہوں نے کھول کر اندر کچھ تلاش کرنا شروع کر دیا۔

"تمہاری بہن کی شادی طے ہو گئی ہے۔"

سالار کو چائے پیتے بے اختیار اچھو لگا۔

"میری بہن کی ..... اماں جی! میری بہن کی شادی تو پانچ سال پہلے ہو گئی تھی۔"

اس نے کچھ ہکا بکا ہوتے ہوئے بتایا۔ وہ اتنی دیر میں اپنے بیگ سے ایک کارڈ برآمد کر چکی تھیں۔

"ارے میں اپنی بیٹی کی بات کر رہی تھی۔ آمنہ کی، تمہاری بہن ہی ہوئی نا ...."

انہوں نے اس کے جملے پر بڑے افسوس کے عالم میں اسے دیکھتے ہوئے کارڈ تھمایا۔

سالار کو بے اختیار ہنسی آ گئی کل تک وہ اسے اس کی بیوی بنانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں اور اب یک دم بہن بنا دیا، مگر اس کے باوجود سالار کو بے تحاشا اطمینان محسوس ہوا۔ کم از کم اب اسے ان سے یا ان کی بیٹی سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔

بہت مسرور سا ہو کر اس نے کارڈ پکڑ لیا۔

"بہت مبارک ہو.... کب ہو رہی ہے شادی؟" اس نے کارڈ کھولتے ہوئے کہا۔

کو چلا جائے۔ صحت بھی ٹھیک رہتی ہے اور اللہ بھی خوش ہوتا ہے۔"

سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔

"میں نماز پڑھ کر سویا تھا۔ صرف اتوار والے دن ہی دیر تک سوتا ہوں۔ ورنہ روز صبح وہی کرتا ہوں جو آپ کہہ رہی ہیں۔"

وہ اس کی وضاحت پر بے حد خوش نظر آنے لگیں۔

"بہت اچھی بات ہے ..... اسی لئے تو تمہارا چہرہ چمک رہا ہے۔ رونق نظر آرہی ہے۔"

انہوں نے اپنے بیان میں ایک بار پھر تبدیلی کی۔

"آپ کیا لیں گی؟"

وہ اپنے چہرے پر کوئی تبصرہ نہیں سننا چاہتا تھا اس لئے اس نے موضوع بدلا۔

"ناشتا کریں گی؟"

"نہیں، میں ناشتا کر کے آئی ہوں۔ صبح چھ سات بجے میں ناشتا کر لیتی ہوں۔ گیارہ ساڑھے گیارہ تو میں دوپہر کا کھانا بھی کھا لیتی ہوں۔"

انہوں نے اپنے معمولات سے آگاہ کیا۔

"تو پھر دوپہر کا کھانا کھا لیں۔ ساڑھے دس تو ہو رہے ہیں۔"

"نہیں ابھی تو مجھے بھوک ہی نہیں ہے۔ تم میرے پاس آ کر بیٹھو۔"

"میں آتا ہوں ابھی۔"

وہ ان کے انکار کے باوجود کچن میں آ گیا۔

"پورے چھ ماہ سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ تم نے ایک بار بھی شکل نہیں دکھائی۔ حالانکہ وعدہ کیا تھا تم نے۔"

اسے کچن میں ان کی آواز سنائی دی۔

"میں بہت مصروف تھا اماں جی۔"

اس نے اپنے لئے چائے تیار کرتے ہوئے کہا۔

"لو ایسی بھی کیا مصروفیت ارے بچے! مصروف وہ ہوتے ہیں، جن کے بیوی بچے ہوتے ہیں نہ تم نے گھر بسایا، نہ تم گھر والوں کے ساتھ رہ رہے ہو — پھر بھی کہتے ہو مصروف تھا....."

وہ فریزر سے سنیکس نکالتے ہوئے ان کی بات پر مسکرایا۔

"اب یہاں دیکھو، یہ تمہارے کرنے کے کام تو نہیں ہیں۔"

وہ اسے چائے کی ٹرے لاتے دیکھ کر خفگی سے بولیں۔

"میں تو کہتی ہوں یہ کام مرد کے کرنے والے ہی نہیں ہیں۔"

وہ کچھ کہے بغیر مسکراتے ہوئے میز پر برتن رکھنے لگا۔

"اب دیکھو بیوی ہوتی تو یہ کام بیوی کر رہی ہوتی۔ مرد اچھا لگتا ہی نہیں ایسے کام کرتے ہوئے۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں اماں جی! مگر اب مجبوری ہے۔ اب بیوی نہیں ہے تو کیا کیا جا سکتا ہے۔"

سالار نے چائے کا کپ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ انہیں اس کی بات پر جھٹکا لگا۔

"یہ کیا بات ہوئی، کیا کیا جا سکتا ہے؟ ارے بچے! دنیا لڑکیوں سے بھری ہوئی ہے۔ تمہارے تو اپنے ماں باپ بھی ہیں۔ ان سے کہو ..... تمہارا رشتہ طے کریں۔ یا تم چاہو تو میں کوشش کروں۔"

سالار کو یک دم صورت حال کی سنگینی کا احساس ہونے لگا۔

"نہیں، نہیں اماں جی! آپ چائے پئیں میں بہت خوش ہوں، اپنی زندگی سے — جہاں تک گھر کے کاموں کا تعلق ہے تو وہ تو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی کر لیا کرتے تھے۔"

"لو، اب تم کہیں سے کہاں پہنچ گئے۔ میں تو تمہاری بات کر رہی ہوں۔" وہ کچھ گڑبڑا گئیں۔

"آپ یہ بسکٹ لیں اور کیک بھی...."

سالار نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"ارے ہاں، جس کام کے لئے میں آئی ہوں وہ تو بھول ہی گئی۔"

"انہیں اچانک یاد آیا، اپنے ہاتھ میں پکڑا بڑا سا بیگ انہوں نے کھول کر اندر کچھ تلاش کرنا شروع کر دیا۔

"تمہاری بہن کی شادی طے ہو گئی ہے۔"

سالار کو چائے پیتے بے اختیار اچھو لگا۔

"میری بہن کی..... اماں جی! میری بہن کی شادی تو پانچ سال پہلے ہو گئی تھی۔"

اس نے کچھ ہکا بکا ہوتے ہوئے بتایا۔ وہ اتنی دیر میں اپنے بیگ سے ایک کارڈ برآمد کر چکی تھیں۔

"ارے میں اپنی بیٹی کی بات کر رہی تھی۔ آمنہ کی، تمہاری بہن ہی ہوئی نا ...."

انہوں نے اس کے جملے پر بڑے افسوس کے عالم میں اسے دیکھتے ہوئے کارڈ تھمایا۔

سالار کو بے اختیار ہنسی آئی کل تک وہ اسے اس کی بیوی بنانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں اور اب یک دم بہن بنا دیا، مگر اس کے باوجود سالار کو بے تحاشا اطمینان محسوس ہوا۔ کم از کم اب اسے ان سے یا ان کی بیٹی سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔

بہت مسرور سا ہو کر اس نے کارڈ پکڑ لیا۔

"بہت مبارک ہو.... کب ہو رہی ہے شادی؟" اس نے کارڈ کھولتے ہوئے کہا۔

"اگلے ہفتے......"

"چلیں اماں جی! آپ کی فکر تو ختم ہو گئی۔"

سالار نے "میری" کے بجائے "آپ کی" کا لفظ استعمال کیا۔

"ہاں اللہ کا شکر ہے، بہت اچھی جگہ رشتہ ہو گیا۔ میری ذمہ داری ختم ہو جائے گی پھر میں بھی اپنے بیٹوں کے پاس انگلینڈ چلی جاؤں گی۔"

سالار نے کارڈ پر ایک سرسری سی نظر دوڑائی۔

"یہ کارڈ تمہیں دینے خاص طور پر آئی ہوں اس بار کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔ تمہیں شادی پر آنا ہے، بھائی بن کر رخصت کرنا ہے بہن کو۔"

سالار نے اپنی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے چائے کا کپ لیا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں ضرور آؤں گا۔"

وہ کپ نیچے رکھ کر سلائس پر مکھن لگانے لگا۔

"یہ فرقان کا کارڈ بھی لے کر آئی ہوں میں ... اس کو بھی دینے جانا ہے۔"

انہیں اب فرقان کی یاد ستانے لگی۔

"فرقان کو تو آج بھابھی کے ساتھ اپنے سسرال جانا تھا۔ اب تک تو نکل چکا ہو گا۔ آپ مجھے دے دیں۔ میں اسے دے دوں گا۔" سالار نے کہا۔

"تم اگر بھول گئے تو؟" وہ مطمئن نہیں ہوئیں۔

"میں نہیں بھولوں گا، اچھا میں فون پر اس سے آپ کی بات کروا دیتا ہوں۔"

وہ یک دم خوش ہوئیں۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ تم فون پر اس سے میری بات کروا دو۔"

سالار اٹھ کر فون اسی میز پر لے آیا۔ فرقان کا موبائل نمبر ڈائل کر کے اس نے اسپیکر آن کر دیا اور خود ناشتہ کرنے لگا۔

"فرقان! سعیدہ اماں آئی ہوئی ہیں میرے پاس۔"

فرقان کے کال ریسیو کرنے پر اس نے بتایا۔

"ان سے بات کرو۔"

وہ خاموش ہو گیا، اب فرقان اور سعیدہ اماں کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔

دس منٹ بعد جب یہ گفتگو ختم ہوئی تو سالار ناشتہ ختم کر چکا تھا۔ برتن کچن میں رکھتے ہوئے اسے خیال آیا۔

"آئی کس کے ساتھ تھیں آپ؟" وہ باہر نکل آیا۔

"اپنے بیٹے کے ساتھ" سعیدہ اماں نے اطمینان سے کہا۔

"اچھا، بیٹا آگیا آپ کا؟ چھوٹا والا یا بڑا والا؟"

سالار نے دلچسپی لی۔

"میں ساتھ والوں کے راشد کی بات کر رہی ہوں۔" سعیدہ اماں نے بے اختیار برا مانا۔

سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا سعیدہ اماں کے لئے ہر لڑکا اپنا بیٹا اور ہر لڑکی اپنی بیٹی تھی۔ وہ بڑے آرام سے رشتے گھڑ لیتی تھیں۔

"تو وہ کہاں ہے؟" سالار نے پوچھا۔

"وہ چلا گیا۔ موٹر سائیکل پر آئی ہوں اس کے ساتھ، آندھی کی رفتار سے چلائی ہے اس نے۔ نو بجے بیٹھی ہوں، پورے ساڑھے دس بجے ادھر پہنچا دیا اس نے، میری ایک نہیں سنی اس نے۔ سارا راستہ -- بار بار یہی کہتا رہا آہستہ چلا رہا ہوں۔ یہاں اتارتے وقت کہنے لگا آپ کے ساتھ موٹر سائیکل پر میرا آخری سفر تھا۔ دوبارہ کہیں جانا ہوا تو پیدل لے کر جاؤں گا آپ کو ...."

سالار کو ہنسی آئی۔ آدھ گھنٹہ میں طے ہونے والے راستے کو ڈیڑھ گھنٹہ میں طے کرنے والے کی جھنجلاہٹ کا وہ اندازہ کر سکتا تھا۔ بوڑھوں کے ساتھ وقت گزارنا خاصا مشکل کام تھا۔ یہ وہ سعیدہ اماں کے ساتھ ہونے والی پہلی ملاقات میں ہی جان گیا تھا۔

"تو واپس کیسے جائیں گی۔ راشد لینے آئے گا آپ کو؟"

"ہاں اس نے کہا تو ہے کہ میچ ختم ہونے کے بعد آپ کو لے جاؤں گا۔ اب دیکھو کب آتا ہے۔"

وہ اسے ایک بار پھر اپنی بیٹی اور اس کے ہونے والے سسرال کے بارے میں اطلاعات پہنچانے لگیں۔

وہ مسکراتے ہوئے بڑی فرمانبرداری سے سنتا رہا۔

اس قسم کی معلومات میں اسے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی مگر سعیدہ اماں اب اس کے ساتھ بینکنگ کے بارے میں تو گفتگو نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کی باتیں رتی بھر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں مگر وہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ ہر بات سمجھ رہا ہے۔

دوپہر کا کھانا اس نے ان کے ساتھ کھایا۔ اس نے ان کے سامنے فریزر سے کچھ نکال کر گرم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ایک بار پھر شادی کے فوائد اور ضرورت پر لیکچر نہیں سننا چاہتا تھا۔ اس نے ایک ریسٹورنٹ فون کر کے لنچ کا آرڈر دیا۔ ایک گھنٹے کے بعد کھانا آگیا۔

کھانے کے وقت تک راشد نہیں آیا تو سالار نے ان کی تشویش کو کم کرنے کے لئے کہا۔

"میں گاڑی پر چھوڑ آتا ہوں آپ کو۔"

وہ فوراً تیار ہو گئیں۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے، اس طرح تم میرا گھر بھی دیکھ لو گے۔"

"اماں جی! میں آپ کا گھر جانتا ہوں۔"

سالار نے کار کی چابی تلاش کرتے ہوئے انہیں یاد دلایا۔

آدھ گھنٹہ کے بعد وہ اس گلی میں تھا جہاں سعیدہ اماں کا گھر تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر انہیں اندر گلی میں دروازے تک چھوڑ گیا۔ انہوں نے اسے اندر آنے کی دعوت دی، جسے اس نے شکریہ کے ساتھ رد کر دیا۔

"آج نہیں...... آج بہت کام ہیں۔"

وہ اپنی بات کہہ کر پچھتایا۔

"بیٹے! اسی لئے کہتی ہوں شادی کر لو۔ بیوی ہو گی تو خود سارے کام دیکھے گی۔ تم کہیں آ جا سکو گے۔ اب یہ کوئی زندگی ہے کہ چھٹی کے دن بھی گھر کے کام لے کر بیٹھے رہو گے۔" انہوں نے افسوس بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"جی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اب میں جاؤں؟"

اس نے کمال فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"ہاں ٹھیک ہے جاؤ، مگر یاد رکھنا شادی پر ضرور آنا۔ فرقان سے بھی ایک بار پھر کہہ دینا کہ وہ بھی آئے اور اس کو کارڈ ضرور پہنچا دینا۔"

سالار نے ان کے دروازے پر لگی ہوئی ڈور بیل دوبارہ بجائی اور خدا حافظ کہتے ہوئے پلٹا۔

اپنے پیچھے اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ سعیدہ اماں اب اپنی بیٹی سے کچھ کہہ رہی تھیں۔

باب ۸

"پھر کیا پروگرام ہے، چلو گے؟"

فرقان نے اگلے دن شام کو اس سے کارڈ لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں، میں تو اس ویک اینڈ پر کراچی جا رہا ہوں، آئی بی اے کے ایک سیمینار کے لئے۔ اتوار کو میری واپسی ہو گی۔ میں تو آ کر بس سوؤں گا۔

nothing else۔ تم چلے جانا، میں لفافہ دے دوں گا، وہ تم میری طرف سے معذرت کرتے ہوئے دے دینا۔" سالار نے کہا۔

"کتنے افسوس کی بات ہے سالار! وہ خود کارڈ دے کر گئی ہیں، اتنی محبت سے بلایا ہے۔"

فرقان نے کہا۔

"جانتا ہوں لیکن میں ادھر جا کر وقت ضائع نہیں کر سکتا۔"

"ہم بس تھوڑی دیر بیٹھیں گے پھر آجائیں گے۔"

"فرقان! میری واپسی کنفرم نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے میں اتوار کو آہی نہ سکوں یا اتوار کی رات کو آؤں۔"

"بے حد فضول آدمی ہو تم! وہ بڑی مایوس ہوں گی۔"

"کچھ نہیں ہوگا، میرے نہ ہونے سے ان کی بیٹی کی شادی تو نہیں رُک جائے گی۔ ہوسکتا ہے انہیں پہلے ہی میرے نہ آنے کا اندازہ ہو اور ویسے بھی فرقان! تم اور میں کوئی اتنے اہم مہمان نہیں ہیں۔" سالار نے لاپروائی سے کہا۔

"بہرحال میں اور میری بیوی تو جائیں گے۔ چاہے ہم کم اہم مہمان ہی کیوں نہ ہوں۔" فرقان نے ناراضی سے کہا۔

"میں نے کب روکا ہے۔ ضرور جاؤ، تمہیں جانا بھی چاہئے۔ سعیدہ اماں کے ساتھ تمہاری بہت زیادہ بے تکلفی اور دوستی ہے۔" سالار نے کہا۔

"مگر سعیدہ اماں کو میرے بجائے تمہارا زیادہ خیال رہتا ہے۔" فرقان نے جتایا۔

"وہ مروت ہوتی ہے۔" سالار نے اس کی بات کو سنجیدگی سے لئے بغیر کہا۔

"جو بھی ہوتا ہے بہرحال تمہارا خیال تو ہوتا ہے انہیں۔ چلو اور کچھ نہیں تو ڈاکٹر سبط علی کی عزیزہ سمجھ کر ہی تم ان کے ہاں چلے جاؤ۔" فرقان نے ایک اور حربہ آزمایا۔

"ڈاکٹر صاحب تو خود یہاں نہیں ہیں۔ وہ تو خود شادی میں شرکت نہیں کر رہے اور اگر وہ یہاں ہوتے بھی تو کم از کم مجھے تمہاری طرح مجبور نہیں کرتے۔"

"اچھا، میں بھی نہیں کرتا تمہیں مجبور۔ نہیں جانا چاہتے تو مت جاؤ۔"

فرقان نے کہا۔

سالار ایک بار پھر اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروف ہو چکا تھا۔

☆...☆☆

وہ ایک سرسبز و وسیع سبزہ زار تھا جہاں وہ دونوں موجود تھے۔ وسیع کھلے سبزہ زار میں درخت تھے مگر زیادہ بلند نہیں۔ خوب صورت پھولدار جھاڑیاں تھیں، چاروں طرف خاموشی تھی۔ وہ دونوں کسی درخت کے سائے میں بیٹھنے کے بجائے ایک پھولدار جھاڑی کے قریب کھلی دھوپ میں بیٹھے تھے۔ امامہ اپنے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے ہوئے بیٹھی تھی اور وہ گھاس پر چت لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ان دونوں کے جوتے کچھ فاصلے پر پڑے ہوئے تھے۔ امامہ نے اس بار خوب صورت سفید چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔ امامہ اس سے کچھ کہتے ہوئے دور کسی چیز کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے اس کی چادر کے ایک پلو سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ یوں جیسے دھوپ کی

شعاعوں سے آنکھوں کو بچانا چاہتا ہو۔ اس کی چادر نے اسے عجیب سا سکون اور سرشاری دی تھی۔ امامہ نے چادر کے سرے کو اس کے چہرے سے ہٹانے یا کھینچنے کی کوشش نہیں کی۔ دھوپ اس کے جسم کو تراوٹ بخش رہی تھی۔ آنکھیں بند کئے وہ اپنے چہرے پر موجود چادر کے لمس کو محسوس کر رہا تھا۔ اس پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ وہ نیند اسے اپنی گرفت میں لے رہی تھی۔

سالار نے یک دم آنکھیں کھول دیں۔ وہ اپنے بیڈ پر چت لیٹا ہوا تھا۔ کسی چیز نے اس کی نیند کو توڑ دیا تھا۔ وہ آنکھیں کھولے کچھ دیر بے یقینی سے اپنے اردگرد کے ماحول کو دیکھتا رہا۔ یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں اسے ہونا چاہئے تھا۔ ایک اور خواب   ایک اور الوژن   اس نے آنکھیں بند کر لیں اور تب اس کو اس موبائل فون کی آواز نے متوجہ کیا، جو مسلسل اس کے سرہانے بج رہا تھا۔ یہ فون ہی تھا جو اسے اس خواب سے باہر لے آیا تھا۔ قدرے جھنجھلاتے ہوئے اس نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر اس نے موبائل اٹھایا۔ دوسری طرف فرقان تھا۔

"کہاں تھے سالار! کب سے فون کر رہا ہوں۔ اٹینڈ کیوں نہیں کر رہے تھے؟" فرقان نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔

"میں سو رہا تھا۔" سالار نے کہا اور اُٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظر اب پہلی بار گھڑی پر پڑی جو چار بجا رہی تھی۔

"تم فوراً سعیدہ اماں کے ہاں چلے آؤ۔" دوسری طرف سے فرقان نے کہا۔

"کیوں؟ میں نے تمہیں بتایا تھا، میں تو .."

فرقان نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں جانتا ہوں، تم نے مجھے کیا بتایا تھا مگر یہاں کچھ ایمرجنسی ہوگئی ہے۔"

"کیسی ایمرجنسی؟" سالار کو تشویش ہوئی۔

"تم یہاں آؤ گے تو پتا چل جائے گا۔ تم فوراً یہاں پہنچو، میں فون بند کر رہا ہوں۔"

فرقان نے فون بند کر دیا۔

سالار کچھ پریشانی کے عالم میں فون کو دیکھتا رہا۔ فرقان کی آواز سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پریشان تھا مگر سعیدہ اماں کے ہاں پریشانی کی نوعیت کیا ہو سکتی تھی۔

پندرہ منٹ میں کپڑے تبدیل کرنے کے بعد گاڑی میں تھا۔ فرقان کی اگلی کال اس نے کار میں ریسیو کی تھی۔

"تم کچھ بتاؤ تو سہی، ہوا کیا ہے؟ مجھے پریشان کر دیا ہے تم نے۔" سالار نے اس سے کہا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، تم ادھر ہی آرہے ہو۔ یہاں آؤ گے تو تمہیں پتا چل جائے

گا۔ میں فون پر تفصیلی بات نہیں کر سکتا۔"

فرقان نے ایک بار پھر فون بند کر دیا۔

تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے آدھ گھنٹہ کا سفر تقریباً پندرہ منٹ میں طے کیا تھا۔ فرقان اسے سعیدہ اماں کے گھر کے باہر ہی مل گیا۔ سالار کا خیال تھا کہ سعیدہ اماں کے ہاں اس وقت بہت چہل پہل ہو گی مگر ایسا نہیں تھا۔ وہاں دور دور تک کسی بارات کے آثار نہیں تھے۔ فرقان کے ساتھ وہ بیرونی دروازے کے بائیں طرف بنے ہوئے ایک پرانی طرز کے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

"آخر ہوا کیا ہے جو تمہیں مجھے اس طرح بلانا پڑ گیا۔"

سالار اب اُلجھ رہا تھا۔

"سعیدہ اماں اور ان کی بیٹی کے ساتھ ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔" فرقان نے اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

"کیسا مسئلہ؟"

"جس لڑکے سے ان کی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی اس لڑکے نے کہیں اور اپنی مرضی سے شادی کر لی ہے۔"

"مائی گڈنیس۔" سالار کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ان لوگوں نے ابھی کچھ دیر پہلے سعیدہ اماں کو یہ سب فون پر بتا کر ان سے معذرت کی ہے۔ وہ لوگ اب بارات نہیں لا رہے۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے ان لوگوں کے ہاں گیا ہوا تھا، مگر وہ لوگ واقعی مجبور ہیں۔ انہیں اپنے بیٹے کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے، اس لڑکے نے بھی انہیں صرف فون پر ہی اس کی اطلاع دی ہے۔" فرقان تفصیل بتانے لگا۔

"اگر وہ لڑکا شادی نہیں کرنا چاہتا تھا تو اسے بہت پہلے ہی ماں باپ کو صاف صاف بتا دینا چاہئے تھا۔ بھاگ کر شادی کر لینے کی ہمت تھی تو ماں باپ کو پہلے اس شادی سے انکار کر دینے کی بھی ہمت ہونی چاہئے تھی۔" سالار نے ناپسندیدگی سے کہا۔

"سعیدہ اماں کے بیٹوں کو اس وقت یہاں ہونا چاہئے تھا، وہ اس معاملے کو ہینڈل کر سکتے تھے۔"

"لیکن اب وہ نہیں ہیں تو کسی نہ کسی کو تو سب کچھ دیکھنا ہے۔"

"سعیدہ اماں کے کوئی اور قریبی رشتہ دار نہیں ہیں؟" سالار نے پوچھا۔

"میں نے ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر سبط علی صاحب سے بات کی ہے فون پر۔" فرقان نے اسے بتایا۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب بھی فوری طور پر تو کچھ نہیں کر سکیں گے۔ یہاں ہوتے تو اور بات تھی۔" سالار نے کہا۔

"انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہاری فون پر ان سے بات کرواؤں۔" فرقان کی آواز اس بار کچھ دھیمی تھی۔

"میری بات ... لیکن کس لئے؟" سالار کچھ حیران ہوا۔

"ان کا خیال ہے کہ اس وقت تم سعیدہ اماں کی مدد کر سکتے ہو۔"

"میں؟" سالار نے چونک کر کہا۔ "میں کس طرح مدد کر سکتا ہوں؟"

"آمنہ سے شادی کر کے۔"

سالار دم بخود پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" اس نے بمشکل فرقان سے کہا۔

"ہاں، بالکل ٹھیک ہے۔" سالار کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"پھر تمہیں پتا نہیں ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ فرقان برق رفتاری سے اُٹھ کر اس کے راستے میں حائل ہو گیا۔

"کیا سوچ کر تم نے یہ بات کہی ہے۔" سالار اپنی آواز پر قابو نہیں رکھ سکا۔

"میں نے یہ سب تم سے ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر کہا ہے۔" سالار کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

"تم نے انہیں میرا نام کیوں دیا؟"

"میں نے نہیں دیا سالار! انہوں نے خود تمہارا نام لیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تم سے درخواست کروں کہ میں اس وقت سعیدہ اماں کی بیٹی سے شادی کر کے اس کی مدد کر دوں۔"

کسی نے سالار کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچی تھی یا سر سے آسمان، اسے اندازہ نہیں ہوا۔ وہ پلٹ کر واپس صوفے پر بیٹھ گیا۔

"میں شادی شدہ ہوں فرقان! تم نے انہیں بتایا۔"

"ہاں، میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ تم نے کئی سال پہلے ایک لڑکی سے نکاح کیا تھا، مگر پھر وہ لڑکی دوبارہ تمہیں نہیں ملی۔"

"پھر؟"

"وہ اس کے باوجود یہی چاہتے ہیں کہ تم آمنہ سے شادی کر لو۔"

"فرقان ... میں ..." وہ بات کرتے کرتے رُک گیا۔

"اور امامہ ... اس کا کیا ہو گا؟"

"تمہاری زندگی میں امامہ کہیں نہیں ہے۔ اتنے سالوں میں کون جانتا ہے، وہ کہاں ہے۔ ہے بھی

کہ نہیں۔"

"فرقان" سالار نے ترشی سے اس کی بات کاٹی۔ "اس بات کو رہنے دو کہ وہ ہے یا نہیں۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اگر کل امامہ آ جاتی ہے تو پھر کیا ہو گا؟"

"تم یہ بات ڈاکٹر صاحب سے کہو۔" فرقان نے کہا۔

"نہیں، تم یہ سب کچھ سعید اماں کو بتاؤ، آمنہ کو بتاؤ، ضروری تو نہیں ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کو قبول کر لے جس کی پہلے سے ہی ایک بیوی ہے۔ ایسا ہوتا تو وہ پھر اسی لڑکے کو قبول کر لیتی جس نے کہیں اور شادی کر لی ہے۔"

"وہ اگر بارات لے کر آ جاتا تو شاید یہ بھی ہو جاتا۔ مسئلہ تو یہی ہے کہ وہ آمنہ سے دوسری شادی پر بھی تیار نہیں ہے۔"

"اسے ڈھونڈا جا سکتا ہے۔"

"ہاں، ڈھونڈا جا سکتا ہے لیکن یہ کام اس وقت نہیں ہو سکتا۔"

"ڈاکٹر صاحب نے آمنہ کے لئے غلط انتخاب کیا ہے۔ میں ... میں آمنہ کو کیا دے سکتا ہوں۔ میں تو اس آدمی سے بھی بدتر ہوں جو ابھی اسے چھوڑ گیا ہے۔"

سالار نے بے چارگی سے کہا۔

"سالار! انہیں اس وقت کسی کی ضرورت ہے، ضرورت کے وقت صرف وہی آدمی سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے، جو سب سے زیادہ قابلِ اعتبار ہو۔ تم زندگی میں اتنے بہت سے لوگوں کی مدد کرتے آ رہے ہو۔ کیا ڈاکٹر سبط علی صاحب کی مدد نہیں کر سکتے۔"

"میں نے لوگوں کی پیسے سے مدد کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب مجھ سے پیسہ نہیں مانگ رہے۔"

اس سے پہلے کہ فرقان کچھ کہتا اس کے موبائل پر کال آنے لگی تھی۔ اس نے نمبر دیکھ کر موبائل سالار کی طرف بڑھا دیا۔

"ڈاکٹر صاحب کی کال آ رہی ہے۔"

سالار نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ موبائل پکڑ لیا۔

وہاں بیٹھے موبائل کان سے لگائے سالار کو پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ زندگی میں ہر بات، ہر شخص سے نہیں کہی جا سکتی۔ وہ جو کچھ فرقان سے کہہ سکتا تھا وہ ان سے اونچی آواز میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ انہیں دلائل دے سکتا تھا نہ بہانے بنا سکتا تھا۔ انہوں نے مخصوص نرم لہجے میں اس سے درخواست کی تھی۔

"اگر آپ اپنے والدین سے اجازت لے سکیں تو آمنہ سے شادی کر لیں۔ وہ میری بیٹی جیسی ہے۔ آپ سمجھیں میں اپنی بیٹی کے لئے آپ سے درخواست کر رہا ہوں، آپ کو تکلیف دے رہا ہوں لیکن میں ایسا کرنے کے لئے مجبور ہوں۔"

"آپ جیسا چاہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔"

اس نے مدھم آواز میں ان سے کہا۔

"آپ مجھ سے درخواست نہ کریں، آپ مجھے حکم دیں۔" اس نے خود کو کہتے پایا تھا۔

فرقان تقریباً دس منٹ کے بعد اندر آیا۔ سالار موبائل فون ہاتھ میں پکڑے گم صم فرش پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"ڈاکٹر صاحب سے بات ہو گئی تمہاری؟"

فرقان نے اس کے بالمقابل ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے مدھم آواز میں اس سے پوچھا۔

سالار نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر کچھ کہے بغیر سینٹر ٹیبل پر اس کا موبائل رکھ دیا۔

"میں رخصتی ابھی نہیں کرواؤں گا۔ بس نکاح کرنا ہے۔"

اس نے چند لمحوں بعد کہا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھ رہا تھا۔ فرقان کو بے اختیار اس پر ترس آیا۔ وہ مقدر کا "شکار" ہونے والا پہلا انسان نہیں تھا۔

☆ ... ☆ ☆

سڑک پر گہما گہمی تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔ رات بہت تیزی سے گزرتی جا رہی تھی۔ گہری دھند ایک بار پھر ہر چیز کو اپنے حصار میں لے رہی تھی۔

سڑک پر جلنے والی اسٹریٹ لائٹس کی روشنی دھند کو چیرتے ہوئے اس بالکونی کی تاریکی کو دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی جہاں منڈیر کے پاس ایک اسٹول پر سالار بیٹھا ہوا تھا۔ منڈیر پر اس کے سامنے کافی کا ایک مگ پڑا ہوا تھا، جس میں سے اٹھنے والی گرم بھاپ دھند کے پس منظر میں عجیب سی شکلیں بنانے میں مصروف تھی اور وہ ... وہ سینے پر دونوں ہاتھ لپیٹے یک ٹک نیچے سنسان سڑک کو دیکھ رہا تھا جو دھند کے اس غلاف میں بہت عجیب نظر آ رہی تھی۔

رات کے دس بج رہے تھے اور وہ چند منٹ پہلے ہی گھر پہنچا تھا۔ سعید اماں کے گھر نکاح کے بعد وہ وہاں رکا نہیں تھا۔ اسے وہاں عجیب سی وحشت ہو رہی تھی۔ وہ گاڑی لے کر بے مقصد شام سے رات گئے تک سڑکوں پر پھرتا رہا۔ اس کا موبائل آف تھا۔ وہ بیرونی دنیا سے اس وقت کوئی رابطہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ موبائل آن ہوتا تو فرقان اس سے رابطہ کرتا۔ بہت سی وضاحتیں دینے کی کوشش کرتا یا ڈاکٹر سبط علی رابطہ کرتے۔ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتے۔

وہ یہ دونوں چیزیں نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس وقت مکمل خاموشی چاہتا تھا۔ اٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر چند گھنٹے پہلے کے واقعات کے بارے میں سوچا۔ سب کچھ ایک خواب کی طرح

لگ رہا تھا۔ کاش خواب ہی ہوتا۔ اسے وہاں بیٹھے کئی ماہ پہلے حرم پاک میں مانگی جانے والی دعا یاد آئی۔

"تو کیا اسے میری زندگی سے نکال دینے کا فیصلہ ہوا ہے؟" اس نے تکلیف سے سوچا۔

"تو پھر یہ اذیت بھی تو ختم ہونی چاہئے۔ میں نے اس اذیت سے رہائی بھی تو مانگی تھی۔ میں نے اس کی یادوں سے فرار بھی تو چاہا تھا۔" اس نے منڈیر پر رکھا گرم کافی کا کپ اپنے سرد ہاتھوں میں تھام لیا۔

تو امامہ ہاشم بالآخر تم میری زندگی سے ہمیشہ کے لئے نکل گئیں۔

اس نے کافی کی تلخی اپنے اندر اتاری۔

"اور اب کیا میں پچھتاؤں کہ کاش میں کبھی سعیدہ اماں کو اس سڑک پر نہ دیکھتا یا میں ان کو لفٹ نہ دیتا۔ ان کا گھر مل جاتا اور میں انہیں وہاں ڈراپ کر کے آجاتا، ان کو اپنے گھر نہ لاتا، نہ روابط بڑھتے، نہ وہ اس شادی پر مجھے بلاتیں یا پھر کاش میں آج کراچی میں ہی نہ ہوتا۔ یہاں ہوتا ہی نہیں یا میں موبائل آف کر کے سوتا۔ فون کا ریسیور رکھ دیتا۔ فرقان کی کال ریسیو ہی نہ کرتا یا پھر کاش میں ڈاکٹر سبط علی کو نہ جانتا ہوتا کہ ان کے کہنے پر مجھے مجبور نہیں ہونا پڑتا یا پھر شاید مجھے یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ امامہ میرے لئے نہیں ہے۔" اس نے کافی کا مگ دوبارہ منڈیر پر رکھ دیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرے، پھر جیسے کوئی خیال آنے پر اپنا والٹ نکال لیا۔ والٹ کی ایک جیب سے اس نے ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر کھول لیا۔

ڈیئر انکل سکندر!

مجھے آپ کے بیٹے کی موت پر بہت افسوس ہوا۔ چند سال پہلے میری وجہ سے آپ کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔ میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے سالار کو کچھ رقم ادا کرنی تھی وہ اب میں آپ کو بھیج رہی ہوں۔

خدا حافظ

امامہ ہاشم

اس نے نو ماہ میں کتنی بار اس کاغذ کو پڑھا تھا اسے یاد نہیں تھا۔ اس کاغذ کو چھوتے ہوئے اسے اس کاغذ میں امامہ کا لمس محسوس ہوتا۔ اس کے ہاتھ سے لکھا ہوا اپنا نام کاغذ پر تحریر ان چند جملوں میں اس کے لئے کوئی اپنائیت نہیں تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ امامہ کو اس کی موت کی خبر پر بھی کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ خبر اس کے لئے ڈھائی سال بعد رہائی کا پیغام بن کر آئی تھی۔ اسے کیسے افسوس ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ چند جملے اس کے لئے بہت اہم ہو گئے تھے۔

اس نے کاغذ پر لکھے جملوں پر اپنی انگلیاں پھیریں۔ اس نے آخر میں لکھے امامہ ہاشم کے نام کو چھوا..... پھر کاغذ کو دوبارہ اسی طرح تہ کر کے والٹ میں رکھ لیا۔

منڈیر پر کافی کا مگ سرد ہو چکا تھا۔ سالار نے ٹھنڈی کافی کے باقی مگ کو ایک گھونٹ میں اپنے اندر انڈیل لیا۔

ڈاکٹر سبط علی ایک ہفتے تک لندن سے واپس پاکستان پہنچ رہے تھے اور اسے ان کا انتظار تھا۔ امامہ ہاشم کے بارے میں جو کچھ وہ اتنے سالوں سے انہیں نہیں بتا سکا تھا وہ انہیں اب بتانا چاہتا تھا۔ اپنے ماضی کے بارے میں جو کچھ وہ انہیں نہیں بتا پایا تھا اب وہ ان سے کہہ دینا چاہتا تھا۔ اسے اب پروا نہیں تھی۔ وہ اس کے بارے میں کیا سوچیں گے۔

☆ ☆ ..... ☆

رمضان کی چار تاریخ تھی، جب ڈاکٹر سبط علی واپس آگئے تھے۔ وہ رات کو کافی دیر سے آئے تھے اور سالار نے اس وقت انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ رات کو ان کے پاس پہلے کی طرح جانا چاہتا تھا مگر دوپہر کو خلافِ توقع بینک میں ان کا فون آگیا۔ سالار کے نکاح کے بعد یہ ان کا سالار کے ساتھ تیسرا رابطہ تھا۔ وہ کچھ دیر اس کا حال احوال دریافت کرتے رہے اور پھر انہوں نے اس سے کہا۔

"سالار! آپ آج رات کو نہ آئیں، شام کو آجائیں۔ افطاری میرے ساتھ کریں۔"

"ٹھیک ہے، میں آجاؤں گا۔" سالار نے حامی بھرتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر ان کے درمیان مزید گفتگو ہوتی رہی پھر ڈاکٹر سبط علی نے فون بند کر دیا۔

وہ اس دن بینک سے کچھ جلدی نکل آیا۔ اپنے فلیٹ پر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ جب ان کے ہاں پہنچا اس وقت افطاری میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔

ڈاکٹر سبط علی کا ملازم اسے اجتماع والے بیرونی کمرے کے بجائے سیدھا اندر لاؤنج میں لے آیا تھا۔

ڈاکٹر سبط علی نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس سے بغلگیر ہونے کے بعد بڑی محبت کے ساتھ اس کا ماتھا چوما۔

"پہلے آپ ایک دوست کی حیثیت سے یہاں آتے تھے، آج آپ گھر کا ایک فرد بن کر یہاں آئے ہیں۔"

وہ جانتا تھا ان کا اشارہ کس طرف تھا۔

"آئیے بیٹھئے۔" وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود دوسرے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"بہت مبارک ہو۔ اب تو آپ بھی گھر والے ہو گئے ہیں۔"

سالار نے خاموش نظروں اور پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔

"میں بہت خوش ہوں کہ آپ کی شادی آمنہ سے ہوئی ہے۔ وہ میرے لئے میری چوتھی بیٹی کی طرح ہے اور اس رشتے سے آپ بھی میرے داماد ہیں۔"

سالار نے نظریں چرا لیں۔ اس کی زندگی میں امامہ ہاشم کا باب نہ کھلا ہوا ہوتا تو شاید ان کے منہ سے یہ جملہ سن کر وہ اپنے آپ پر فخر کرتا مگر سارا فرق امامہ ہاشم تھی۔ سارا فرق وہی ایک لڑکی پیدا کر رہی تھی، وجو تھی اور نہیں تھی۔

ڈاکٹر سبط علی کچھ دیر اسے دیکھتے رہے پھر انہوں نے کہا۔

''آپ اتنے سالوں سے میرے پاس آ رہے ہیں آپ نے کبھی مجھے یہ نہیں بتایا کہ آپ نکاح کر چکے ہیں۔ تب بھی نہیں جب ایک دو بار آپ سے شادی کا ذکر ہوا۔''

سالار نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

''میں آپ کو بتانا چاہتا تھا مگر '' وہ بات کرتے کرتے چپ ہو گیا۔

''سب کچھ اتنا عجیب تھا کہ میں آپ کو کیا بتاتا۔'' اس نے دل میں کہا ''کب ہوا تھا آپ کا نکاح؟''

ڈاکٹر سبط علی دھیمے لہجے میں پوچھ رہے تھے۔ ''ساڑھے آٹھ سال پہلے۔ تب میں اکیس سال کا تھا۔'' اس نے کسی شکست خوردہ معمول کی طرح کہا، پھر وہ آہستہ آہستہ انہیں سب کچھ بتاتا گیا۔ ڈاکٹر سبط علی نے اسے ایک بار بھی نہیں ٹوکا تھا۔ اس کے خاموش ہونے کے بعد بھی بہت دیر تک وہ چپ رہے تھے۔

بہت دیر بعد انہوں نے اس سے کہا تھا۔

''آمنہ بہت اچھی لڑکی ہے اور وہ خوش قسمت ہے کہ اسے ایک صالح مرد ملا ہے۔''

ان کی بات سالار کو ایک چابک کی طرح لگی۔

''صالح؟ میں صالح مرد نہیں ہوں ڈاکٹر صاحب! میں تو اسفل السافلین ہوں۔ آپ مجھے جانتے ہوتے تو میرے لئے کبھی یہ الفاظ استعمال کرتے نہ اس لڑکی کے لئے میرا انتخاب کرتے جسے آپ اپنا بیٹی کی طرح سمجھتے ہیں۔''

''ہم سب اپنی زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر ''زمانۂ جاہلیت'' سے ضرور گزرتے ہیں، بعض گزر جاتے ہیں، بعض ساری زندگی اسی زمانے میں گزار دیتے ہیں۔ آپ اس میں سے گزر چکے ہیں۔ آپ کا پچھتاوا بتا رہا ہے کہ آپ گزر چکے ہیں۔ میں آپ کو پچھتاوے سے روکوں گا نہ توبہ اور دعا سے، آپ پر فرض ہے کہ آپ اپنی ساری زندگی یہ کریں، مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ شکر بھی ادا کریں کہ آپ نفس کی تمام بیماریوں سے چھٹکارا پا چکے ہیں۔

اگر دنیا آپ کو اپنی طرف نہیں کھینچتی اگر اللہ کے خوف سے آپ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں، اگر دوزخ کا تصور آپ کو ڈراتا ہے، اگر آپ اللہ کی عبادت اس طرح کرتے ہیں، جس طرح کرنی چاہئے، اگر نیکی آپ کو اپنی طرف راغب کرتی ہے اور برائی سے آپ رک جاتے ہیں تو پھر آپ صالح ہیں۔ کچھ صالح ہوتے ہیں، کچھ صالح بنتے ہیں، صالح ہونا خوش قسمتی کی بات ہے، صالح بننا دودھاری

تلوار پر چلنے کے برابر ہے۔ اس میں زیادہ وقت لگتا ہے۔ اس میں زیادہ تکلیف سہنی پڑتی ہے۔ میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ آپ صالح ہیں کیونکہ آپ صالح بنے ہیں، اللہ آپ سے بڑے کام لے گا۔''

سالار کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ انہوں نے ایک بار پھر امامہ ہاشم کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ کچھ نہیں کہا تھا۔ کیا اس کا مطلب تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی سے نکل گئی؟ کیا اس کا مطلب تھا کہ وہ آئندہ بھی کبھی اس کی زندگی میں نہیں آئے گی؟ اسے اپنی زندگی آمنہ کے ساتھ ہی گزارنی پڑے گی؟ اس کا دل ڈوبا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے منہ سے امامہ کے حوالے سے کوئی تسلی، کوئی دلاسا، کوئی امید چاہتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب خاموش تھے۔ وہ چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا۔

''میں آپ کے اور آمنہ کے لئے بہت دعا کروں گا بلکہ میں بہت دعا کر کے آیا ہوں خانہ کعبہ میں روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر۔'' وہ لندن سے واپسی پر عمرہ کر کے آئے تھے۔ سالار نے سر جھکا لیا۔ دور اذان کی آواز آ رہی تھی۔ ملازم افطار کے لئے میز تیار کر رہا تھا۔ اس نے بوجھل دل کے ساتھ ڈاکٹر سبط علی کے ساتھ بیٹھ کر روزہ افطار کیا پھر وہ اور ڈاکٹر سبط علی نماز پڑھنے کے لئے قریبی مسجد میں چلے گئے۔ وہاں سے واپسی پر اس نے ڈاکٹر سبط علی کے ہاں کھانا کھایا اور پھر اپنے فلیٹ پر واپس آ گیا۔

☆ ☆ ☆

''کل میرے ساتھ سعیدہ اماں کے ہاں چل سکتے ہو؟''

اس نے ڈاکٹر سبط علی کے گھر سے واپسی کے بعد دس بجے کے قریب فرقان کو فون کیا۔ فرقان ہاسپٹل میں تھا۔ اس کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔

''ہاں، کیوں نہیں۔ کوئی خاص کام ہے؟''

''میں آمنہ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

فرقان کچھ دیر بول نہیں سکا۔ سالار کا لہجہ بہت ہموار تھا، وہاں کسی تلخی کے کوئی آثار نہیں تھے۔

''کیسی باتیں؟''

''کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔'' سالار نے جیسے اسے تسلی دی۔

''پھر بھی۔'' فرقان نے اصرار کیا۔

''تم پھر امامہ کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو؟''

''تم پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ میرے ساتھ چلو گے؟''

سالار نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

''ہاں، چلوں گا۔''

"تو پھر میں تمہیں کل ہی بتاؤں گا کہ مجھے اس سے کیا بات کرنی ہے۔"

اس سے پہلے کہ فرقان کچھ کہتا، فون بند ہو گیا۔

☆......☆ ☆

"تم اس سے امامہ کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو؟" فرقان نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سالار سے پوچھا۔

"نہیں، صرف امامہ کے بارے میں نہیں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو میں کرنا چاہتا ہوں۔"

"ڈونٹ بی سِلی سالار! گڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش مت کرو۔" فرقان نے ناراضی سے کہا۔

"اس کو میری ترجیحات اور مقاصد کا پتہ ہونا چاہئے۔ اب اسے ساری زندگی گزارنی ہے میرے ساتھ۔"

سالار نے اس کی ناراضی کی پروا کیے بغیر کہا۔

"پتا چل جائے گا اسے، سمجھ دار لڑکی ہے وہ اور اگر کچھ بتانا ہی ہے تو گھر لا کر بتانا، وہاں پنڈورا باکس کھول کر مت بیٹھنا۔"

"گھر لا کر بتانے کا کیا فائدہ، جب اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ ہی نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں وہ میری باتوں کو سنے، سمجھے، سوچے اور پھر کوئی فیصلہ کرے۔"

"اب کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی وہ۔ تمہارا اور اس کا نکاح ہو چکا ہے۔"

"رخصتی تو نہیں ہوئی۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کیوں نہیں پڑتا۔ اگر اس کو میری بات پر اعتراض ہوا تو وہ اس رشتے کے بارے میں نظرِثانی کر سکتی ہے۔" سالار نے سنجیدگی سے کہا۔

فرقان نے چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

"اور اس نظرِثانی کے لئے تم کس طرح کے حقائق اور دلائل پیش کرنے والے ہو اس کے سامنے؟"

"میں اسے صرف چند باتیں بتانا چاہتا ہوں جس کا جاننا اس کے لئے ضروری ہے۔" سالار نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"وہ ڈاکٹر سبط علی کی رشتے دار ہے، میں اس حوالے سے اس کی بہت عزت کرتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے نہیں کہا ہوتا تو یہ رشتہ قائم بھی نہیں ہوتا لیکن میں ....."

فرقان نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ٹھیک ہے، تم کو اس سے جو کہنا ہے، کہہ لینا لیکن امامہ کے ذکر کو ذرا کم ہی رکھنا کیونکہ اگر وہ کسی بات سے ہرٹ ہوئی تو وہ بیہا بات ہو گی، باقی چیزوں کی پروا وہ شاید نہ کرے۔ آفٹر آل۔ دوسری بیوی ہونا یا کہلانا آسان نہیں ہوتا۔"

فرقان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اور میں چاہتا ہوں، وہ یہ بات محسوس کرے، سوچے، اس کے بارے میں .... ابھی تو کچھ بھی نہیں بگڑا۔ تم کہتے ہو، وہ خوب صورت ہے، پڑھی لکھی ہے، اچھی فیملی سے تعلق ہے اس کا..."

فرقان نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی۔

"ختم کرو اس موضوع کو سالار! تم کو اس سے جو کہنا ہے اسے جو سمجھانا ہے جا کر کہہ لینا...."

"میں اس سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" سالار نے کہا۔

"میں سعیدہ اماں سے کہہ دوں گا۔ وہ تمہیں اکیلے میں اس سے بات کروا دیں گی۔"

فرقان نے اس کی بات پر سر ہلاتے ہوئے کہا۔

وہ آدھ گھنٹہ میں سعیدہ اماں کے ہاں پہنچ گئے تھے۔ دروازہ سعیدہ اماں نے ہی کھولا تھا اور سالار اور فرقان کو دیکھ کر وہ جیسے خوشی سے بے حال ہو گئی تھیں۔ وہ ان دونوں کو اسی بیٹھک نما کمرے میں لے گئیں۔

"سعیدہ اماں! سالار، آمنہ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔"

فرقان نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ سعیدہ اماں کچھ الجھیں۔

"کیسی باتیں؟" وہ اب سالار کی طرف دیکھ رہی تھیں جو خود بھی بیٹھنے کے بجائے فرقان کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔

"ہیں چند باتیں، جو وہ اس سے کرنا چاہتا ہے مگر پریشانی والی کوئی بات نہیں۔" فرقان نے انہیں تسلی دی۔

سعیدہ اماں ایک بار پھر سالار کو دیکھنے لگیں۔ اس نے نظریں چرا لیں۔

"اچھا.... پھر تم میرے ساتھ آ جاؤ بیٹا! آمنہ اندر ہے۔ ادھر آ کر اس سے مل لو۔"

سعیدہ اماں کہتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئیں۔ سالار نے ایک نظر فرقان کو دیکھا پھر وہ خود بھی سعیدہ اماں کے پیچھے چلا گیا۔

بیٹھک بیرونی دروازے کے بائیں جانب تھی۔ دائیں جانب اوپر جانے والی سیڑھیاں تھیں۔ بیرونی دروازے سے کچھ آگے بالکل سامنے کچھ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد لکڑی کا ایک اور پرانی طرز کا بہت بڑا دروازہ تھا جو اس وقت کھلا ہوا تھا اور وہاں سرخ اینٹوں کا بڑا وسیع صحن نظر آ رہا تھا۔

سعیدہ اماں کا رُخ ان ہی سیڑھیوں کی طرف تھا۔ سالار ان سے کچھ فاصلے پر تھا۔ سعیدہ اماں اب

سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ وہ جب سیڑھیاں چڑھ کر صحن میں داخل ہو گئیں تو سالار بھی کچھ جھجکتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

وسیع سرخ اینٹوں کے صحن کے اطراف دیواروں کے ساتھ کیاریاں بنائی گئی تھیں جن میں لگے ہوئے سبز پودے اور بیلیں سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی دیواروں کے بیک گراؤنڈ میں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ صحن کے ایک حصے میں دھوپ تھی اور دن کے اس حصے میں بھی وہ دھوپ بے حد تیز تھی۔ دھوپ نے سرخ رنگ کو کچھ اور نمایاں کر دیا تھا۔

آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر سالار نے صحن میں قدم رکھ دیا اور وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ صحن کے دھوپ والے حصے میں رکھی چارپائی کے سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ وہ شاید ابھی چارپائی سے اتری تھی۔ اس کی پشت سالار کی طرف تھی۔ وہ سفید کرتے اور سیاہ شلوار میں ملبوس تھی اور نہا کر نکلی تھی۔ اس کی کمر سے نیچے تک اس کے سیاہ گیلے بال لٹوں کی صورت میں اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا سفید دوپٹہ چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے کرتے کی آستینوں کو کہنیوں تک فولڈ کرتے ہوئے سالار کی طرف مڑی تھی۔

سالار سانس نہیں لے سکا۔ اس نے زندگی میں اس سے زیادہ خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی یا پھر اسے اس لڑکی سے زیادہ خوب صورت کوئی نہیں لگا تھا۔ وہ یقیناً آمنہ تھی۔ اس گھر میں آمنہ کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ آگے نہیں بڑھ سکا۔ وہ اس سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ کسی نے اس کے دل کو مٹھی میں لیا تھا۔ دھڑکن رکی تھی یا رواں دواں نہیں رہ سکا۔

اس کے اور آمنہ کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔ آستین موڑتے ہوئے آمنہ کی پہلی نظر سعیدہ اماں پر پڑی۔

"سالار بیٹا آیا ہے۔"

سعیدہ اماں بہت آگے بڑھ آئی تھیں۔ آمنہ نے گردن کو ترچھا کرتے ہوئے صحن کے دروازے کی طرف دیکھا۔ سالار نے اسے بھی ٹھٹکتے دیکھا، پھر وہ مڑی۔ اس کی پشت ایک بار پھر سالار کی طرف تھی۔ سالار نے اسے جھکتے اور چارپائی سے دوپٹہ اٹھاتے دیکھا۔ دوپٹے کو سینے پر پھیلاتے ہوئے اس نے اس کے ایک پلو کے ساتھ اپنے سر اور پشت کو بھی ڈھانپ لیا تھا۔

سالار اب اس کی پشت پر بکھرے بال نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اسے آمنہ کے اطمینان نے حیران کیا تھا۔ وہاں کوئی گھبراہٹ، کوئی جلدی، کوئی حیرانی نہیں تھی۔

سعیدہ اماں نے مڑ کر سالار کو دیکھا پھر اسے دروازے میں ہی کھڑے دیکھ کر انہوں نے کہا۔

"ارے بیٹا! وہاں کیوں کھڑے ہو، اندر آؤ۔ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔"

آمنہ نے دوپٹہ اوڑھنے کے بعد مڑ کر اسے ایک بار پھر دیکھا تھا۔ وہ اب بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ پلکیں جھپکائے بغیر، دم بخود، بے حس و حرکت۔

آمنہ کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ وہ اب آگے آ گیا تھا۔

"یہ آمنہ ہے، میری بیٹی۔" سعیدہ اماں نے اس کے قریب آنے پر تعارف کروایا۔

"السلام علیکم!" سالار نے آمنہ کو کہتے سنا۔ وہ کچھ بول نہیں سکا۔ وہ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اسے دیکھنا مشکل ہو گیا تھا۔

وہ نروس ہو رہا تھا۔ آمنہ نے اس کی گھبراہٹ کو محسوس کر لیا تھا۔

"سالار! تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔"

سعیدہ اماں نے آمنہ کو بتایا۔

آمنہ نے ایک بار پھر سالار کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں نے بیک وقت نظریں چرائیں۔

آمنہ نے سعیدہ اماں کو دیکھا اور سالار نے آمنہ کی کلائیوں تک مہندی کے نقش و نگار سے بھرے ہاتھوں کو۔

یک دم اسے لگا کہ وہ اس لڑکی سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

"سالار بیٹا! اندر کمرے میں چلتے ہیں۔ وہاں تم اطمینان سے آمنہ سے بات کر لینا۔"

سعیدہ اماں نے اس بار سالار کو مخاطب کیا۔

سعیدہ اماں کہتے ہوئے اندر برآمدے کی طرف بڑھیں۔ سالار نے آمنہ کو سر جھکائے ان کی پیروی کرتے دیکھا۔ وہ وہیں کھڑا اسے اندر جاتا دیکھتا رہا۔ سعیدہ اماں کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئیں۔ آمنہ نے دروازے کے پاس پہنچ کر مڑتے مڑتے اسے دیکھا۔ سالار نے برق رفتاری سے نظر جھکا لیں۔ آمنہ نے مڑ کر اسے دیکھا پھر شاید وہ حیران ہوئی۔ سالار اندر کیوں نہیں آ رہا تھا۔ سالار نے اس کی طرف دیکھے بغیر سر جھکائے قدم آگے بڑھا دیئے۔ آمنہ کچھ مطمئن ہو کر مڑ کر کمرے میں داخل ہو گئی۔

سالار جب کمرے میں داخل ہوا تو سعیدہ اماں پہلے ہی ایک کرسی پر بیٹھ چکی تھیں۔ آمنہ لائٹ آن کر رہی تھی۔ سالار کو دھوپ سے اندر آ کر خنکی کا احساس ہوا۔

"بیٹھو بیٹا!" سعیدہ اماں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔ سالار کرسی پر بیٹھ گیا۔ آمنہ لائٹ آن کرنے کے بعد اس سے کچھ فاصلے پر ان کے بالمقابل ایک کاؤچ پر بیٹھ گئی۔

سالار منتظر تھا کہ سعیدہ اماں چند لمحوں میں وہاں سے اٹھ کر چلی جائیں گی۔ فرقان نے واضح طور پر انہیں بتایا تھا کہ وہ اس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا، مگر چند لمحوں کے بعد سالار کو اندازہ ہو گیا کہ اس

کا یہ انتظار بے کار تھا۔ وہ شاید یہ بھول گئی تھیں کہ سالار تنہائی میں آمنہ سے ملنا چاہتا تھا یا پھر ان کا یہ خیال تھا کہ وہ تنہائی صرف فرقان کی عدم موجودگی کے لئے تھی۔ سالار نے انہیں اس میں شامل نہیں کیا ہوگا یا پھر وہ ابھی سالار کو اتنا قابلِ اعتبار نہیں سمجھتی تھیں کہ اپنی بیٹی کے ساتھ اسے اکیلا چھوڑ دیتیں۔

سالار کو آخری اندازہ صحیح لگا۔ وہ اس سے جو کچھ اور جتنا کچھ کہنا چاہتا تھا، سعیدہ اماں کے سامنے نہیں کہنا چاہتا تھا، وہ کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنے ذہن کو کھنگالنے کی کوشش کی۔ اسے کچھ تو کہنا ہی تھا، وہ کچھ نہیں ڈھونڈ سکا۔ اس کا ذہن خالی تھا۔

نیم تاریک خنک کمرے میں بالکل خاموشی تھی۔ وہ اب دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے فرش پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

آمنہ نے کمرے میں کوئی فینسی لائٹ روشن کی تھی۔ اونچی دیواروں والا فرنیچر سے بھرا ہوا وسیع و عریض کمرہ شاید سٹنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس میں بہت زیادہ دروازے تھے اور تمام دروازے بند تھے۔ کمرے میں موجود واحد کھڑکی برآمدے میں کھلتی تھی اور اس کے آگے پردے تھے۔ فرش کو بھاری بھرکم میرون نقش و نگار کے قالین سے ڈھکا گیا تھا اور فینسی لائٹ کمرے کو پوری طرح روشن کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

کم از کم کمرے میں سالار کو تاریکی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ اس کے احساسات تھے یا پھر۔

مجھے اپنے optician سے آج ضرور ملنا چاہئے۔ قریب کے ساتھ ساتھ شاید میری دور کی نظر بھی کمزور ہو گئی ہے۔"

سالار نے مایوسی سے سوچا۔ سینٹر ٹیبل کے دوسری طرف بیٹھی آمنہ کو وہ دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر نظر قالین پر جما دی پھر اس نے یک دم آمنہ کو اٹھتے دیکھا۔ وہ دیوار کے پاس جا کر کچھ اور لائٹس آن کر رہی تھی۔ کمرہ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں جگمگا اٹھا۔ فینسی لائٹ بند ہو گئی۔ سالار حیران ہوا۔ آمنہ نے پہلے ٹیوب لائٹ آن کیوں نہیں کی تھی، پھر اچانک اسے احساس ہوا وہ بھی نروس تھی۔

آمنہ دوبارہ پھر اس کے سامنے کاؤچ پر آ کر نہیں بیٹھی۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر سعیدہ اماں کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ سالار نے اس بار اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اسی طرح قالین کو گھورتا رہا۔ سعیدہ اماں کا صبر بالآخر جواب دے گیا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے کھنکھار کر سالار کو متوجہ کیا۔

"کر دیا! وہ باتیں جو تم نے آمنہ سے تنہائی میں کرنی تھیں۔"

انہوں نے سالار کو بڑے پیار سے یاد دلایا۔

"اتنی دیر سے چپ بیٹھے ہو، میرا تو دل ہول رہا ہے۔"

سالار نے ایک گہرا سانس لیا، پھر سعیدہ اماں اور آمنہ کو باری باری دیکھا۔

"کچھ نہیں، میں بس انہیں دیکھنا چاہتا تھا۔"

اس نے اپنے لہجے کو حتی الامکان ہموار رکھتے ہوئے کہا۔ سعیدہ اماں کے چہرے پر بشاشت آ گئی۔

"تو اتنی سی بات تھی اور فرقان نے مجھے ڈرا ہی دیا۔ ہاں ہاں ضرور دیکھو، کیوں نہیں۔ بیوی ہے تمہاری۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ ان سے کہہ دیں کہ سامان پیک کر لیں، میں باہر انتظار کرتا ہوں۔"

وہ دروازے کی طرف بڑھتا ہوا سعیدہ اماں سے بولا۔ آمنہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ سعیدہ اماں بھی حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"مگر بیٹا! تم تو صرف کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے اس سے، پھر رخصتی..... میرا مطلب ہے میں چاہتی تھی باقاعدہ رخصت کروں اور... "

سالار نے نرمی سے سعیدہ اماں کی بات کاٹی۔

"آپ یہ سمجھ لیں کہ میں باقاعدہ رخصت کروانے کے لئے ہی آیا ہوں۔"

سعیدہ اماں کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

"ٹھیک ہے بیٹا! تم اگر ایسا چاہتے ہو تو ایسا ہی سہی مگر افطار کے لئے رکو۔ چند گھنٹے ہی باقی ہیں، کھانا تو کھا کر جاؤ۔"

"نہیں، مجھے اور فرقان کو کچھ کام ہے۔ میں اسے صرف ایک گھنٹے کے لئے لے کر آیا تھا۔ زیادہ دیر رکنا ممکن نہیں ہے میرے لئے۔" وہ کھڑے کھڑے کہہ رہا تھا۔

"لیکن اماں! مجھے تو سامان پیک کرنے میں بہت دیر لگے گی۔"

آمنہ نے وہیں کرسی پر بیٹھے ہوئے پہلی بار ساری گفتگو میں حصہ لیا۔ سالار نے مڑ کر اسے دیکھے بغیر سعیدہ اماں سے کہا۔

"سعیدہ اماں! آپ ان سے کہیں یہ آرام سے پیکنگ کر لیں، میں باہر انتظار کروں گا۔ جتنی دیر یہ چاہیں۔"

وہ اب کمرے سے نکل گیا تھا۔

☆ ☆ .....☆

فرقان نے حیرانی سے سالار کو دیکھا۔ وہ بیٹھک میں داخل ہو رہا تھا۔

"تم اتنی جلدی واپس آ گئے، میں تو سوچ رہا تھا کہ تم خاصی دیر کے بعد واپس آؤ گے۔"

سالار جواب میں کچھ کہنے کے بجائے بیٹھ گیا۔

فرقان نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"خیریت ہے۔"

"ہاں۔"

"آمنہ سے ملاقات ہوئی؟"

"ہاں۔"

"پھر؟"

"پھر کیا؟"

"چلیں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"میں آمنہ کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔"

"کیا؟" فرقان بھونچکا رہ گیا۔

"تم تو اس سے بات کرنے کے لئے آئے تھے۔"

سالار جواب دینے کے بجائے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"یہ یک دم رخصتی کا کیوں سوچ لیا؟"

"بس سوچ لیا۔"

اس بار فرقان نے اسے الجھی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

☆ ... ☆ ☆

دو گھنٹے کے بعد آمنہ جب فرقان اور سالار کے ساتھ سالار کے فلیٹ پر پہنچی تھی، تب افطار میں زیادہ وقت نہیں تھا۔ سالار نے افطاری کا سامان راستے سے لے لیا تھا۔ فرقان ان دونوں کو افطاری کے لئے اپنے فلیٹ پر لے جانا چاہتا تھا مگر سالار اس پر رضامند نہیں ہوا۔ فرقان نے اپنی بیوی کو بھی سالار کے فلیٹ پر بلوالیا۔

افطاری کے لئے ٹیبل فرقان کی بیوی نے ہی تیار کیا تھا۔ آمنہ نے مدد کرنے کی کوشش کی تھی جسے فرقان اور اس کی بیوی نے رد کر دیا۔ سالار نے مداخلت نہیں کی تھی۔ وہ موبائل لے کر بالکونی میں چلا گیا۔ لاؤنج میں بیٹھے کھڑکیوں کے شیشوں کے پار آمنہ نے اسے بالکونی میں ٹہلتے موبائل پر کسی سے بات کرتے دیکھا۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

اس نے سعیدہ اماں کے گھر سے اپنے فلیٹ تک ایک بار بھی اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ یہ صرف فرقان تھا جو وقتاً فوقتاً اسے مخاطب کرتا رہا تھا اور اب بھی یہی ہو رہا تھا۔

سالار نے وہ خاموشی افطار کی میز پر بھی نہیں توڑی۔ فرقان اور اس کی بیوی ہی آمنہ کو مختلف چیزیں سرو کرتے رہے۔ آمنہ نے اس کی خاموشی اور سرد مہری کو محسوس کیا تھا۔

☆ ☆ ... ☆

افطار کے بعد وہ فرقان کے ساتھ مغرب کی نماز کے لئے نکل آیا تھا۔ فرقان کو مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد ہاسپٹل جانا تھا۔

مسجد سے نکل کر فرقان کے ساتھ کار پارکنگ کی طرف آتے ہوئے فرقان نے اس سے کہا۔

"تم بہت زیادہ خاموش ہو۔" سالار نے ایک نظر اسے دیکھا مگر کچھ کہے بغیر چلتا رہا۔

"کیا تمہیں کچھ کہنا نہیں ہے؟"

وہ مسلسل اس کی خاموشی کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سالار نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ مغرب کے وقت ہی دھند نمودار ہونے لگی تھی۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے فرقان کو دیکھا۔

"نہیں، مجھے کچھ نہیں کہنا۔"

چند لمحے ساتھ چلنے کے بعد فرقان نے اسے بڑبڑاتے سنا۔

"میں آج کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں ہوں۔"

فرقان کو بے اختیار اس پر ترس آیا۔ ساتھ چلتے چلتے اس نے سالار کا کندھا تھپتھپایا۔

میں تمہارے احساسات سمجھ سکتا ہوں لیکن زندگی میں یہ سب ہوتا رہتا ہے، تم امامہ کے لئے جو کچھ کر سکتے تھے تم نے کیا۔ جتنا انتظار کر سکتے تھے تم نے کیا۔ آٹھ نو سال کم نہیں ہوتے۔ اب تمہاری قسمت میں اگر یہی لڑکی ہے تو ہم یا تم کیا کر سکتے ہیں۔"

سالار نے بے تاثر نظروں سے اسے دیکھا۔

"اس گھر میں آنا امامہ کا مقدر نہیں تھا، آمنہ کا مقدر تھا۔ سو وہ آگئی۔ اس سے نکاح ہوئے سات ان ہوئے ہیں اور آٹھویں دن وہ یہاں ہے۔ امامہ کے ساتھ نکاح کو نو سال ہونے والے ہیں اور وہ آج تک تمہارے پاس نہیں آسکی۔ کیا تم یہ بات نہیں سمجھ سکتے کہ امامہ تمہارے مقدر میں نہیں ہے۔"

وہ پوری دلجمعی سے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہماری بہت ساری خواہشات ہوتی ہیں۔ بعض خواہشات اللہ پوری کر دیتا ہے، بعض نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے امامہ کے نہ ملنے میں تمہارے لئے بہتری ہو۔ ہو سکتا ہے اللہ نے تمہیں آمنہ ہی کے لئے رکھا ہو۔ ہو سکتا ہے آج سے چند سال بعد تم اسی بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکو۔"

وہ دونوں اب پارکنگ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ فرقان کی گاڑی شروع میں ہی کھڑی تھی۔

"میں نے اپنی زندگی میں ایسا کوئی انسان نہیں دیکھا جس کی ہر خواہش پوری ہو، جس نے جو چاہا ہو

پالیا ہو پھر شکوہ کس بات کا۔ آمنہ کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزارنے کی کوشش کرو۔"

وہ دونوں اب گاڑی کے پاس پہنچ چکے تھے۔ فرقان نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول دیا مگر بیٹھنے سے پہلے اس نے سالار کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے باری باری اس کے دونوں گالوں کو نرمی سے چوما۔

"تمہیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تم نے ایک نیکی کی ہے اور اس نیکی کا اجر اگر تمہیں یہاں نہیں ملے گا تو اگلی دنیا میں مل جائے گا۔"

وہ اب سالار کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لئے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سالار سر کو ہلکا سا خم کرتے ہوئے تھوڑا سا مسکرایا۔

فرقان نے ایک گہرا سانس لیا۔ آج کے دن یہ پہلی مسکراہٹ تھی جو اس نے سالار کے چہرے پر دیکھی تھی۔ اس نے خود بھی مسکراتے ہوئے سالار کی پشت تھپتھپائی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

سالار نے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔ فرقان اگنیشن میں چابی لگا رہا تھا۔ جب اس نے سالار کو کھڑکی کا شیشہ انگلی سے بجاتے دیکھا۔ فرقان نے شیشہ نیچے کر دیا۔

"تم کہہ رہے تھے کہ تم نے آج تک کوئی ایسا انسان نہیں دیکھا، جس نے جس چیز کی بھی خواہش کی ہو اسے مل گئی ہو۔"

سالار کھڑکی پر جھکے پرسکون آواز میں اس سے کہہ رہا تھا۔ فرقان نے الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بے حد پرسکون اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔

"پھر تم مجھے دیکھو کیونکہ میں وہ انسان ہوں، جس نے آج تک جو بھی چاہا ہے اسے وہ مل گیا ہے۔"

فرقان کو لگا اس کا ذہن غم کی وجہ سے متاثر ہو رہا تھا۔

"جسے تم میری نیکی کہہ رہے ہو وہ دراصل میرا "اجر" ہے جو مجھے زمین پر ہی دے دیا گیا ہے۔ مجھے آخرت کے انتظار میں نہیں رکھا گیا اور میرا مقدر آج بھی وہی ہے جو نو سال پہلے تھا۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر گہری آواز میں کہہ رہا تھا۔

"مجھے وہی عورت دی گئی ہے جس کی میں نے خواہش کی تھی، امامہ ہاشم اس وقت میرے گھر پہ ہے، خدا حافظ۔"

فرقان دم بخود دور جاتے ہوئے اس کی پشت دیکھتا رہا۔ وہ کیا کہہ کر گیا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"شاید میں ٹھیک سے اس کی بات نہیں سن پایا..... یا پھر شاید اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے... یا پھر شاید اس نے صبر کر لیا ہے امامہ ہاشم ؟" سالار اب بہت دور نظر آ رہا تھا۔

باب ۹

لاہور پہنچنے کے بعد اس کے لئے اگلا مرحلہ کسی کی مدد حاصل کرنے کا تھا مگر کس کی؟ وہ ہاسٹل نہیں جا سکتی تھی۔ وہ جویریہ اور باقی لوگوں سے رابطہ نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ اس کے گھر والے اس کی دوستوں سے واقف تھے اور چند گھنٹوں میں وہ اسے لاہور میں ڈھونڈنے والے تھے، بلکہ ہو سکتا تھا اب تک اس کی تلاش شروع ہو چکی ہو اور اس صورت حال میں ان لوگوں سے رابطہ کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس کے لئے صبیحہ کی صورت میں واحد آپشن رہ جاتا تھا، مگر وہ اس بات سے واقف نہیں تھی کہ وہ ابھی پشاور سے واپس آئی تھی یا نہیں۔

صبیحہ کے گھر پر ملازم کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ لوگ ابھی پشاور میں ہی تھے۔

"واپس کب آئیں گے؟" اس نے ملازم سے پوچھا۔ وہ اسے جانتا تھا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں ہے مگر ایک دو دن تک آ جائیں گے۔" اس نے امامہ کو بتایا۔

"کیا آپ کے پاس وہاں کا فون نمبر ہے؟" اس نے قدرے مایوسی کے عالم میں پوچھا۔

"جی، وہاں کا فون نمبر میرے پاس ہے۔" ملازم نے اس سے کہا۔

"وہ آپ مجھے دے دیں۔ میں فون پر اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

اسے کچھ تسلی ہوئی۔ ملازم اسے اندر لے آیا۔ ڈرائنگ روم میں اسے بٹھا کر اس نے وہ نمبر لا دیا۔ اس نے موبائل پر وہیں بیٹھے بیٹھے صبیحہ کو رنگ کیا۔ فون پشاور میں گھر کے کسی فرد نے اٹھایا تھا اور اسے بتایا کہ صبیحہ باہر گئی ہوئی ہے۔

امامہ نے فون بند کر دیا۔

"صبیحہ سے میری بات نہیں ہو سکی۔ میں کچھ دیر بعد اسے دوبارہ فون کروں گی۔" اس نے پاس کھڑے ملازم سے کہا۔

"تب تک میں یہیں بیٹھوں گی۔"

ملازم سر ہلاتے ہوئے چلا گیا۔ اس نے ایک گھنٹے کے بعد دوبارہ صبیحہ کو فون کیا۔ وہ اس کی کال پر حیران تھی۔

اس نے اسے مختصر طور پر اپنا گھر چھوڑ آنے کے بارے میں بتایا۔ اس نے اسے سالار سے اپنے نکاح کے بارے میں نہیں بتایا کیونکہ وہ نہیں جانتی تھی صبیحہ اس سارے معاملے کو کس طرح دیکھے گی۔

"امامہ! تمہارے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ تم اس معاملے میں کورٹ سے رابطہ کرو۔ تبدیلی مذہب کے حوالے سے پروٹیکشن مانگو۔" صبیحہ نے اس کی ساری گفتگو سننے کے بعد کہا۔

"میں یہ کرنا نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟"

"صبیحہ! میں پہلے ہی اس مسئلے کے بارے میں بہت سوچ چکی ہوں۔ تم میرے بابا کی پوزیشن اور اثر و رسوخ سے واقف ہو۔ پریس تو طوفان اٹھا دے گا۔ میری فیملی کو بہت ساری پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں یہ تو نہیں چاہتی کہ میرے گھر پر پتھراؤ ہو، میری وجہ سے میرے گھر والوں کی زندگی کو خطرہ ہو اور آج تک جتنی لڑکیوں نے اسلام قبول کر کے کورٹ پروٹیکشن لینے کی کوشش کی ہے ان کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ کورٹ دارالامان بھجوا دیتی ہے۔ وہ جیل بھجوانے کے مترادف ہے۔ کیس کا فیصلہ کتنی دیر تک ہو، کچھ پتا نہیں۔

گھر والے ایک کے بعد ایک کیس فائل کرتے رہتے ہیں۔ کتنے سال اس طرح گزر جائیں، کچھ پتا نہیں ہوتا اگر کسی کو کورٹ آزاد رہنے کی اجازت دے بھی دے تو وہ لوگ اتنے مسئلے کھڑے کرتے رہتے ہیں کہ بہت ساری لڑکیاں واپس گھر والوں کے پاس چلی جاتی ہیں۔ میں نہ تو دارالامان میں اپنی زندگی

برباد کرنا چاہتی ہوں نہ ہی لوگوں کی نظروں میں آنا چاہتی ہوں۔ میں نے خاموشی کے ساتھ گھر چھوڑا ہے اور میں اسی خاموشی کے ساتھ اپنی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔"

"میں تمہاری بات سمجھ سکتی ہوں امامہ! لیکن مسائل تو تمہارے لئے ابھی بھی کھڑے کئے جائیں گے۔ وہ تمہیں تلاش کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے اور ان لوگوں کے لئے مسائل پیدا ہوں گے جو تمہیں پناہ دیں گے اور وہ جب تمہیں ڈھونڈنا شروع کر دیں گے تو مجھ تک پہنچنا تو ان کے لئے بہت آسان ہوگا۔ تمہاری مدد کر کے ہمیں بہت خوشی ہوگی مگر میرے ابو یہی چاہیں گے کہ مدد چھپ کر کرنے کے بجائے کھل کر کی جائے اور کورٹ اس معاملے میں یقیناً تمہارے حق میں اپنا فیصلہ دے گا۔ تم ابھی میرے گھر پر ہی رہو۔ میں اس بارے میں ملازم کو کہہ دیتی ہوں اور آج میں اپنے ابو سے بات کرتی ہوں ہم کوشش کریں گے، کل لاہور واپس آ جائیں۔"

امامہ نے ملازم کو بلا کر فون اس کے حوالے کر دیا۔ صبیحہ نے ملازم کو کچھ ہدایات دیں اور پھر رابطہ منقطع کر دیا۔

"میں صبیحہ بی بی کا کمرہ کھول رہا ہوں، آپ وہاں چلی جائیں۔" ملازم نے اس سے کہا۔

وہ صبیحہ کے کمرے میں چلی آئی مگر اس کی تشویش اور پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ صبیحہ کے نقطہ نظر کو سمجھ سکتی تھی۔ وہ یقیناً یہ نہیں چاہتی تھی کہ خود صبیحہ اور اس کی فیملی پر کوئی مصیبت آئے۔ اس معاملے میں صبیحہ کے اندیشے درست تھے۔ اگر ہاشم مبین کو یہ پتا چل جاتا کہ اسے صبیحہ کی فیملی نے پناہ دی تھی تو وہ ان کے جانی دشمن بن جاتے۔ شاید اس لئے صبیحہ نے اس سے قانون کی مدد لینے کے لئے کہا تھا مگر یہ راستہ اس کے لئے زیادہ دشوار تھا۔

جماعت کے اتنے بڑے لیڈر کی بیٹی کا اس طرح مذہب چھوڑ دینا پوری جماعت کے منہ پر طمانچے کے مترادف تھا اور وہ جانتے تھے کہ اس سے پورے ملک میں جماعت اور خود ان کے خاندان کو کتنی زک پہنچے گی اور وہ اس بے عزتی سے بچنے کے لئے کس حد تک جا سکتے تھے، امامہ جانتی نہیں تھی، مگر اندازہ کر سکتی تھی۔

وہ صبیحہ کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی جب اس کے ذہن میں ایک جھماکے کے ساتھ سیدہ مریم بطلی کا خیال آیا تھا۔ وہ صبیحہ کی دوست اور کلاس فیلو تھی۔ وہ اس سے کئی بار مل چکی تھی۔ ایک بار صبیحہ کے گھر پر ہی مریم کو اس کے قبول اسلام کا پتا چلا تھا۔ وہ شاید صبیحہ کی واحد دوست تھی جسے صبیحہ نے امامہ کے بارے میں بتا دیا تھا اور مریم بہت حیران نظر آئی تھی۔

"تمہیں اگر کبھی میری کسی مدد کی ضرورت ہوئی تو مجھے ضرور بتانا بلکہ بلاجھجک میرے پاس آ جانا۔"

اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ امامہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ بعد میں بھی امامہ سے ہونے والی ملاقاتوں میں وہ ہمیشہ اس سے اسی گرم جوشی کے ساتھ ملتی رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے اس کا کیوں خیال آیا تھا یا وہ کس حد تک اس کی مدد کر سکتی تھی مگر اس وقت اس نے اس سے بھی رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے موبائل سے فون کرنا چاہا مگر موبائل کی بیٹری ختم ہو چکی تھی۔ اس نے اسے ری چارج کرنے کے لئے لگایا اور خود لاؤنج میں آ کر اپنی ڈائری سے مریم کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

فون ڈاکٹر سبط علی نے اٹھایا تھا۔

"میں مریم سے بات کرنا چاہتی ہوں، میں ان کی دوست ہوں۔"

اس نے اپنا تعارف کروایا۔ اس نے پہلی بار مریم کو فون کیا تھا۔

"میں بات کرواتا ہوں۔" انہوں نے فون ہولڈ رکھنے کا کہا۔ کچھ سیکنڈز کے بعد امامہ نے دوسری طرف مریم کی آواز سنی۔

"ہیلو "

"ہیلو مریم! میں امامہ بات کر رہی ہوں۔"

"امامہ۔ امامہ ہاشم؟" مریم نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

وہ اسے اپنے بارے میں بتاتی گئی۔ دوسری طرف مکمل خاموشی تھی جب اس نے بات ختم کی تو مریم نے کہا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟"

"میں صبیحہ کے گھر پر ہوں، مگر صبیحہ کے گھر پر کوئی نہیں ہے۔ صبیحہ پشاور میں ہے۔"

اس نے صبیحہ کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے میں اسے نہیں بتایا۔

"تم وہیں رہو۔ میں ڈرائیور کو بھجواتی ہوں۔ تم اپنا سامان لے کر اس کے ساتھ آ جاؤ... میں اتنی دیر میں اپنی امی اور ابو سے بات کرتی ہوں۔"

اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ یہ صرف ایک اتفاق تھا کہ اس نے ڈاکٹر سبط علی کے گھر کی جانے والی کال سالار کے موبائل سے نہیں کی تھی ورنہ سکندر عثمان ڈاکٹر سبط علی کے گھر بھی پہنچ جاتے اور اگر امامہ کو یہ خیال آ جاتا کہ وہ موبائل کے بل سے اسے ٹریس آؤٹ کرنے کی کوشش کریں گے تو وہ لاہور آ کر ایک بار بھی موبائل استعمال نہ کرتی۔

یہ ایک اور اتفاق تھا کہ ڈاکٹر سبط علی نے اپنے آفس کی گاڑی اور ڈرائیور کو اسے لینے کے لئے بھجوایا تھا، ورنہ صبیحہ کا ملازم مریم کی گاڑی اور ڈرائیور کو پہچان لیتا کیونکہ مریم اکثر وہاں آیا کرتی تھی اور

صبیحہ کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی یہ جان جاتے کہ وہ صبیحہ کے گھر سے کہاں گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آدھ گھنٹہ کے بعد ملازم نے ایک گاڑی کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ اپنا بیگ اٹھانے لگی۔

"کیا آپ جا رہی ہیں؟"

"ہاں "

"مگر صبیحہ بی بی تو کہہ رہی تھیں کہ آپ یہاں رہیں گی۔"

"نہیں میں جا رہی ہوں اگر صبیحہ کا فون آئے تو آپ اسے بتا دیں کہ میں چلی گئی ہوں۔"

اس نے دانستہ طور پر اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ مریم کے گھر جا رہی تھی۔

☆ ☆......☆

وہ پہلی بار مریم کے گھر گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے وہاں جا کر ایک بار پھر مریم اور اس کے والدین کو اپنے بارے میں سب کچھ بتانا پڑے گا۔ وہ ذہنی طور پر خود کو سوالوں کے لئے تیار کر رہی تھی مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

"ہم لوگ تو ناشتہ کر چکے ہیں تم ناشتہ کر لو۔"

مریم نے پورچ میں اس کا استقبال کیا تھا اور اسے اندر لے جاتے ہوئے کہا۔ اندر لاؤنج میں ڈاکٹر سبط علی اور ان کی بیوی سے اس کا تعارف کروایا گیا۔ وہ بڑے تپاک سے ملے۔ امامہ کے چہرے پر اتنی سراسیمگی اور پریشانی تھی کہ ڈاکٹر سبط علی کو اس پر ترس آیا۔

"میں کھانا لگواتی ہوں۔ مریم تم اسے اس کا کمرہ دکھا دو...... تاکہ یہ کپڑے چینج کر لے۔" سبط علی کی بیوی نے مریم سے کہا۔

وہ جب کپڑے بدل کر آئی تو ناشتہ لگ چکا تھا۔ اس نے خاموشی سے ناشتہ کیا۔

"امامہ! اب آپ جا کر سو جائیں۔ میں آفس جا رہا ہوں، شام کو واپسی پر ہم آپ کے مسئلے پر بات کریں گے۔"

ڈاکٹر سبط علی نے اسے ناشتہ ختم کرتے دیکھ کر کہا۔

"مریم! تم اسے کمرے میں لے جاؤ۔" وہ خود لاؤنج سے نکل گئے۔

وہ مریم کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

"امامہ! اب تم سو جاؤ تمہارے چہرے سے لگ رہا ہے کہ تم پچھلے کئی گھنٹوں سے نہیں سوئیں۔ عام طور پر تھکن اور پریشانی میں نیند نہیں آتی اور تم اس وقت اس کا شکار ہو گی۔ میں تمہیں کوئی ٹیبلٹ لا کر دیتی ہوں اگر نیند آ گئی تو ٹھیک ہے ورنہ ٹیبلٹ لے لینا۔"

وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد اس کی واپسی ہوئی، پانی کا گلاس اور ٹیبلٹ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"تم بالکل ریلیکس ہو کر سو جاؤ۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم سمجھو کہ تم اپنے گھر میں ہو۔" وہ کمرے کی لائٹ آف کر کے ایک بار پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔

صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے مگر ابھی تک باہر بہت دھند تھی اور کمرے کی کھڑکیوں پر پردے ہونے کی وجہ سے کمرے میں اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ اس نے کسی معمول کی طرح ٹیبلٹ پانی کے ساتھ نگل لی۔ اس کے بغیر نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ذہن میں اتنے بہت سے خیالات آ رہے تھے کہ بیڈ پر لیٹ کر نیند کا انتظار کرنا بہت مشکل ہو جاتا۔ چند منٹوں کے بعد اس نے اپنے اعصاب پر ایک غنودگی طاری ہوتی محسوس کی۔

☆ ☆ ☆

وہ جس وقت دوبارہ اٹھی اس وقت کمرہ مکمل طور پر تاریک ہو چکا تھا۔ وہ بیڈ سے اٹھ کر دیوار کی طرف گئی اور اس نے لائٹ جلا دی، وال کلاک رات کے ساڑھے گیارہ بجا رہا تھا۔ وہ فوری طور پر اندازہ نہیں کر سکی کہ یہ اتنی لمبی نیند ٹیبلٹ کا اثر تھی یا پھر پچھلے کئی دنوں سے صحیح طور پر نہ سو سکنے کی۔

"جو کچھ بھی تھا وہ صبح سے بہت بہتر حالت میں تھی۔ اسے بے حد بھوک لگ رہی تھی، مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ گھر کے افراد اس وقت جاگ رہے ہوں گے یا نہیں۔ بہت آہستگی سے وہ دروازہ کھول کر لاؤنج میں نکل آئی۔ ڈاکٹر سبط علی لاؤنج کے ایک صوفے پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا اور اسے دیکھ کر مسکرائے۔

"اچھی نیند آئی؟" وہ بڑی بشاشت سے بولے۔

"جی!" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"اب ایسا کریں کہ وہ سامنے کچن ہے وہاں چلی جائیں۔ کھانا رکھا ہوا ہے۔ گرم کریں۔ وہاں ٹیبل پر ہی کھا لیں اس کے بعد چائے کے دو کپ بنائیں اور یہاں آ جائیں۔"

وہ کچھ کہے بغیر کچن میں چلی گئی۔ فریج میں رکھا ہوا کھانا نکال کر اس نے گرم کیا اور کھانے کے بعد چائے لے کر لاؤنج میں آ گئی۔ چائے کا ایک کپ بنا کر اس نے ڈاکٹر سبط علی کو دیا۔

وہ کتاب میز پر رکھ چکے تھے۔ دوسرا کپ لے کر وہ ان کے بالمقابل دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ اندازہ کر چکی تھی کہ وہ اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے۔

"چائے بہت اچھی ہے۔"

انہوں نے ایک سپ لے کر مسکراتے ہوئے کہا وہ اتنی نروس تھی کہ ان کی تعریف پر مسکرا سکی نہ

شکریہ ادا کر سکی۔ وہ صرف انہیں دیکھتی رہی۔

"امامہ! آپ نے جو فیصلہ کیا ہے اس کے صحیح ہونے میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتی مگر فیصلہ بہت بڑا ہے اور اتنے بڑے فیصلے کرنے کے لئے بہت ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ خاص طور پر اس کم عمری میں، مگر بعض دفعہ فیصلے کرنے کے لئے اتنی جرأت کی ضرورت نہیں ہوتی جتنی ان پر قائم رہنے کے لئے ہوتی ہے۔ آپ کو کچھ عرصہ بعد اس کا اندازہ ہو گا۔"

وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"میں آپ سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا مذہب کی تبدیلی کا فیصلہ صرف مذہب کے لئے ہے یا کوئی اور وجہ بھی ہے۔"

وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"میرا خیال ہے مجھے زیادہ واضح طور پر یہ سوال پوچھنا چاہئے کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کسی لڑکے میں دلچسپی رکھتی ہیں اور اس کے کہنے پر یا اس کے لئے آپ نے گھر سے نکلنے کا فیصلہ کیا ہو یا مذہب بدلنے کا۔ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے آپ یہ مت سوچنا کہ اگر ایسی کوئی وجہ ہوگی تو میں آپ کو برا سمجھوں گا یا آپ کی مدد نہیں کروں گا۔ میں یہ صرف اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ اگر ایسا ہوا تو پھر مجھے اس لڑکے اور اس کے گھر والوں سے بھی ملنا ہو گا۔"

ڈاکٹر سبط علی اب سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس وقت امامہ کو پہلی بار مریم سے اتنی دیر سے رابطہ کرنے پر پچھتاوا ہوا اگر سالار کے بجائے ڈاکٹر سبط علی، جلال سے یا اس کے گھر والوں سے بات کرتے تو شاید "اس نے بوجھل دل سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"کیا آپ کو واقعی یقین ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہے؟" انہوں نے ایک بار پھر پر سکون انداز میں اس سے کہا۔

"جی میں نے اسلام کسی لڑکے کے لئے قبول نہیں کیا۔" وہ اس بار جھوٹ نہیں بول رہی تھی، اس نے اسلام واقعی جلال انصر کے لئے قبول نہیں کیا تھا۔

"پھر آپ کو یہ اندازہ ہونا چاہئے کہ آپ کو کتنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"مجھے اندازہ ہے۔"

"آپ کے والد ہاشم مبین صاحب سے میں واقف ہوں۔ جماعت کے بہت سرگرم اور بارسوخ لیڈر ہیں اور آپ کا ان کے مذہب سے تائب ہو کر اس طرح گھر سے چلے آنا ان کے لئے ایک بہت بڑا دھچکا ہے۔ آپ کو ڈھونڈنے اور واپس لے جانے کے لئے وہ زمین آسمان ایک کر دیں گے۔"

"مگر میں کسی بھی قیمت پر واپس نہیں جاؤں گی۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔"

"گھر آپ نے چھوڑ دیا ہے۔ اب آپ آگے کیا کریں گی؟" امامہ کو اندیشہ ہوا کہ وہ اسے کورٹ میں جانے کا مشورہ دیں گے۔

"میں کورٹ میں نہیں جاؤں گی۔ میں کسی کے بھی سامنے آنا نہیں چاہتی۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سامنے آکر میرے لئے بہت زیادہ مسائل پیدا ہو جائیں گے۔"

"پھر آپ کیا کرنا چاہتی ہیں؟" انہوں نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سامنے نہ آنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ میڈیکل کالج میں اپنی اسٹڈیز جاری نہیں رکھ سکیں گی۔"

"میں جانتی ہوں۔" اس نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

"میں ویسے بھی خود تو میڈیکل کی تعلیم افورڈ کر بھی نہیں سکتی۔"

"اور اگر کسی دوسرے میڈیکل کالج میں کسی دوسرے شہر یا صوبے میں آپ کی مائیگریشن کروا دی جائے تو؟"

"نہیں، وہ مجھے ڈھونڈ لیں گے۔ ان کے ذہن میں بھی سب سے پہلے یہی آئے گا کہ میں مائیگریشن کروانے کی کوشش کروں گی اور اتنے تھوڑے سے میڈیکل کالجز میں مجھے ڈھونڈنا بہت آسان کام ہے۔"

"پھر ....؟"

"میں بی ایس سی میں کسی کالج میں ایڈمیشن لینا چاہتی ہوں مگر کسی دوسرے شہر میں لاہور میں وہ ایک ایک کالج چھان ماریں گے اور میں اپنا نام بھی بدلوانا چاہتی ہوں ..... اگر آپ ان دونوں کاموں میں میری مدد کر سکیں تو میں بہت احسان مند رہوں گی۔"

ڈاکٹر سبط علی بہت دیر خاموش رہے وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ پھر انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔

"امامہ! ابھی کچھ عرصہ آپ کو یہیں رہنا چاہئے، پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ آپ کے گھر والے آپ کی تلاش میں کیا کیا طریقے اختیار کرتے ہیں۔ چند ہفتے انتظار کرتے ہیں پھر دیکھتے ہیں آگے کیا کرنا ہے۔ آپ اس گھر میں بالکل محفوظ ہیں آپ کو اس حوالے سے کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہئے۔ آپ کورٹ میں نہیں جانا چاہتیں؟ میں آپ کو اس کے لئے مجبور بھی نہیں کروں گا اور آپ کو یہ ڈر نہیں ہونا چاہئے کہ کوئی یہاں تک آ جائے گا یا آپ کو زبردستی یہاں سے لے جائے گا۔ آپ کے ساتھ کوئی بھی کسی بھی طرح کی زبردستی نہیں کر سکتا۔"

انہوں نے اس رات اسے بہت سی تسلیاں دی تھیں۔ اسے ڈاکٹر سبط علی کی شکل دیکھ کر بے اختیار ہاشم مبین یاد آتے رہے۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆......☆......☆

دوسرے دن ڈاکٹر سبط علی شام پانچ بجے کے قریب اپنے آفس سے آئے تھے۔

"صاحب آپ کو اپنی اسٹڈی میں بلا رہے ہیں۔"

وہ اس وقت مریم کے ساتھ کچن میں تھی جب ملازم نے آکر اسے پیغام دیا۔

"آؤ امامہ! بیٹھو!" اسٹڈی کے دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہونے پر ڈاکٹر سبط علی نے اس سے کہا وہ اپنی ٹیبل کی ایک دراز سے کچھ پیپرز نکال رہے تھے وہ وہاں رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"آج میں نے کچھ معلومات کروائی ہیں آپ کے بارے میں کہ آپ کے گھر والے آپ کی تلاش میں کہاں تک پہنچے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔"

انہوں نے دراز بند کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سالار سکندر کون ہے؟"

ان کے اگلے سوال نے اس کے دل کی دھڑکن کو چند لمحوں کے لئے روک دیا تھا۔ وہ اب کرسی پر بیٹھے اسے بغور دیکھ رہے تھے۔ اس کے چہرے کی فق ہوتی ہوئی رنگت نے انہیں یہ بتا دیا کہ وہ نام امامہ کے لئے اجنبی نہیں تھا۔

"سالار ! ہمارے ساتھ والے ..... گھر میں ..... رہتا ہے۔" اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"اس نے میری بہت مدد کی ہے۔ گھر سے نکلنے میں .... . اسلام آباد سے لاہور مجھے وہی چھوڑ کر گیا تھا۔"

وہ دانستہ رک گئی۔

"کیا اس کے ساتھ نکاح کے بارے میں بھی بتانا چاہئے؟" وہ گومگو میں تھی۔

"آپ کے والد نے اس کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی ہے، آپ کو اغوا کرنے کے الزام میں۔"

امامہ کے چہرے کی رنگت اور زرد ہو گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ سالار سکندر اتنی جلدی پکڑا جائے گا اور اب اس کے گھر والے یقیناً جلال انصر تک بھی پہنچ جائیں گے اور وہ نکاح اور اس کے بعد کیا وہ یہاں آ جائیں گے۔"

"کیا وہ پکڑا گیا؟" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"نہیں یہ ٹریس آؤٹ کر لیا گیا تھا کہ وہ اس رات کسی لڑکی کے ساتھ لاہور تک آیا تھا لیکن اس کا اصرار ہے کہ وہ آپ نہیں تھیں۔ کوئی دوسری لڑکی تھی۔ اس کی کوئی گرل فرینڈ ..... اور اس نے اس کا ثبوت بھی دے دیا ہے۔"

ڈاکٹر سبط علی نے دانستہ طور پر یہ نہیں بتایا کہ وہ لڑکی کوئی طوائف تھی۔

"پولیس اسے گرفتار اس کے اپنے والد کی وجہ سے نہیں کر سکی۔ اس کے ثبوت دینے کے باوجود آپ کے گھر والوں کا بھی اصرار ہے کہ آپ کی گمشدگی میں وہی ملوث ہے۔ امامہ! کیسا لڑکا ہے یہ سالار سکندر؟"

ڈاکٹر سبط علی نے اسے تفصیل بتاتے ہوئے اچانک پوچھا۔

"بہت برا۔" بے اختیار امامہ کے منہ سے نکلا۔ "بہت ہی برا۔"

"مگر آپ تو یہ کہہ رہی تھیں کہ اس نے آپ کی بہت مدد کی ہے پھر"

"ہاں، اس نے میری مدد کی ہے مگر وہ بہت برے کردار کا لڑکا ہے۔ میری مدد شاید اس نے اس لئے کی ہے کیونکہ میں نے ایک بار اسے فرسٹ ایڈ دی تھی۔ اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی تب اور شاید اس لئے بھی اس نے میری مدد کی ہو گی کیونکہ میرا بھائی اس کا دوست ہے۔ ورنہ وہ بہت برا لڑکا ہے۔ وہ ذہنی مریض ہے۔ پتا نہیں عجیب باتیں کرتا ہے۔ عجیب حرکتیں کرتا ہے۔"

امامہ کے ذہن میں اس وقت اس کے ساتھ کئے گئے سفر کی یاد تازہ تھی جس میں وہ پورا راستہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہوتی رہی تھی۔ ڈاکٹر سبط علی نے سر ہلایا۔

"پولیس آپ کی فرینڈز سے بھی پوچھ گچھ کر رہی ہے اور صبیحہ کے گھر تک بھی پولیس گئی ہے۔ صبیحہ پشاور سے واپس آ گئی ہے، مگر مریم نے صبیحہ کو یہ نہیں بتایا کہ آپ ہمارے یہاں ہیں۔ آپ اب صبیحہ سے رابطہ مت کریں۔ اسے فون بھی مت کریں کیونکہ ابھی وہ اس کے گھر کو انڈر آبزرویشن رکھیں گے اور فون کو بھی وہ خاص طور پر چیک کریں گے، بلکہ آپ اب کسی بھی دوست سے فون پر کانٹیکٹ مت کریں نہ ہی یہاں سے باہر جائیں۔"

انہوں نے اسے ہدایات دیں۔

"میرے پاس موبائل ہے۔ اس پر بھی بات نہیں کر سکتی؟"

وہ چونکے۔

"آپ کا موبائل ہے؟"

"نہیں، اسی لڑکے سالار کا ہے۔"

وہ سالار تک پہنچ گئے تو موبائل تک بھی پہنچ جائیں گے۔" وہ بات کرتے کرتے رک گئے۔

"جو کال آپ نے ہمارے گھر کی تھی وہ اس موبائل سے کی تھی؟" اس بار ان کی آواز میں کچھ تشویش تھی۔

"نہیں، وہ میں نے صبیحہ کے گھر سے کی تھی۔"

"آپ اب اس موبائل پر دوبارہ کوئی کال کرنا نہ کال ریسیو کرنا۔"

وہ کچھ مطمئن ہو گئے۔

☆......☆ ☆

اگلے کچھ دنوں میں اسے ڈاکٹر سبط علی سے اس کی تلاش کے سلسلے میں اور خبریں موصول ہوتی رہی تھیں۔ ان کے ذرائع معلومات جو بھی تھے مگر وہ بے حد باوثوق تھے۔ اسے ہر جگہ ڈھونڈا جا رہا تھا۔ میڈیکل کالج، ہاسٹل، کلاس فیلوز...... ہاسٹل، روم میٹس اور فرینڈز ہاشم مبین نے اسے ڈھونڈنے کے لئے نیوز پیپر کا سہارا نہیں لیا تھا۔ میڈیا کی مدد لینے کا نتیجہ ان کے لئے رسوا کن ثابت ہوتا۔

وہ جس حد تک اس کی گمشدگی کو خفیہ رکھنے کی کوشش کر سکتے تھے کر رہے تھے، مگر وہ پولیس کی مدد حاصل کئے ہوئے تھے۔ ان کی جماعت بھی اس سلسلے میں ان کی پوری مدد کر رہی تھی۔

وہ لوگ صبیحہ تک پہنچ گئے تھے مگر وہ یہ جان نہیں پائے تھے کہ وہ لاہور آنے کے بعد اس کے گھر گئی تھی۔ شاید یہ صبیحہ کے ان دنوں پشاور میں ہونے کا نتیجہ تھا جن دنوں امامہ اپنے گھر سے چلی آئی تھی۔ ورنہ شاید صبیحہ اور اس کے گھر والوں کو بھی کچھ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا۔

مریم نے صبیحہ کو امامہ کی اپنے ہاں موجودگی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس نے مکمل طور پر یوں ظاہر کیا تھا جیسے امامہ کی اس طرح کی گمشدگی باقی اسٹوڈنٹس کی طرح اس کے لئے بھی حیران کن بات تھی۔

☆ ☆ ─ ☆

چند ہفتے گزر جانے کے بعد جب امامہ کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ ڈاکٹر سبط علی کے ہاں محفوظ ہے اور کوئی بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تو اس نے سالار سکندر کو فون کیا۔ وہ اس سے نکاح کے پیپرز لینا چاہتی تھی اور تب پہلی بار یہ جان کر اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی کہ سالار نے نہ تو طلاق کا حق اسے تفویض کیا تھا اور نہ ہی وہ اسے طلاق دینے کا کوئی ارادہ رکھتا تھا۔

ڈاکٹر سبط علی کے گھر پہنچنے کے بعد اس نے پہلی بار موبائل کا استعمال کیا تھا اور وہ بھی کسی کو بتائے بغیر اور سالار سے فون پر بات کرنے کے بعد اسے اپنی حماقت کا شدت سے احساس ہوا اسے سالار جیسے شخص پر کبھی بھی اس حد تک اعتماد نہیں کرنا چاہئے تھا اور اسے پیپرز کو دیکھنے میں کتنا وقت لگ سکتا تھا جو اس نے انہیں دیکھنے سے اجتناب کیا اور پھر آخر اس نے پیپرز کی ایک کاپی فوری طور پر اس سے کیوں نہیں لی۔ کم از کم اس وقت جب وہ اپنے گھر سے نکل آئی تھی۔

اسے اب اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شخص اس کے لئے کتنی بڑی مصیبت بن گیا تھا اور آئندہ آنے والے دنوں میں ─ وہ اب ہر بات پر پچھتا رہی تھی۔ اگر اسے اندازہ ہوتا کہ وہ ڈاکٹر سبط علی جیسے آدمی کے پاس پہنچ جائے گی تو وہ کبھی بھی نکاح کرنے کی حماقت نہ کرتی اور سالار جیسے آدمی کے ساتھ تو کبھی

بھی نہیں۔

اور اگر اسے یقین ہوتا کہ ڈاکٹر سبط علی ہر حالت میں اس کی مدد کریں گے تو وہ کم از کم سالار کے بارے میں ان سے جھوٹ نہ بولتی پھر وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتے، مگر اب جب وہ انہیں بڑے دعوے اور یقین کے ساتھ یہ یقین دلا چکی تھی کہ وہ کسی لڑکے کے ساتھ کسی بھی طرح انوالو نہیں تھی تو اس نکاح کا انکشاف اور وہ بھی اس لڑکے کے ساتھ... جس کی برائیوں کے بارے میں وہ ڈاکٹر سبط علی سے بات کر چکی تھی اور جس کے بارے میں وہ یہ بھی جانتے تھے کہ امامہ کے والدین نے اس کے خلاف اغوا کا کیس فائل کیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اگر اب ڈاکٹر سبط علی کو یہ حقائق بتانے کی کوشش کرے گی تو ان کا ردعمل کیا ہوگا اور وہ کم از کم اس وقت یہ واحد ٹھکانہ کھونے کے لئے تیار نہیں تھی۔

اگلے کئی دن اس کی بھوک پیاس بالکل ختم ہو گئی۔ مستقبل یک دم بھوت بن گیا تھا اور سالار سکندر اسے اس شخص سے اتنی نفرت محسوس ہو رہی تھی کہ اگر وہ اس کے سامنے آ جاتا تو وہ اسے شوٹ کر دیتی۔ اسے عجیب عجیب خدشے اور اندیشے تنگ کرتے رہتے۔ پہلے اگر اسے صرف اپنے گھر والوں کا خوف تھا تو اب اس خوف کے ساتھ سالار کا خوف بھی شامل ہو گیا تھا اگر اس نے بھی میری تلاش شروع کر دی تو اور اس کے ساتھ ہی اس کی حالت غیر ہونے لگی۔

ان کا وزن یک دم کم ہونے لگا تھا۔ وہ پہلے بھی خاموش رہتی تھی مگر اب اس کی خاموشی میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ شدید ذہنی دباؤ میں تھی اور یہ سب کچھ ڈاکٹر سبط علی اور ان کے گھر کے افراد سے پوشیدہ نہیں تھا۔ ان سب نے اس سے باری باری ان اچانک آنے والی تبدیلیوں کی وجہ جاننے کی کوشش کی لیکن وہ انہیں ٹالتی رہی۔

"تم پہلے بھی اداس اور پریشان لگتی تھی مگر اب ایک دو ہفتے سے بہت زیادہ پریشان لگتی ہو۔ کیا پریشانی ہے امامہ؟"

سب سے پہلے مریم نے اس سے اس بارے میں پوچھا تھا۔

"نہیں، کوئی پریشانی نہیں۔ بس میں گھر کو مس کرتی ہوں۔"

امامہ نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں، میں یہ نہیں مان سکتی۔ آخر اب اچانک اتنا کیوں مس کرنے لگی ہو کہ کھانا پینا بھول گئی ہو۔ چہرہ زرد ہو گیا ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑنے لگے ہیں اور وزن کم ہوتا جا رہا ہے۔ کیا تم بیمار ہونا چاہتی ہو؟"

وہ مریم کی کہی ہوئی کسی بات کو رد نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ظاہری حالت دیکھ کر کوئی بھی اس کی پریشانی کا اندازہ بآسانی لگا سکتا تھا اور شاید یہ اندازہ بھی کہ یہ پریشانی کسی نئے مسئلے کا نتیجہ

تھی مگر وہ اس معاملے میں بے بس تھی۔ وہ سالار کے ساتھ ہونے والے نکاح اور اس سے متعلقہ خدشات کو اپنے ذہن سے نکال نہیں پا رہی تھی۔

"مجھے اب اپنے گھر والے زیادہ یاد آنے لگے ہیں۔ جوں جوں دن گزر رہے ہیں وہ مجھے زیادہ یاد آ رہے ہیں۔"

امامہ نے مدھم آواز میں اس سے کہا اور یہ جھوٹ نہیں تھا، اسے واقعی اب اپنے گھر والے پہلے سے زیادہ یاد آنے لگے تھے۔

وہ کبھی بھی اتنا لمبا عرصہ ان سے الگ نہیں رہی تھی اور وہ بھی مکمل طور پر اس طرح کٹ کر۔ لاہور ہاسٹل میں رہتے ہوئے بھی وہ مہینے میں ایک بار ضرور اسلام آباد جاتی اور ایک دو بار وسیم یا ہاشم بھی لاہور اس سے ملنے چلے آتے اور فون تو وہ اکثر ہی کرتی رہتی تھی مگر اب یک دم اسے یوں لگنے لگا تھا جیسے وہ سمندر میں موجود کسی ویران جزیرے پر آن بیٹھی ہو۔ جہاں دور دور تک کوئی تھا ہی نہیں اور وہ چہرے جن سے اسے سب سے زیادہ محبت تھی وہ خوابوں اور خیالوں کے علاوہ نظر آ ہی نہیں سکتے تھے۔

پتہ نہیں مریم اس کے جواب سے مطمئن ہوئی یا نہیں مگر اس نے موضوع بدل دیا تھا۔ شاید اس نے سوچا ہو گا کہ اس طرح اس کا ذہن بٹ جائے گا۔

☆.....☆ ☆

ڈاکٹر سبط علی کی تین بیٹیاں تھیں، مریم ان کی تیسری بیٹی تھی۔ ان کی بڑی دونوں بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ جب کہ مریم ابھی میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ ڈاکٹر سبط علی نے امامہ کو اپنی بڑی دونوں بیٹیوں سے بھی متعارف کروایا تھا۔ وہ دونوں بیرون شہر مقیم تھیں اور ان کا رابطہ زیادہ تر فون کے ذریعہ ہی ہوتا تھا مگر یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ امامہ کے وہاں آنے کے چند ہفتوں کے دوران وہ دونوں باری باری کچھ دنوں کے لئے وہاں آئیں۔

امامہ سے ان کا رویہ مریم سے مختلف نہیں تھا۔ ان کے رویے میں اس کے لئے محبت اور مانوسیت کے علاوہ کچھ نہیں تھا لیکن امامہ کو انہیں دیکھ کر ہمیشہ اپنی بڑی بہنیں یاد آ جاتیں اور پھر جیسے سب کچھ یاد آ جاتا۔ اپنا گھر...... بابا بڑے بھائی...... وسیم...... اور سعد... سعد سے اس کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ ان کی جماعت کے بااثر خاندان اپنے گھروں میں اولاد ہونے کے باوجود بے سہارا یا یتیم بچوں میں سے کسی ایک لڑکے کو گود لینے لگے تھے۔ یہ اپنی جماعت کے افراد کی مستقبل میں تعداد بڑھانے کے لئے کوششوں کا ایک ضروری حصہ تھی۔ ایسا بچہ ہمیشہ عام مسلمانوں کے بچوں میں سے ہی ہوتا اور ہمیشہ لڑکا ہوتا۔ سعد بھی اسی سلسلے میں بہت چھوٹی عمر میں اس کے گھر آیا تھا۔ وہ اس وقت اسکول کے آخری سالوں میں تھی اور اسے گھر میں ہونے والے اس عجیب اضافے نے کچھ حیران کیا تھا۔

"ہم لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے احسانات کا شکر ادا کرنے کے لئے سعد کو گود لیا ہے، تاکہ ہم بھی دوسرے لوگوں پر احسانات کر سکیں اور نیکی کا یہ سلسلہ جاری رہے۔"

اس کی امی نے اس کے استفسار پر اسے بتایا تھا۔

"تم سمجھو، وہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔"

تب اسے اپنے بابا اور امی پر بہت فخر ہوا تھا۔ وہ کتنے عظیم لوگ تھے کہ ایک بے سہارا بچے کو اچھی زندگی دینے کے لئے گھر لے آئے تھے، اسے اپنا نام دے رہے تھے۔ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو اس کے ساتھ بانٹ رہے تھے۔ اس نے تب غور نہیں کیا تھا کہ ایسا ہی ایک بچہ اس کے تایا اعظم کے گھر پر بھی کیوں تھا۔ ایسا ہی ایک بچہ اس کے چھوٹے چچا کے گھر پر کیوں تھا؟ ایسے ہی بہت سے دوسرے بچے ان کے جاننے والے کچھ اور بااثر خاندانوں کے گھر پر کیوں تھے؟ اس کے لئے بس یہی کافی تھا کہ وہ ایک اچھا کام کر رہے تھے۔ ان کی جماعت ایک "اچھے کام" کی ترویج کر رہی تھی۔ یہ اس نے بہت بعد میں جانا تھا کہ اس "اچھے کام" کی حقیقت کیا تھی؟

سعد اس سے بہت مانوس تھا۔ اس کا زیادہ وقت امامہ کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ وہ شروع کے کئی سال امامہ کے کمرے میں اس کے بیڈ پر ہی سوتا رہا۔ اسلام قبول کر لینے کے بعد میڈیکل کالج سے وہ جب بھی اسلام آباد آتی، وہ سعد کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بتاتی رہتی۔ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ کسی چیز کو منطقی طریقے سے نہیں سمجھایا جا سکتا تھا مگر وہ اس سے صرف ایک بات کہتی رہی۔

"جیسے اللہ ایک ہوتا ہے اسی طرح ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ایک ہی ہیں۔ ان سا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔"

وہ اسے ساتھ یہ تاکید بھی کرتی رہتی کہ وہ ان دونوں کی آپس کی باتوں کے بارے میں کسی کو بھی نہیں بتائے اور امامہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی یہ کوشش بے کار تھی۔ سعد کو بچپن ہی سے مذہبی اجتماعات میں لے جایا جانے لگا تھا اور وہ اس اثر کو قبول کر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ یہ سوچتی رہتی کہ وہ میڈیکل کی تعلیم کے بعد سعد کو لے کر اپنے گھر والوں سے الگ ہو جائے گی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ کس قدر مشکل کام تھا۔

اس نے گھر سے بھاگتے ہوئے بھی سعد کو اپنے ساتھ لے آنے کا سوچا تھا مگر یہ کام ناممکن تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اسے لاتے ہوئے خود بھی پکڑی جائے۔ وہ اسے وہیں چھوڑ آئی تھی اور اب ڈاکٹر سبط علی کے پاس پہنچ جانے کے بعد اسے اس کا بار بار خیال آتا۔ اگر وہ کسی طرح اسے وہاں لے آتی تو وہ بھی اس دلدل سے نکل سکتا تھا مگر ان تمام سوچوں، تمام خیالوں نے اپنے گھر والوں کے لئے اس کی محبت کو کم نہیں کیا۔ نہ اپنے گھر والوں کے لئے، نہ جلال انصر کے لئے۔

وہ ان کا خیال آنے پر جو رونا شروع ہوتی تو ساری رات روتی ہی رہتی۔ شروع کے دنوں میں وہ

ایک الگ کمرے میں تھی اور مریم کو اس کا اندازہ نہیں تھا مگر ایک رات وہ اچانک اس کے کمرے میں اپنی کوئی کتاب لینے آئی۔ رات کے پچھلے پہر اسے قطعاً یہ اندازہ نہیں تھا کہ امامہ جاگ رہی ہو گی اور نہ صرف جاگ رہی ہو گی بلکہ رو رہی ہو گی۔

امامہ کمرے کی لائٹ آف کئے اپنے بیڈ پر کمبل اوڑھے رو رہی تھی جب اچانک دروازہ کھلا تو اس نے کمبل سے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ وہ نہیں جانتی تھی مریم کو کیسے اس کے جاگنے کا اندازہ ہوا تھا۔

"امامہ! جاگ رہی ہو؟"

اس نے امامہ کو آواز دی۔ امامہ نے حرکت نہیں کی مگر پھر مریم اس کی طرف چلی آئی اور اس نے کمبل اس کے چہرے سے ہٹا دیا۔

"میرے اللہ تم رو رہی ہو اور اس وقت !؟"

وہ اس کے پاس ہی تشویش کے عالم میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔ امامہ کی آنکھیں بری طرح سوجی ہوئی تھیں اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا، مگر اسے سب سے زیادہ ندامت اس طرح پکڑے جانے کی تھی۔

"اس لئے تمہیں راتوں کو نیند نہیں آتی کیونکہ تم روتی رہتی ہو اور صبح یہ کہہ دیتی ہو کہ رات کو سونے میں وقت ہوئی اس لئے آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔ بس تم آج سے یہاں نہیں سوؤ گی۔ اٹھو میرے کمرے میں چلو۔"

اس نے کچھ برہمی کے عالم میں اسے کھینچ کر اٹھایا۔ امامہ ایک لفظ نہیں بول سکی۔ وہ اس وقت بے حد شرمندہ تھی۔

مریم نے اس کے بعد اسے اپنے کمرے میں ہی سلانا شروع کر دیا۔ راتوں کو دیر تک رونے کا وہ سلسلہ ختم ہو گیا مگر نیند پر اس کا اب بھی کوئی اختیار نہیں تھا۔ اسے نیند بہت دیر سے آتی تھی۔

کئی بار مریم کی عدم موجودگی میں اس کی میڈیکل کی کتابیں دیکھتی اور اس کا دل بھر آتا۔ وہ جانتی تھی سب کچھ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

صبح مریم اور ڈاکٹر سبط علی کے گھر سے چلے جانے کے بعد وہ سارا دن آنٹی کے ساتھ گزار دیتی یا شاید وہ سارا دن اس کے ساتھ رہنے کی کوشش کرتی تھیں۔ وہ اسے اکیلا نہ رہنے دینے کی کوشش میں مصروف رہتی تھیں مگر ان کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی وہ جانے کن کن سوچوں میں ڈوبی رہتی تھی۔

اس نے سالار کے ساتھ دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جانتی تھی اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس کی ذہنی پریشانی میں اضافے کے علاوہ اس رابطے سے اسے کچھ حاصل نہیں ہونے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

اسے ڈاکٹر سبط علی کے ہاں آئے تین ماہ ہو گئے تھے جب ایک دن انہوں نے رات کو اسے بلایا۔

"آپ کو اپنا گھر چھوڑے کچھ وقت گزر گیا ہے۔ آپ کے گھر والوں نے آپ کی تلاش ابھی تک ختم تو نہیں کی ہو گی مگر چند ماہ پہلے والی تندی و تیزی نہیں رہی ہو گی اب میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ اب آگے کیا کرنا چاہتی ہیں۔"

انہوں نے مختصر تمہید کے بعد کہا۔

"میں نے آپ کو بتایا تھا میں اسٹڈیز جاری رکھنا چاہتی ہوں۔"

وہ اس کی بات پر کچھ دیر خاموش رہے پھر انہوں نے کہا۔

"امامہ! آپ نے اپنی شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" وہ ان سے اس سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

"شادی ... ؟ کیا مطلب ؟" وہ بے اختیار ہکلائی۔

"آپ جن حالات سے گزر رہی ہیں ان میں آپ کے لئے سب سے بہترین راستہ شادی ہی ہے کسی اچھی فیملی میں شادی ہو جانے سے آپ اس عدم تحفظ کا شکار نہیں رہیں گی جس کا شکار آپ ابھی ہیں۔ میں چند اچھے لڑکوں اور فیملیز کو جانتا ہوں میں چاہتا ہوں ان میں سے کسی کے ساتھ آپ کی شادی کر دی جائے۔"

وہ بالکل سفید چہرے کے ساتھ انہیں چپ چاپ دیکھتی رہی۔ وہ ان کے پاس آنے سے بہت پہلے اپنے لئے اسی حل کو منتخب کر چکی تھی اور اسی ایک حل کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ سالار سکندر سے نکاح کی حماقت کر چکی تھی۔

اس وقت اگر وہ سالار سکندر سے نکاح نہ کر چکی ہوتی تو وہ بلا حیل و حجت ڈاکٹر سبط علی کی بات ماننے پر تیار ہو جاتی۔ وہ جانتی تھی ان حالات میں کسی اچھی فیملی میں شادی اسے کتنی اور کن مصیبتوں سے بچا سکتی تھی۔ اس نے آج تک کبھی خود مختار زندگی نہیں گزاری تھی۔ وہ اپنی ہر چیز کے لئے اپنی فیملی کی محتاج رہی تھی اور وہ یہ تصور کرتے ہوئے بھی خوفزدہ رہتی تھی کہ آخر وہ کب اور کس طرح صرف اپنے بل بوتے پر زندگی گزار سکے گی۔

مگر سالار سے وہ نکاح اس کے گلے کی ایسی ہڈی بن گیا تھا جسے وہ نہ نگل سکتی تھی اور نہ اگل سکتی تھی۔

"نہیں میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟" اس کے پاس اس سوال کا جواب موجود تھا، مگر حقیقت بتانے کے لئے حوصلہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر سبط علی اس کے بارے میں کیا سوچتے یہ کہ وہ ایک جھوٹی لڑکی ہے جو اب تک انہیں دھوکا دیتے ہوئے ان کے پاس رہ رہی تھی۔

"یا یہ کہ شاید..... وہ سالار سے شادی کے لئے ہی اپنے گھر سے نکلی تھی اور باقی سب کچھ کے بارے میں جھوٹ بول رہی تھی۔

اور اگر انہوں نے حقیقت جان لینے پر اس کی مدد سے معذرت کر لی یا اسے گھر سے چلے جانے کا کہا تو .... ؟ اور اگر انہوں نے اس کے والدین سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو ....؟" وہ تین ماہ سے ڈاکٹر سبط علی کے پاس تھی۔ وہ کتنے اچھے انسان تھے وہ بخوبی جانتی تھی لیکن وہ اس قدر خوفزدہ اور محتاط تھی کہ وہ کسی قسم کا رسک لینے پر تیار نہیں تھی۔

"میں پہلے اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں تاکہ کسی پر بھی بوجھ نہ بنوں۔ کسی پر بھی شادی کر لینے کی صورت میں اگر مجھے بعد میں کبھی کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تو میں کیا کروں گی۔ اس وقت تو میرے لئے شاید تعلیم حاصل کرنا بھی ممکن نہیں رہے گا۔"

اس نے ایک لمبی خاموشی کے بعد جیسے کسی فیصلہ پر پہنچتے ہوئے ڈاکٹر سبط علی سے کہا۔

"امامہ ! ہم ہمیشہ آپ کی مدد کرنے کے لئے موجود رہیں گے۔ آپ کی شادی کر دینے کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ میرے گھر سے آپ کا تعلق ختم ہو جائے گا یا میں آپ سے جان چھڑانا چاہتا ہوں آپ میرے لئے چوتھی بیٹی ہیں۔"

امامہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میں آپ پر کوئی دباؤ نہیں ڈالوں گا جو آپ چاہیں گی وہی ہو گا یہ صرف میری ایک تجویز تھی۔"

ڈاکٹر سبط علی نے کہا۔

"کچھ سال گزر جانے دیں اس کے بعد میں شادی کر لوں گی۔ جہاں بھی آپ کہیں گے۔" اس نے ڈاکٹر سبط علی سے کہا "مگر ابھی فوری طور پر نہیں۔"

ابھی مجھے سالار سکندر سے جان چھڑانی ہے۔ اس سے طلاق لینے کا کوئی راستہ تلاش کرنا ہے۔" وہ ان سے بات کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"کس شہر میں پڑھنا چاہتی ہیں آپ؟"

ڈاکٹر سبط علی نے اس پر مزید کوئی دباؤ نہیں ڈالا۔

"کسی بھی شہر میں، میری کوئی ترجیح نہیں ہے۔" اس نے ان سے کہا۔

☆ ..... ☆ ..... ☆

وہ اپنے گھر سے آتے ہوئے، اپنے سارے ڈاکومنٹس اپنے پاس موجود زیورات اور رقم بھی لے آئی تھی۔ جب ڈاکٹر سبط علی نے اس گفتگو کے چند دن بعد ایک دن اسے بلا کر ملتان میں اس کے ایڈمیشن کے فیصلے کے بارے میں بتانے کے ساتھ اس کے ڈاکومنٹس کے بارے میں پوچھا تو وہ اس بیگ کو لے کر

ان کے پاس چلی آئی اس نے ڈاکومنٹس کا ایک لفافہ نکال کر انہیں دیا پھر زیورات کا لفافہ نکال کر بھی ان کی میز پر رکھ دیا۔

"میں یہ زیورات اپنے گھر سے لائی ہوں۔ یہ بہت زیادہ تو نہیں ہیں مگر پھر بھی اتنے ہیں کہ انہیں بیچ کر کچھ عرصہ میں آسانی سے اپنی تعلیم کے اخراجات اٹھا سکتی ہوں۔"

"نہیں، یہ زیورات بیچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ آپ کی شادی میں آپ کے کام آئیں گے جہاں تک تعلیمی اخراجات کا تعلق ہے تو آپ کو پتا ہونا چاہئے کہ آپ میری ذمہ داری ہیں۔ آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ بات کرتے کرتے چونکے۔ ان کی نظر اس کے ٹیبل پر رکھے چھوٹے سے کھلے بیگ کے اندر تھی۔ امامہ نے ان کی نظروں کا تعاقب کیا۔ وہ بیگ میں نظر آنے والے چھوٹے سے پستول کو دیکھ رہے تھے۔ امامہ نے قدرے شرمندگی کے عالم میں اس پسٹل کو بھی نکال کر ٹیبل پر رکھ دیا۔

"یہ میرا پسٹل ہے۔ میں یہ بھی گھر سے لائی ہوں، میں نے آپ کو بتایا تھا مجھے سالار سے مدد لینی تھی اور وہ اچھا لڑکا نہیں تھا۔"

وہ انہیں اس کے بارے میں مزید نہیں بتا سکتی تھی۔ ڈاکٹر سبط علی پستول کو اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔

"چلانا آتا ہے آپ کو اسے؟"

امامہ نے افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔

"کالج میں این سی سی کی ٹریننگ ہوتی تھی۔ میرا بھائی وسیم بھی رائفل شوٹنگ کلب میں جایا کرتا تھا کبھی کبھار مجھے بھی ساتھ لے جاتا تھا۔ میں نے اپنے بابا سے ضد کر کے خریدا تھا۔ یہ گولڈ پلیٹڈ ہے۔"

وہ ان کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کو دیکھتے ہوئے مدھم آواز میں کہہ رہی تھی۔

"آپ کے پاس اس کا لائسنس ہے؟"

"ہے مگر وہ ساتھ لے کر نہیں آئی۔"

"پھر آپ اسے یہیں پر رہنے دیں۔ ملتان ساتھ لے کر نہ جائیں۔ زیورات کو لاکر میں رکھوا دیتے ہیں۔" امامہ نے سر ہلا دیا۔

☆......☆ ☆

وہ چند ماہ کے بعد ملتان اپنی اسٹڈیز کے سلسلے کو ایک بار پھر جاری رکھنے کے لئے آ گئی تھی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر، دوسرے شہر سے تیسرے شہر ایک ایسا شہر جس کے بارے میں اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا، مگر اس نے تو خواب میں اور بہت کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ کیا اس نے کبھی یہ سوچا تھا کہ وہ بیس سال کی عمر میں ایک بار پھر بی ایس سی میں داخلہ لے گی۔ اس عمر میں جب لڑکیاں بی ایس سی کر

چکی ہوتی ہیں ...

کیا اس نے کبھی یہ سوچا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے میڈیکل کالج چھوڑ دے گی۔

کیا اس نے کبھی یہ سوچا تھا کہ وہ اپنے والدین کے لئے کبھی اس قدر تکلیف اور شرمندگی کا باعث بنے گی۔

کیا اس نے کبھی یہ سوچا تھا کہ وہ اسجد کے بجائے کسی اور سے محبت کرے گی اور پھر اس سے شادی کے لئے یوں پاگلوں کی طرح کوشش کرے گی۔

کیا اس نے کبھی یہ سوچا تھا کہ ان کوششوں میں ناکامی کے بعد وہ سالار سکندر جیسے کسی لڑکے کے ساتھ اپنی مرضی سے نکاح کر لے گی۔

اور کیا اس نے یہ سوچا تھا کہ ایک بار گھر سے نکل جانے کے بعد اسے ڈاکٹر سبط علی کے گھرانے جیسا گھر مل سکے گا۔

اسے باہر کی دنیا میں پھرنے کی عادت نہیں تھی اور اسے باہر کی دنیا میں پھرنا نہیں پڑا تھا۔ اپنے گھر سے نکلتے وقت اس نے اللہ سے اپنی حفاظت کی بے تحاشا دعائیں مانگی تھیں۔ اس نے دعائیں کی تھیں کہ اسے دربدر نہ پھرنا پڑے۔ وہ اتنی بولڈ نہیں تھی کہ وہ مردوں کی طرح ہر جگہ دندناتی پھرتی۔

اور وہ اتنی نہیں جانتی تھی کہ جب اسے اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں کے سلسلے میں خود جگہ جگہ پھرنا پڑے گا۔ ہر طرح کے مردوں اور لوگوں کا سامنا کرنا پڑے گا تو وہ کیسے کرے گی۔ وہ بھی اس صورت میں جب کہ اس کے پیچھے فیملی بیک گراؤنڈ نام کی کوئی چیز نہیں رہی تھی۔

اپنی فیملی کے سائے کے نیچے لاہور آ کر میڈیکل کالج میں پڑھنا اور آگے تعلیم حاصل کرنے کے لئے باہر جانے کے خواب دیکھنا اور بات تھی ... تب اس کے لئے کوئی مالی مسائل نہیں تھے اور ہاشم مبین احمد کے پاس اتنی دولت اور اثر و رسوخ تھا کہ صرف ہاشم مبین احمد کے نام کا حوالہ کسی بھی شخص کو اس سے بات کرتے ہوئے مرعوب اور محتاط کر دینے کے لئے کافی تھا۔

گھر سے نکلنے کے بعد اسے جس ماحول کے سامنے کا خدشہ تھا اس ماحول کا سامنا اسے نہیں کرنا پڑا تھا۔ پہلے سالار سکندر اسے بخیریت لاہور چھوڑ گیا تو اور اس کے بعد ڈاکٹر سبط علی تک رسائی جس کے بعد اسے اپنے چھوٹے بڑے کسی کام کے لئے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

ڈاکومنٹس میں نام کی تبدیلی، ملتان میں ایڈمیشن ہاسٹل میں رہائش کا انتظام ---- اس کے تعلیمی اخراجات کی ذمہ داری وہ اس ایک نعمت کے لئے اللہ کا جتنا شکر ادا کرتی وہ کم تھا۔ کم از کم اسے کسی برے ماحول میں بقا کی جنگ لڑنے کے لئے جگہ جگہ دھکے کھانے نہیں پڑے تھے۔

☆......☆ ☆

وہ ملتان چلی آئی، یہ اس کے لئے زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ ایک مشکل اور تکلیف دہ دور۔ وہ ہاسٹل میں رہ رہی تھی اور وہ عجیب زندگی تھی۔ بعض دفعہ اسے اسلام آباد میں اپنا گھر اور خاندان کے لوگ اتنی شدت سے یاد آتے کہ اس کا دل چاہتا وہ بھاگ کر ان کے پاس پہنچ جائے۔ بعض دفعہ وہ بغیر کسی وجہ کے رونے لگتی۔ بعض دفعہ اس کا دل چاہتا وہ جلال انصر سے رابطہ کرے۔ اسے وہ بے تحاشا یاد آتا۔ وہ بی ایس سی کر رہی تھی اور اس کے ساتھ بی ایس سی کرنے والی لڑکیاں وہی تھیں جو ایف ایس سی میں میرٹ لسٹ پر نہیں آسکی تھیں اور اب وہ بی ایس سی کرنے کے بعد میڈیکل کالج میں جانے کی خواہش مند تھیں۔

"میڈیکل کالج ڈاکٹر" اس کے لئے بہت عرصے تک یہ دونوں الفاظ نشتر بنے رہے۔ کئی بار وہ اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ کر حیران ہوتی رہتی۔ آخر وہاں کیا تھا جو ہر چیز کو مٹھی کی ریت بنا رہا تھا۔ کئی بار اسے جویریہ سے کی جانے والی اپنی باتیں یاد آتیں۔

"میں اگر ڈاکٹر نہیں بن سکی تو میں تو زندہ ہی نہیں رہ سکوں گی۔ میں مر جاؤں گی۔"

وہ حیران ہوتی، وہ مری تو نہیں تھی۔ اسی طرح زندہ تھی۔

"پاکستان کی سب سے مشہور آئی اسپیشلسٹ؟"

سب کچھ ایک خواب ہی رہا تھا..... وہ ہر چیز کے اتنے پاس تھی، وہ ہر چیز سے اتنا دور تھی۔

اس کے پاس گھر نہیں تھا۔

اس کے پاس گھر والے نہیں تھے۔ اس کے پاس اسجد نہیں تھا۔ میڈیکل کی تعلیم نہیں تھی۔ جلال بھی نہیں تھا۔ وہ زندگی کی ان آسائشوں سے ایک ہی جھٹکے میں محروم ہو گئی تھی جن کی وہ عادی تھی اور اس کے باوجود وہ زندہ تھی۔ امامہ کو کبھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس قدر بہادر تھی یا کبھی ہو سکتی تھی مگر وہ ہو گئی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تکلیف میں کمی ہونا شروع ہو گئی تھی۔ یوں جیسے اسے صبر آ رہا تھا۔ اللہ کے بعد شاید زمین پر یہ ڈاکٹر سبط علی تھے جن کی وجہ سے وہ آہستہ آہستہ سنبھلنے لگی تھی۔ مہینے میں ایک بار ایک اینڈ پر وہ ان کے پاس لاہور آتی۔ وہ وقتاً فوقتاً اسے ہاسٹل فون کرتے رہتے، اسے کچھ نہ کچھ بھجواتے رہتے۔ ان کی بیٹیاں اور بیوی بھی اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ وہ ان کے نزدیک ان کے گھر کا ایک فرد بن چکی تھی اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو میرا کیا ہوتا۔ وہ کئی بار سوچتی۔

☆ ☆ ☆

ملتان میں اپنے قیام کے دوران بھی اس نے سالار سکندر کو کبھی اپنے ذہن سے فراموش نہیں کیا تھا۔ تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ طور پر شروع کرنے کے بعد وہ ایک بار اس سے رابطہ کرنا چاہتی تھی اور اگر وہ

پھر اسے طلاق دینے سے انکار کر دیتا تو وہ اب بالآخر ڈاکٹر سبط علی کو اس تمام معاملے کے بارے میں بتا دینا چاہتی تھی۔

اور سالار سے رابطہ اس نے بی ایس سی کے امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد لاہور آنے سے پہلے کیا۔ اپنے پاس موجود سالار کے موبائل کا استعمال وہ بہت پہلے ترک کر چکی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ دو سال کے عرصے میں سالار دوبارہ اسی موبائل نمبر کو استعمال کرنا شروع کر چکا ہے یا پھر اس نئے نمبر کو استعمال کر رہا تھا، جو اس نے اسے اپنا موبائل دے دینے کے بعد دیا تھا۔

ایک پی سی او سے اس نے سب سے پہلے اس کا نیا نمبر ڈائل کیا۔ وہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں تھا، پھر اس نے اپنے پاس موجود موبائل کے نمبر کو ڈائل کیا وہ نمبر بھی کسی کے استعمال میں نہیں تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اب وہ کوئی تیسرا نمبر لئے ہوئے تھا اور وہ نمبر اس کے پاس نہیں تھا۔

اس نے بالآخر اس کے گھر کا نمبر ڈائل کیا کچھ دیر تک بیل ہوتی رہی، پھر فون اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو!" کسی عورت نے دوسری طرف سے کہا۔

"ہیلو میں سالار سکندر سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" امامہ نے کہا۔

"سالار صاحب سے آپ کون بول رہی ہیں۔"

امامہ کو اچانک محسوس ہوا جیسے اس عورت کے لہجے میں یک دم تجسس پیدا ہو گیا تھا۔

امامہ کو پتا نہیں کیوں اس کی آواز شناسا لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی اچانک اس عورت نے بڑی پر جوش آواز میں کہا۔ "امامہ بی بی! آپ امامہ بی بی ہیں؟"

ایک کرنٹ کھا کر امامہ نے بے اختیار کریڈل دبا دیا۔ وہ کون تھی جس نے اسے صرف آواز سے پہچان لیا تھا۔ اتنے سالوں بعد بھی۔ اور اتنی جلدی اور وہ بھی سالار سکندر کے گھر پر۔

کچھ دیر اس کے ہاتھ کانپتے رہے۔ وہ پی سی او کے اندر والے کیبن میں تھی اور کچھ دیر ریسیور اسی طرح ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی۔

"جو بھی ہو مجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اسلام آباد سے اتنی دور ہوں کہ یہاں مجھ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ مجھے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے سوچا اور پی سی او کے مالک کو ایک بار پھر کال ملانے کے لئے کہا۔

فون کی گھنٹی بجنے پر اس بار فون فوراً اٹھا لیا گیا تھا مگر اس بار بولنے والا کوئی مرد تھا اور وہ سالار نہیں تھا۔ یہ وہ آواز سنتے ہی جان گئی تھی۔

"میں سالار سکندر سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"آپ امامہ ہاشم ہیں؟"

مرد نے کھردری آواز میں کہا۔ اس بار امامہ کو کوئی شاک نہیں لگا۔

"جی" دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

"آپ ان سے میری بات کروا دیں۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" دوسری طرف سے اس مرد نے کہا۔

"کیوں؟"

"سالار زندہ نہیں ہے۔"

"کیا؟" بے اختیار امامہ کے حلق سے نکلا۔

"وہ مر گیا؟"

"ہاں......"

"کب؟"

اس بار مرد خاموش رہا۔

"آپ سے آخری بار ان کا رابطہ کب ہوا؟"

اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس آدمی نے کہا۔

"چند سال پہلے...... ڈھائی سال پہلے۔"

"ایک سال پہلے اس کی ڈیتھ ہوئی ہے۔ آپ"

امامہ نے کچھ بھی اور سننے سے پہلے فون بند کر دیا۔ کچھ کہنے اور سننے کی ضرورت نہیں تھی وہ آزاد ہو چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایک انسان کے طور پر اسے اس کی موت پر افسوس ہونا چاہئے تھا مگر اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ اگر اس نے اس طرح اسے طلاق دینے سے انکار نہ کیا ہوتا تو وہ یقیناً اس کے لئے دکھ محسوس کرتی مگر اس وقت ڈھائی سال کے بعد اسے بے اختیار سکون اور خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ تلوار جو اس کے سر لٹکی ہوئی تھی وہ غائب ہو چکی تھی۔

اسے اب ڈاکٹر سبط علی کو کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ صحیح معنوں میں آزاد ہو چکی تھی وہ اس کا وہیں ہاسٹل میں آخری دن تھا اور اس رات اس نے سالار سکندر کے لئے بخشش کے لئے دعا کی۔

وہ اس کی موت کے بعد اسے معاف کر چکی تھی اور وہ اس کی موت پر بے پناہ خوش تھی۔

☆ ☆ ☆

اس سے فون پر بات کرنے والی وہی ملازمہ تھی جو سالار کے ساتھ ساتھ اس کے گھر میں بھی کام کرتی رہی تھی اور اس نے امامہ کی آواز کو فوراً پہچان لیا تھا۔ امامہ کے فون بند کرتے ہی وہ کچھ اضطراب اور جوش و خروش کے عالم میں سکندر عثمان کے پاس پہنچ گئی۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اس دن طبیعت کی

خرابی کی وجہ سے وہ گھر پر تھے۔

"ابھی کچھ دیر پہلے ایک لڑکی کا فون آیا ہے وہ سالار صاحب سے بات کرنا چاہتی تھی۔"

"تو تم بات کروا دیتیں۔" سکندر عثمان نے قدرے لاپروائی سے کہا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ سالار بھی ان دنوں پاکستان آیا ہوا تھا اور گھر پر ہی موجود تھا۔ ملازمہ کچھ ہچکچائی۔

"صاحب جی! وہ امامہ بی بی تھیں۔"

سکندر عثمان کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھوٹتے چھوٹتے بچا، وہ یک دم حواس باختہ نظر آنے لگے۔

"امامہ ہاشم ہاشم مبین کی بیٹی؟" ملازمہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سکندر عثمان کا سر گھومنے لگا۔

"تو کیا سالار ہر ایک کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ وہ ابھی تک امامہ کے ساتھ رابطے میں ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ تو پھر یقیناً وہ اس سے ملتا بھی رہا ہوگا۔" انہوں نے بے اختیار سوچا۔

"اس نے تمہیں خود اپنا نام بتایا؟" انہوں نے چائے کا کپ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں نے ان کی آواز پہچان لی اور جب میں نے ان کا نام لیا تو انہوں نے فون بند کر دیا۔" ملازمہ نے سکندر عثمان کو بتایا "مگر مجھے یقین ہے وہ ان ہی کی آواز تھی۔ مجھے کم از کم اس بارے میں کوئی دھوکہ نہیں ہو سکتا۔" اس سے پہلے کہ سکندر عثمان کچھ کہتے انہوں نے فون کی گھنٹی سنی مگر اس بار وہ ڈائننگ روم میں موجود ایکسٹینشن کی طرف بڑھ گئے اور انہوں نے فون اٹھا لیا۔ دوسری طرف موجود لڑکی ایک بار پھر سالار سکندر کا پوچھ رہی تھی۔ ان کے استفسار پر اس نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ وہ امامہ ہاشم ہی تھی۔ وہ نہیں جانتے کیوں مگر بے اختیار ان کے دل میں آیا کہ وہ اسے سالار کے مرنے کی خبر دے دیں، تاکہ وہ دوبارہ کبھی ان کے گھر فون نہ کرے۔ انہیں اس سے بات کر کے یہ اندازہ تو ہو ہی چکا تھا کہ وہ بہت عرصے سے سالار کے ساتھ رابطہ نہیں کر سکی ہے اور اس کے پاس ان کے بیان کی صداقت کو پرکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ دوبارہ رابطہ نہ کرتی تو ان کی جان اس سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ سکتی تھی۔ وہ ابھی تک اس ایک سال کو اپنے ذہن سے نہیں نکال سکے تھے۔ جب امامہ کی گمشدگی کے فوراً بعد سالار پر شبہ ہونے کی وجہ سے ہاشم مبین احمد نے ان کے لئے ہر قسم کی پریشانی کھڑی کی تھی۔

بہت سے سرکاری دفاتر جہاں پہلے ان کی فرم کی فائلز بہت آسانی سے نکل آتی تھیں۔ مہینوں پھنسی رہیں۔ ان کے گھر دھمکی آمیز کالز اور خط آتے رہے۔ کئی لوگوں نے بالواسطہ طور پر ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ ہاشم مبین احمد کی بیٹی کی واپسی کے لئے ان کی مدد کریں۔ ایک لمبے عرصے تک سالار کی نگرانی کی گئی اور نگرانی کا یہ سلسلہ صرف پاکستان ہی نہیں باہر بھی جاری رہا، مگر جب کسی طرح بھی امامہ سے اس کے رابطے کا کوئی ثبوت یا سراغ نہیں ملا تو رفتہ رفتہ یہ تمام سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔

سکندر عثمان کی بے پناہ کوشش کے باوجود بھی ہاشم مبین کے ساتھ ان کے تعلقات بحال نہیں

ہونے کی طرف سے عدم تحفظ کا اندیشہ ختم ہو گیا تھا اور اب ڈھائی سال بعد وہ لڑکی ایک بار پھر سالار سے رابطہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ کسی صورت بھی دوبارہ ان حالات کا سامنا خود کرنا چاہتے تھے نہ ہی سالار کو کرنے دینا چاہتے تھے۔

اگر وہ خود ہاشم مبین احمد کی ٹکر کے آدمی نہ ہوتے تو اب تک وہ اس سے زیادہ نقصان اٹھا چکے ہوتے، جتنا نقصان انہوں نے اس ایک سال اور خاص طور پر شروع کے چند ماہ میں اٹھایا تھا۔ وہ امامہ کو اس طلاق نامے کی ایک کاپی بھجوانا چاہتے تھے، جو سالار کی طرف سے انہوں نے تیار کیا تھا اور انہیں اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ جائز تھا یا نہیں۔ وہ صرف امامہ کو یہ یقین دلا دینا چاہتے تھے کہ سالار یا اس کے خاندان کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہونا چاہئے نہ ہی ہوگا۔

اگر کچھ تھا بھی تو وہ سالار کی موت اور اس سے بھی پہلے کے تحریر شدہ اس طلاق نامے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا مگر یہ ایک اور اتفاق تھا کہ امامہ نے ان کی بات مکمل طور پر سنے بغیر فون بند کر دیا انہوں نے فون کو ٹریس آؤٹ کرنے کی کوشش کی، مگر وہ ملتان کے ایک پی سی او کا ثابت ہوا۔ سالار ایک ہفتہ کے بعد واپس امریکہ جانے والا تھا اور انہوں نے اس ایک ہفتہ اس کی مکمل طور پر نگرانی کروائی۔ وہ ملازموں کو ہدایات دے چکے تھے کہ کسی کا بھی فون آئے وہ کسی بھی صورت سالار سے بات نہ کروائیں، چاہے فون کسی مرد کا ہو یا عورت کا جب تک وہ خود یہ جان نہ لیتے کہ فون کرنے والا کون تھا۔ ملازمہ کو بھی وہ سختی کے ساتھ منع کر چکے تھے کہ وہ سالار کو امامہ کی اس کال کے بارے میں نہ بتائے۔ ایک ہفتے کے بعد جب سالار واپس امریکہ چلا گیا تو انہوں نے سکھ کا سانس لیا۔

سر پر آئی ہوئی آفت ایک بار پھر ٹل گئی تھی۔ سالار کی واپسی کے چند ہفتے کے بعد انہیں ایک لفافہ موصول ہوا تھا۔

امامہ نے لاہور واپس پہنچنے کے بعد وہ موبائل بیچ دیا تھا۔ وہ اسے واپس نہیں بھجوا سکتی تھی اور سالار کی وفات کے بعد اب یہ امکان نہیں تھا کہ کبھی اس کے ساتھ آمنا سامنا ہونے کی صورت میں وہ اسے وہ موبائل واپس دے سکے گی۔ اس نے موبائل بیچنے سے ملنے والی رقم کے ساتھ اپنے پاس موجود کچھ اور رقم شامل کی۔ وہ اندازاً ان کالز کے بل کی رقم تھی، جو ڈھائی تین سال پہلے سالار نے ادا کئے ہوں گے اور چند دوسرے اخراجات جو اپنے گھر قید کے دوران اور وہاں سے لاہور فرار کے دوران سالار نے اس پر کئے تھے۔ اس کے ساتھ سکندر عثمان کے نام ایک مختصر نوٹ بھجوایا تھا۔ ٹریولرز چیکس۔ اس کے سر پر موجود اس آدمی کا قرض بھی اتر گیا تھا۔

اس رقم اور اس کے ساتھ ملنے والے نوٹ سے سکندر عثمان کو تسلی ہو گئی تھی کہ وہ دوبارہ اس سے رابطہ نہیں کرے گی اور یہ بھی کہ اس نے واقعی ان کی بات پر یقین کر لیا تھا۔

باب ۱۰

ملتان سے بی ایس سی کرنے کے بعد وہ لاہور چلی آئی تھی۔ اسے گھر چھوڑے تین سال ہونے والے تھے اور اس کا خیال تھا کہ اب کم از کم اس طرح اسے تلاش نہیں کیا جائے گا، جس طرح پہلے کیا جاتا رہا تھا۔ اگر کیا بھی گیا تو صرف میڈیکل کالجز پر نظر رکھی جائے گی۔ اس کا یہ اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا۔

اس نے پنجاب یونیورسٹی میں کیمسٹری میں ایم ایس سی کے لئے ایڈمیشن لے لیا تھا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ بے حد محتاط تھی۔ یہ لاہور تھا یہاں کسی بھی وقت کوئی بھی اسے پہچان سکتا تھا۔ ملتان میں وہ صرف چادر اوڑھ کر کالج جاتی تھی۔ لاہور میں اس نے نقاب لگانا شروع کر دیا۔

لاہور میں دوبارہ واپسی کے بعد وہ ڈاکٹر سبط علی کے ساتھ نہیں رہی تھی، وہ سعیدہ اماں کے پاس رہنے لگی تھی۔

☆ ☆ ....☆

سعیدہ اماں سے اس کی پہلی ملاقات ڈاکٹر سبط علی نے ملتان جانے سے پہلے لاہور میں کروائی تھی۔ سعیدہ اماں کے بہت سے عزیز و اقارب ملتان میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر سبط علی امامہ کو ان سے آگاہ کرنا چاہتے تھے، تاکہ ملتان میں قیام کے دوران کسی بھی ضرورت یا ایمرجنسی میں وہ ان کی مدد لے سکے۔

سعیدہ اماں ایک پینسٹھ ستر سالہ بے حد باتونی اور ایکٹو عورت تھیں۔ وہ لاہور کے اندرون شہر میں ایک پرانی حویلی میں تنہا رہتی تھیں۔ ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا جبکہ دو بیٹے بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہیں مقیم تھے۔ وہ دونوں شادی شدہ تھے اور ان کے بے حد اصرار کے باوجود سعیدہ اماں باہر جانے پر تیار نہیں تھیں۔ ان کے دونوں بیٹے باری باری ہر سال پاکستان آیا کرتے اور کچھ عرصہ قیام کے بعد واپس چلے جاتے تھے۔ ڈاکٹر سبط علی سے ان کی قرابت داری تھی۔ وہ ان کے کزن ہوتے تھے۔

ڈاکٹر سبط علی نے امامہ کے بارے میں پہلے ہی سعیدہ اماں کو بتا دیا تھا۔ اسی لئے جب وہ ان کے ساتھ ان کے گھر پہنچی تو وہ بڑی گرم جوشی سے اس سے ملی تھیں۔ انہوں نے ملتان میں موجود تقریباً اپنے ہر رشتے دار کے بارے میں تفصیلات اس کے گوش گزار کر دی تھیں اور پھر شاید اس سب کو ناکافی جانتے ہوئے انہوں نے خود ساتھ چل کر اسے ہاسٹل چھوڑ آنے کی آفر کی جسے ڈاکٹر سبط علی نے نرمی سے رد کر دیا تھا۔

"نہیں آپا! آپ کو زحمت ہوگی۔" ان کے بے حد اصرار کے باوجود وہ نہیں مانے تھے۔

"بہتر تو یہ ہے بھائی صاحب کہ آپ اسے میرے بھائیوں میں سے کسی کے گھر ٹھہرا دیں۔ بچی کو گھر جیسا آرام اور ماحول ملے گا۔"

انہیں اچانک ہاسٹل پر اعتراض ہونے لگا اور پھر انہوں نے ہاسٹل کی زندگی کے کئی مسائل کے بارے میں روشنی ڈالی تھی مگر ڈاکٹر سبط علی اور خود وہ بھی کسی کے گھر میں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ ہاسٹل بہترین آپشن تھا۔

☆ ☆ ☆

سعیدہ اماں سے اس کی دوسری ملاقات ملتان جانے کے چند ماہ بعد اس وقت ہوئی تھی، جب ایک دن اچانک اسے کسی خاتون ملاقاتی کی اطلاع ہاسٹل میں دی گئی تھی۔ کچھ دیر کے لئے وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ وہاں اس طرح اچانک اس سے ملنے کون آ سکتا تھا اور وہ بھی ایک خاتون... مگر سعیدہ اماں کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ وہ اس سے اسی گرم جوشی سے ملی تھیں، جس طرح لاہور میں ملی تھیں۔ وہ تقریباً دو ہفتے ملتان میں رہی تھیں اور ان دو ہفتوں میں کئی بار اس سے ملنے آئیں۔ ایک بار وہ ان کے ساتھ ہاسٹل سے ان کے بھائی کے گھر بھی گئی۔

پھر یہ جیسے ایک معمول بن گیا تھا۔ وہ چند ماہ بعد ملتان آتیں اور اپنے قیام کے دوران باقاعدگی

سے اس کے پاس آتی رہتیں۔ وہ خود جب مہینے میں ایک بار لاہور آتی تو ان سے ملنے کے لئے بھی جاتی۔ کئی بار جب اس کی چھٹیاں زیادہ ہوتیں تو وہ اسے وہاں ٹھہرنے کے لئے اصرار کرتیں۔ وہ کئی بار وہاں رہی تھی۔ سرخ اینٹوں کا بنا ہوا وہ پرانا گھر اسے اچھا لگتا تھا یا پھر یہ تنہائی کا وہ احساس تھا، جو وہ ان کے ساتھ شیئر کر رہی تھی۔ اس کی طرح وہ بھی تنہا تھیں۔ اگرچہ ان کی یہ تنہائی ان کے ہمہ وقت میل جول کی وجہ سے کم ہو جاتی تھی مگر اس کے باوجود امامہ ان کے احساسات کو بنا کوشش کئے سمجھ سکتی تھی۔

لاہور واپس شفٹ ہونے سے بہت عرصہ پہلے ہی انہوں نے امامہ سے یہ جان لینے کے بعد کہ وہ ایم ایس سی لاہور سے کرنا چاہ رہی ہے، اسے ساتھ رکھنے کے لئے اصرار کرنا شروع کر دیا۔

اسی عرصے کے دوران ڈاکٹر سبط علی کی سب سے بڑی بیٹی ان کے پاس اپنے بچوں سمیت کچھ عرصہ کے لئے رہنے چلی آئیں۔ ان کے شوہر پی ایچ ڈی کے لئے بیرون ملک چلے گئے تھے۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کے بھتیجے تھے۔ جانے سے پہلے وہ اپنی فیملی کو ان کے پاس ٹھہرا گئے۔ ڈاکٹر سبط علی کے گھر میں جگہ کی کمی نہیں تھی مگر امامہ اب ان کے گھر میں رہنا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ جلد از جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر سبط علی کے احسانات کا بوجھ پہلے ہی اسے زیر بار کر رہا تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ ان کے پاس رہ کر تعلیم حاصل کرے اور اس کے بعد اس کے جاب کرنے پر بھی وہ اسے کہیں اور رہنے نہ دیتے لیکن اگر وہ پہلے ہی علیحدہ رہائش اختیار رکھتی تو اس کے لئے ان سے اپنی بات منوانا آسان ہوتا۔ سعیدہ اماں کا گھر اسے اپنی رہائش کے لئے بہت مناسب لگا تھا۔ وہ جاب شروع کرنے پر انہیں مجبور کر کے کرائے کی مد میں کچھ نہ کچھ لینے پر مجبور کر سکتی تھی مگر ڈاکٹر سبط علی شاید یہ سب کبھی گوارا نہ کرتے۔

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر سبط علی کے لئے اس کا فیصلہ ایک شاک کی طرح تھا۔

"کیوں آمنہ! میرے گھر پر کیوں نہیں رہ سکتیں آپ؟" انہوں نے بہت ناراضی سے اس سے کہا۔ "سعیدہ آپا کے ساتھ کیوں رہنا چاہتی ہیں؟"

"وہ بہت اصرار کر رہی ہیں۔"

"میں انہیں سمجھا دوں گا۔"

"نہیں، میں خود بھی ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ میں ان کے ساتھ رہوں گی تو ان کی تنہائی دور ہو جائے گی۔"

"یہ کوئی وجہ نہیں ہے۔ آپ ان کے پاس جب چاہیں جا سکتی ہیں، مگر ساتھ رہنے کے لئے نہیں۔"

"پلیز، آپ مجھے وہاں رہنے کی اجازت دے دیں، میں وہاں زیادہ خوش رہوں گی۔ میں اب آہستہ آہستہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتی ہوں۔"

ڈاکٹر سبط علی نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"پیروں پر کھڑے ہونے سے کیا مراد ہے آپ کی؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

"میں آپ پر بہت لمبے عرصے تک بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ پہلے ہی میں بہت سال سے آپ پر انحصار کر رہی ہوں، مگر ساری زندگی تو میں آپ پر بوجھ بن کر نہیں گزار سکتی۔"

وہ بات کرتے کرتے رک گئی۔ اسے لگا اس کے آخری جملے نے ڈاکٹر سبط علی کو تکلیف دی تھی۔ اسے پچھتاوا ہوا۔

"میں نے کبھی بھی آپ کو بوجھ نہیں سمجھا آمنہ! کبھی بھی نہیں۔ بیٹیاں بوجھ نہیں ہوتیں اور میرے لئے آپ ایک بیٹی کی طرح ہیں پھر یہ بات   مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔"

"میں جانتی ہوں ابو! مگر میں صرف اپنی فیلنگز کی بات کر رہی تھی۔ دوسرے پر ڈیپینڈنٹ ہونا بہت تکلیف دہ بات ہے۔ میں سعیدہ اماں کے ساتھ رہ کر زیادہ پرسکون رہوں گی۔ میں انہیں پے (pay) کروں گی۔ آپ کو میں کبھی پے (pay) کرنا چاہوں بھی تو نہ کر سکوں گی۔ شاید مجھے دس زندگیاں بھی ملیں تو میں آپ کے احسانات کا بدلہ نہیں اتار سکتی مگر اب بس   اب اور نہیں   میں نے زندگی کو گزارنے کے سارے طریقے ابھی سیکھنے ہیں۔ مجھے سیکھنے دیں۔"

ڈاکٹر سبط علی نے اس کے بعد اسے دوبارہ اپنے گھر میں رہنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے لئے بھی ان کی احسان مند تھی۔

سعیدہ اماں کے ساتھ رہنے کا تجربہ اس کے لئے ہاسٹل میں یا ڈاکٹر سبط علی کے ہاں رہنے سے بالکل مختلف تھا۔ اسے ان کے پاس ایک عجیب سی آزادی اور خوشی کا احساس ہوا تھا۔ وہ بالکل اکیلی رہتی تھیں۔ صرف ایک ملازمہ تھی جو دن کے وقت آکر گھر کے کام کر دیا کرتی تھی اور شام کو واپس چلی جایا کرتی تھی۔ وہ بے حد سوشل لائف گزارتی تھیں۔ محلے میں ان کا بہت آنا جانا تھا اور نہ صرف محلے میں بلکہ اپنے رشتے داروں کے ہاں بھی اور ان کے گھر بھی اکثر کوئی نہ کوئی آتا رہتا تھا۔

انہوں نے محلے میں ہر ایک سے امامہ کا تعارف اپنی بھانجی کہہ کر کروایا تھا اور چند سالوں کے بعد یہ تعارف بھانجی سے بیٹی میں تبدیل ہو گیا تھا، اگرچہ محلے والے پچھلے تعارف سے واقف تھے، مگر اب کسی نئے ملنے والے سے جب وہ امامہ کو بیٹی کی حیثیت سے متعارف کرواتیں تو کسی کو کوئی تجسس نہیں ہوتا تھا۔ لوگ سعیدہ اماں کی عادت سے واقف تھے کہ وہ کتنا محبت بھرا دل رکھتی تھیں۔ ان کے بیٹے بھی امامہ سے واقف تھے، بلکہ وہ باقاعدگی سے فون پر سعیدہ اماں سے بات کرتے ہوئے اس کا حال احوال بھی دریافت کرتے رہتے تھے۔ ان کی بیوی اور بچے بھی اس سے بات چیت کرتے رہتے تھے۔

ان کے بیٹے ہر سال پاکستان آیا کرتے تھے اور ان کے قیام کے دوران بھی امامہ کو کبھی ایسا محسوس نہیں ہوتا تھا، جیسے وہ ان کی فیملی کا حصہ نہیں تھی، بعض دفعہ اسے یوں ہی لگتا جیسے وہ واقعی سعیدہ اماں کی بیٹی اور ان کے بیٹوں کی بہن تھی۔ ان دونوں کے بچے اسے پھوپھو کہا کرتے تھے۔

پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی کرنے کے بعد اس نے ڈاکٹر سبط علی کے توسط سے ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں جاب شروع کر دی تھی۔ اس کی جاب بہت اچھی تھی اور پہلی بار اس نے مالی طور پر بھی خود مختاری حاصل کر لی تھی۔ یہ ویسی زندگی نہیں تھی جو وہ اپنے والدین کے گھر گزارتی تھی نہ ہی ویسی تھی جیسی زندگی کے وہ خواب دیکھا کرتی تھی مگر یہ ویسی بھی نہیں تھی جن خدشات کے وہ گھر سے نکلتے ہوئے شکار تھی۔ وہ ہر ایک کے بارے میں نہیں کہہ سکتی مگر اس کے لئے زندگی معجزات کا دوسرا نام تھی۔ سالار سکندر جیسے لڑکے سے اس طرح کی مدد ... ڈاکٹر سبط علی تک رسائی... سعیدہ اماں جیسے خاندان کا ملنا   تعلیم کو مکمل کرنا اور پھر وہ جاب...   صرف جلال انصر تھا جس کا خیال ہمیشہ اسے تکلیف میں مبتلا کر دیتا تھا اور شاید وہ اسے مل جاتا تو وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی۔

آٹھ سالوں نے اس میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ گھر سے نکلتے وقت وہ جانتی تھی کہ اب دنیا میں اس کے نخرے اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے کسی سے کوئی توقعات وابستہ کرنی تھیں نہ ہی ان کے پورا نہ ہونے پر تکلیف محسوس کرنی تھی۔ اس کا رونا دھونا بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتا گیا تھا۔ بیس سال کی عمر میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوف زدہ اور پریشان ہونے والی امامہ ہاشم آہستہ آہستہ اپنا وجود کھوتی گئی تھی۔ نئی نمودار ہونے والی امامہ زیادہ پر اعتماد اور مضبوط اعصاب رکھتی تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ بہت زیادہ محتاط بھی ہو گئی تھی۔ ہر چیز کے بارے میں، اپنی گفتگو کے بارے میں، اپنے طور اطوار کے بارے میں۔

ڈاکٹر سبط علی اور سعیدہ اماں دونوں کے خاندانوں نے اسے بہت محبت اور اپنائیت دی تھی لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ کوشش کرتی تھی کہ وہ کوئی ایسی بات یا حرکت نہ کرے، جو انہیں قابل اعتراض یا ناگوار لگے۔ ہاشم مبین کے گھر میں اسے یہ ساری احتیاطیں نہیں کرنی پڑتی تھیں مگر وہاں سے نکل کر اسے یہ سب کچھ سیکھنا پڑا تھا۔

سعیدہ اماں کی گمشدگی کے دوران وہ آفس میں تھی۔ چار بجے کے قریب جب وہ گھر آئی تو گھر پر تالا لگا ہوا تھا۔ اس کے پاس اس تالے کی دوسری چابی تھی، کیونکہ اس سے پہلے بھی سعیدہ اماں کئی بار ادھر ادھر چلی جایا کرتی تھیں۔ اسے تشویش نہیں ہوئی۔

لیکن جب مغرب کی اذان ہونے لگی تو وہ پہلی بار فکر مند ہوئی کیونکہ وہ شام کو بتائے بغیر کبھی یوں غائب نہیں ہوئی تھیں۔ ساتھ والوں کے ہاں پتا کرنے پر اسے پتا چلا کہ ان کا بیٹا انہیں بلال کے گھر سے

چھوڑ کر آیا تھا۔ سعیدہ اماں پہلے بھی اکثر وہاں آتی جاتی رہتی تھیں، اس لئے امامہ ان لوگوں کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اس نے وہاں فون کیا تو اسے پتا چلا کہ وہ دوپہر کو وہاں سے جا چکی تھیں اور تب پہلی بار اسے صحیح معنوں میں تشویش ہونے لگی۔

اس نے باری باری ہر اس جگہ پتا کیا جہاں وہ جا سکتی تھیں مگر وہ کہیں بھی نہیں ملیں اور تب اس نے ڈاکٹر سبط علی کو اطلاع دی۔ اس کی حالت تب تک بے حد خراب ہو چکی تھی۔ سعیدہ اماں کا میل جول اپنے محلے تک ہی تھا۔ وہ اندرون شہر کے علاوہ کسی جگہ کو اچھی طرح نہیں جانتی تھیں۔ انہیں کسی دوسری جگہ جانا ہوتا تو وہ ہمسایوں کے کسی لڑکے کے ساتھ جاتیں یا پھر امامہ کے ساتھ اور یہی بات امامہ کو تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔

دوسری طرف سالار اندرون شہر کے سوا شہر کے تمام پوش علاقوں سے واقف تھا۔ اگر اسے اندرون شہر کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات بھی ہوتیں تب بھی وہ سعیدہ اماں کے ادھورے پتے کے باوجود کسی نہ کسی طرح ان کے گھر تک پہنچ جاتا۔

ڈاکٹر سبط علی نے رات گئے اسے سعیدہ اماں کی خیریت سے اپنے کسی جاننے والے کے پاس ہونے کی اطلاع دی اور امامہ کی جیسے جان میں جان آئی۔

مزید ایک گھنٹے کے بعد دروازے کی بیل بجی تھی اور اس نے تقریباً بھاگتے ہوئے جا کر دروازہ کھولا۔ دروازے کی اوٹ سے اس نے سعیدہ اماں کے پیچھے کھڑے ایک خوش شکل آدمی کو دیکھا، جس نے دروازہ کھلنے پر اسے سلام کیا اور پھر سعیدہ اماں کو خدا حافظ کہتے ہوئے مڑ گیا اور اس دوسرے دراز قامت شخص کے پیچھے چلنے لگا جس کی امامہ کی طرف پشت تھی۔ امامہ نے اس پر غور نہیں کیا وہ تو بے اختیار سعیدہ اماں سے لپٹ گئی تھی۔

سعیدہ اماں اگلے کئی دن اس کے سامنے ان دونوں کا نام لیتی رہیں، سالار اور فرقان۔ امامہ کو پھر بھی شبہ نہیں ہوا کہ وہ سالار سالار سکندر بھی ہو سکتا تھا مردہ لوگ زندہ نہیں ہو سکتے تھے اور اسے اگر اس کی موت کا یقین نہ بھی ہوتا تب بھی سالار سکندر جیسا شخص نہ تو ڈاکٹر سبط علی کا شناسا ہو سکتا تھا نہ ہی اس میں اس طرح کی اچھائیاں ہو سکتی تھیں جن اچھائیوں کا ذکر سعیدہ اماں وقتاً فوقتاً کرتی رہتی تھیں۔

اس کے کچھ عرصے بعد اس نے جس شخص کو اس رات سعیدہ اماں کے ساتھ سیڑھیوں پہ کھڑے دیکھا تھا اس شخص سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی۔ فرقان اپنی بیوی کے ساتھ ان کے ہاں آیا تھا۔ اسے وہ اور اس کی بیوی دونوں اچھے لگے تھے پھر وہ چند ایک بار اور ان کے گھر آئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی شناسائی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

اسے جاب کرتے تب دو سال ہو چکے تھے۔ کچھ وقت شاید اور اسی طرح گزر جاتا۔ اگر وہ اتفاقاً

ایک روز اس سڑک سے نہ گزرتی جہاں جلال کے بنائے ہوئے ہاسپٹل کے باہر اس کا نام آویزاں تھا۔ جلال انصر کا نام اس کے قدم روک دینے کے لئے کافی تھا مگر کچھ دیر تک ہاسپٹل کے باہر اس کا نام دیکھتے رہنے کے بعد اس نے طے کیا تھا کہ وہ دوبارہ اس سڑک پر کبھی نہیں آئے گی۔

جلال شادی کر چکا تھا۔ یہ وہ گھر چھوڑتے وقت ہی سالار سے جان چکی تھی اور وہ دوبارہ اس کی زندگی میں نہیں آنا چاہتی تھی مگر اس کا یہ فیصلہ دیرپا ثابت نہیں ہوا۔

دو ہفتے کے بعد فارماسیوٹیکل کمپنی کے آفس میں ہی اس کی ملاقات رابعہ سے ہوئی۔ رابعہ وہاں کسی کام کے لئے آئی تھی۔ چند لمحوں کے لئے تو اسے اپنے سامنے دیکھ کر اس کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح کا ردعمل ظاہر کرے۔ یہ مشکل رابعہ نے آسان کر دی۔ وہ اس سے بڑی گرمجوشی کے ساتھ ملی تھی۔

"تم یک دم کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ کالج اور ہاسٹل میں تو ایک لمبا عرصہ طوفان مچا رہا۔"

رابعہ نے چھوٹتے ہی اس سے پوچھا۔ امامہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"بس میں گھر سے چلی گئی تھی۔ کیوں گئی تھی تم تو جانتی ہی ہو گی۔" امامہ نے مختصراً کہا۔

"ہاں، مجھے کچھ اندازہ تو تھا ہی مگر میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ ویسے ہم لوگوں کی بڑی کم بختی آئی۔ مریم، جویریہ، زینب، سب کی پولیس تک نے پوچھ گچھ کی ہم سے۔ ہمیں تو کچھ پتا ہی نہیں تھا تمہارے بارے میں، مگر ہاسٹل اور کالج میں بہت ساری باتیں پھیل گئی تھیں تمہارے بارے میں۔"

رابعہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھی مسلسل بولے جا رہی تھی۔

"تم اکیلی ہی گئی تھیں؟" اس نے بات کرتے کرتے اچانک پوچھا۔

"ہاں۔" امامہ انٹرکام پر چائے کا کہتے ہوئے بولی۔

"گھر گئی کہاں تھیں؟"

"کہیں نہیں، یہیں لاہور میں تھی۔ تم بتاؤ، تم کیا کر رہی ہو آج کل اور جویریہ باقی سب۔" امامہ نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"میں پریکٹس کر رہی ہوں لاہور میں۔ جویریہ اسلام آباد میں ہوتی ہے۔ شادی ہو گئی ہے اس کی ایک ڈاکٹر سے۔ میری بھی فاروق سے ہوئی ہے۔ تمہیں تو یاد ہو گا کلاس فیلو تھا میرا۔"

امامہ مسکرائی۔ "اور زینب؟" اس کا دل بے اختیار دھڑکا تھا۔

"ہاں، زینب آج کل انگلینڈ میں ہوتی ہے۔ ریزیڈنسی کر رہی ہے وہاں اپنے شوہر کے ساتھ۔ اس کے بھائی کے ہاسپٹل میں ہی فاروق پریکٹس کرتے ہیں۔"

امامہ نے بے اختیار اسے دیکھا۔ "جلال انصر کے ہاسپٹل میں؟"

"ہاں، اسی کے ہاسپٹل میں۔ وہ اسپیشلائزیشن کر کے آیا ہے کچھ عرصے پہلے لیکن بے چارے کے

ساتھ بڑی ٹریجڈی ہوئی ہے۔ چند ماہ پہلے طلاق ہو گئی ہے۔ حالانکہ اتنا اچھا بندہ ہے مگر۔"

امامہ اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکی۔

"طلاق..... !کیوں؟"

"پتا نہیں، فاروق نے پوچھا تھا اس سے۔ کہہ رہا تھا انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہوئی۔ بیوی بھی بڑی اچھی تھی اس کی۔ ڈاکٹر ہے وہ بھی لیکن پتا نہیں کیوں طلاق ہو گئی۔ ہم لوگوں کا تو خاصا آنا جانا تھا ان کے گھر میں۔ ہمیں کبھی بھی اندازہ نہیں ہوا کہ ایسا کوئی مسئلہ ہے دونوں کے درمیان۔ ایک بیٹا ہے تین سال کا۔ وہ جلال کے پاس ہی ہے۔ اس کی بیوی واپس امریکہ چلی گئی ہے۔"

رابعہ لاپروائی سے تمام تفصیلات بتا رہی تھی۔

"تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ یہ تو میں جان گئی ہوں کہ یہاں جاب کر رہی ہو، مگر اسٹڈیز تو تم نے مکمل نہیں کی۔"

"ایم ایس سی کیا ہے کیمسٹری میں۔"

"اور شادی وغیرہ؟"

"وہ ابھی نہیں۔"

"پیرنٹس کے ساتھ تمہارا جھگڑا ختم ہوا یا نہیں؟"

امامہ نے حیرت سے اس کو دیکھا۔

"نہیں۔" پھر اس نے مدھم آواز میں کہا۔

وہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی رہی پھر چلی گئی۔ امامہ باقی کا سارا وقت آفس میں ڈسٹرب رہی۔ اس نے جلال انصر کو کبھی بھلایا نہیں تھا۔ وہ اسے بھلا نہیں سکتی تھی۔ اس نے صرف اپنی زندگی سے اس کو الگ کر دیا تھا مگر وہاں بیٹھے ہوئے اس دن اسے احساس ہوا کہ یہ بھی ایک خوش گمانی یا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ جلال انصر کو اپنی زندگی سے الگ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ صرف اس کی زندگی میں داخل ہو کر اسے کسی پریشانی سے دوچار کرنا چاہتی تھی نہ ہی اس کی ازدواجی زندگی کو خراب کرنا چاہتی تھی لیکن یہ جاننے کے بعد کہ اس کی ازدواجی زندگی پہلے ہی ناکام ہو چکی ہے اور وہ ایک بار پھر اکیلا تھا۔ اسے یاد آیا آٹھ سال پہلے وہ کس طرح اس شخص کے حصول کے لئے بچوں کی طرح مچلتی رہی تھی۔ وہ اسے حاصل نہیں کر سکی تھی۔ تب بہت سی دیواریں، بہت سی رکاوٹیں تھیں جنہیں وہ پار کر سکتی تھی نہ جلال انصر پار کر سکتا تھا۔

مگر اب بہت وقت گزر چکا تھا۔ ان رکاوٹوں میں سے اب کچھ بھی ان دونوں کے درمیان نہیں تھا۔ اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ ایک شادی کر چکا تھا یا اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔

"مجھے اس کے پاس ایک بار پھر جانا چاہئے، شاید وہ اب بھی میرے بارے میں سوچتا ہو شاید اسے اب اپنی غلطی کا احساس ہو۔" امامہ نے سوچا تھا۔

اس نے آخری بار فون پر بات کرتے ہوئے اس سے جو کچھ کہا تھا، امامہ اس کے لئے اس کو معاف کر چکی تھی۔ جلال کی جگہ جو بھی ہوتا وہ یہی کہتا۔ صرف ایک لڑکی کے لئے تو کوئی بھی اتنے رسک نہیں لیتا اور پھر اس کا کیریئر تھا جسے وہ بنانا چاہتا تھا۔ اس کے پیرنٹس کی اس سے کچھ امیدیں تھیں جنہیں وہ ختم نہیں کر سکتا تھا۔ میری طرح وہ بھی مجبور تھا۔ بہت سال پہلے کہے گئے اس کے جملوں کی بازگشت نے بھی اسے دلبرداشتہ یا اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کرنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔

"مجھے اس کے پاس جانا چاہئے۔ ہو سکتا ہے یہ موقع مجھے اللہ نے ہی دیا ہو۔ ہو سکتا ہے اللہ نے میری دعاؤں کو اب قبول کر لیا ہو۔ ہو سکتا ہے اللہ کو مجھ پر اب رحم آ گیا ہو۔"

وہ بار بار سوچ رہی تھی۔

"ورنہ اس طرح اچانک رابعہ میرے سامنے کیوں آ جاتی۔ مجھے کیوں یہ پتا چلتا کہ اس کی بیوی سے علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہو سکتا ہے اب میں اس کے سامنے جاؤں تو" وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ جلال انصر کے پاس دوبارہ جانا چاہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میں ڈاکٹر جلال انصر سے ملنا چاہتی ہوں۔" امامہ نے ریسپشنسٹ سے کہا۔

"اپائنٹ منٹ ہے آپ کی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، اپائنٹ منٹ نہیں ہے۔"

"پھر تو وہ آپ سے نہیں مل سکیں گے۔ اپائنٹ منٹ کے بغیر وہ کسی پیشنٹ کو نہیں دیکھتے۔" اس نے بڑے پروفیشنل انداز میں کہا۔

"میں پیشنٹ نہیں ہوں، ان کی دوست ہوں۔" امامہ نے کاؤنٹر پر ہاتھ رکھتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔

"ڈاکٹر صاحب جانتے ہیں کہ آپ اس وقت ان سے ملنے آئیں گی؟" ریسپشنسٹ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔

"ایک منٹ، میں ان سے پوچھتی ہوں۔" اس نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" وہ ریسپشنسٹ کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" اس نے اپنا سوال دہرایا۔

"امامہ ہاشم۔" اسے یاد نہیں اس نے کتنے سالوں بعد اپنا نام لیا تھا۔

"سر! کوئی خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ آپ کی دوست ہیں۔ امامہ ہاشم نام ہے ان کا۔"

وہ دوسری طرف سے جلال کی گفتگو سنتی رہی۔

"او کے سر۔" پھر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"آپ اندر چلی جائیں۔" ریسیپشنسٹ نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

وہ سر ہلاتے ہوئے دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ جلال انصر کا ایک مریض باہر نکل رہا تھا اور وہ خود اپنی میز کے پیچھے کھڑا تھا۔ امامہ نے اس کے چہرے پر حیرت دیکھی تھی۔ وہ اپنے دھڑکتے دل کی آواز باہر تک سن سکتی تھی۔ اس نے جلال انصر کو آٹھ سال اور کتنے ماہ کے بعد دیکھا تھا۔ امامہ نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اسے یاد نہیں آیا۔

"What a pleasent surprise Imama." (کیسا خوشگوار سرپرائز ہے امامہ!)۔

جلال نے آگے بڑھ کر اس کی طرف آتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تم کیسی ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟"

وہ اس کے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر بولی۔ پچھلے آٹھ سال سے یہ چہرہ ہر وقت اس کے ساتھ رہا تھا اور یہ آواز بھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں، آؤ بیٹھو۔"

اس نے اپنی ٹیبل کے سامنے پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ خود ٹیبل کے دوسری جانب اپنی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔

وہ ہمیشہ سے جانتی تھی۔ وہ جلال انصر کو جب بھی دیکھے گی اس کا دل اسی طرح بے قابو ہو گا مگر اتنی خوشی، ایسی سرشاری تھی جو وہ اپنے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑتی محسوس کر رہی تھی۔

"کیا پیو گی؟ چائے، کافی، سوفٹ ڈرنک؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

"جو آپ چاہیں۔"

"او کے، کافی منگوا لیتے ہیں۔ تمہیں پسند تھی۔"

وہ انٹرکام اٹھا کر کسی کو کافی بھجوانے کی ہدایات دے رہا تھا اور وہ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر داڑھی اب نہیں تھی۔ اس کا ہیر اسٹائل مکمل طور پر تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کا وزن پہلے کی نسبت کچھ بڑھ گیا تھا۔ وہ پہلے کی نسبت بہت پُراعتماد اور بے تکلف نظر آ رہا تھا۔

"تم آج کل کیا کر رہی ہو؟" ریسیور رکھتے ہی اس نے امامہ سے پوچھا۔

"ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں کام کر رہی ہوں۔"

"ایم بی بی ایس تو چھوڑ دیا تھا تم نے۔"

"ہاں، ایم ایس سی کیا ہے کیمسٹری میں۔"

"کون سی کمپنی ہے؟" امامہ نے نام بتایا۔

"وہ تو بہت اچھی کمپنی ہے۔"

وہ کچھ دیر اس کمپنی کے بارے میں تعریفی تبصرہ کرتا رہا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

"میں اسپیشلائزیشن کر کے آیا ہوں۔"

وہ اپنے بارے میں بتانے لگا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر کسی معمول کی طرح اسے دیکھتی رہی۔ بعض لوگوں کو صرف دیکھنا ہی کتنا "کافی" ہوتا ہے۔ اس نے اسے بات کرتے دیکھ کر سوچا تھا۔

"ایک سال ہوا ہے اس ہاسپٹل کو شروع کئے اور بہت اچھی پریکٹس چل رہی ہے میری۔"

وہ بولتا رہا۔ کافی آ چکی تھی۔

"تمہیں میرا پتا کیسے چلا؟" وہ کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"میں نے آپ کے ہاسپٹل کے بورڈ پر آپ کا نام پڑھا تھا پھر رابعہ سے ملاقات ہوئی۔ آپ جانتے ہوں گے۔ زینب بھی واقف تھی اس سے۔"

"رابعہ فاروق کی بات کر رہی ہو۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کا شوہر ڈاکٹر فاروق میرے ساتھ کام کرتا ہے۔" اس نے کافی پیتے ہوئے کہا۔

"ہاں، وہی پھر میں یہاں آ گئی۔"

امامہ نے ابھی کافی نہیں پی تھی۔ کافی بہت گرم تھی اور بہت گرم چیزیں نہیں پیتی تھی۔ اس نے کسی زمانے میں میز کے دوسری جانب بیٹھے ہوئے شخص کو آئیڈیلائز کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس میں ہر خوبی تھی، ہر وہ خوبی جو ایک مکمل مرد میں ہونی چاہئے۔ ہر وہ خوبی جو وہ اپنے شوہر میں دیکھنا چاہتی تھی۔ ساڑھے آٹھ سال گزر گئے تھے اور امامہ کو یقین تھا کہ وہ اب بھی ویسا ہی ہے۔ چہرے سے داڑھی کے ہٹ جانے کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کو اب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت نہ رہی ہو۔ اپنے ہاسپٹل کی کامیابی کے قصیدے اس کے سامنے پڑھتے ہوئے بھی امامہ اس کی اسی آواز کو اپنے کانوں میں گونجتا محسوس کر رہی تھی، جس آواز نے ایک بار اس کی زندگی کا سب سے مشکل فیصلہ آسان کر دیا تھا۔

وہ اس کے منہ سے کامیاب پریکٹس اور شہرت کا سن کر مسرور تھی۔ جلال نے زندگی میں ان ہی کامیابیوں کو سمیٹنے کے لئے ساڑھے آٹھ سال پہلے اسے چھوڑ دیا تھا مگر وہ خوش تھی۔ آج سب کچھ جلال

والسر کی مٹھی میں تھا۔ کم از کم آج فیصلہ کرنے میں اسے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

"تم نے شادی کر لی؟" بات کرتے کرتے اس نے اچانک پوچھا۔

"نہیں۔" امامہ نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

"تو پھر تم کہاں رہتی ہو، کیا اپنے پیرنٹس کے پاس ہو؟" جلال اس بار کچھ سنجیدہ تھا۔

"نہیں۔"

"پھر؟"

"اکیلی رہتی ہوں، پیرنٹس کے پاس کیسے جا سکتی تھی۔" اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"آپ نے شادی کر لی؟" جلال نے کافی کا ایک گھونٹ لیا۔

"ہاں، شادی کر لی اور علیحدگی بھی ہو گئی۔ تین سال کا ایک بیٹا ہے میرا۔ میرے پاس ہی ہوتا ہے۔" جلال نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

"آئی ایم سوری۔" امامہ نے اظہار افسوس کیا۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ اچھا ہوا یہ شادی ختم ہو گئی۔"

"It was not a marriage, it was a mess." (یہ شادی نہیں تھی ایک بکھیڑا تھا)۔

جلال نے کافی کا کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی پھر اس خاموشی کو امامہ نے توڑا۔

"بہت سال پہلے ایک بار میں نے آپ کو پرپوز کیا تھا جلال؟"

جلال اسے دیکھنے لگا۔

"پھر میں نے آپ سے شادی کے لئے ریکویسٹ کی تھی۔ آپ اس وقت مجھ سے شادی نہیں کر سکے۔"

"کیا میں یہ ریکویسٹ آپ سے دوبارہ کر سکتی ہوں؟"

اس نے جلال انصر کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا۔

"اب تو حالات بدل چکے ہیں۔ آپ کسی پر ڈیپنڈنٹ نہیں ہیں۔ نہ ہی میرے پیرنٹس کے کسی ردعمل کا آپ کو اندیشہ ہو گا نہ ہی آپ کے پیرنٹس اعتراض کریں گے۔ اب تو آپ مجھ سے شادی کر سکتے ہیں۔"

وہ جلال کا جواب سننے کے لئے رکی۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کی خاموشی نے امامہ کے اعصاب کو مضمحل کیا۔ شاید یہ اس لئے خاموش ہے کیونکہ اسے اپنی پہلی شادی یا بیٹے کا خیال ہو گا۔ امامہ نے سوچا۔ مجھے اسے بتانا چاہئے کہ مجھے اس کی پہلی شادی کی کوئی پروا نہیں ہے، نہ ہی اس بات پر اعتراض کہ اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔

"جلال! مجھے آپ کی پہلی شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

جلال نے اس کی بات کاٹ دی۔

"امامہ! یہ ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں ممکن نہیں ہے۔ کیا آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے؟"

"محبت کی بات نہیں ہے امامہ! اب بہت وقت گزر چکا ہے۔ ویسے بھی ایک شادی ناکام ہونے کے بعد میں فوری طور پر دوسری شادی نہیں کرنا چاہتا۔ میں اپنے کیریئر پر دھیان دینا چاہتا ہوں۔"

"جلال! آپ کو مجھ سے تو کوئی اندیشہ نہیں ہونا چاہئے۔ میرے ساتھ تو آپ کی شادی ناکام نہیں ہو سکتی۔"

"پھر بھی میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔" جلال نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں انتظار کر سکتی ہوں۔"

جلال نے ایک گہرا سانس لیا۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں امامہ! میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ تم سے شادی کر سکوں۔"

وہ دم سادھے اسے دیکھتی رہی۔

"یہ شادی میں نے اپنی مرضی سے کی تھی۔ دوبارہ میں اپنی مرضی نہیں کرنا چاہتا۔ دوسری شادی میں اپنے پیرنٹس کی مرضی سے کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ اپنے پیرنٹس کو میرے بارے میں بتا دیں۔ شاید وہ آپ کو اجازت دے دیں۔" اس نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

"نہیں بتا سکتا۔ دیکھو امامہ! کچھ حقائق ہیں جن کا سامنا مجھے اور تمہیں بہت حقیقت پسندی سے کرنا چاہئے۔ میں اپنے لئے تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی زمانے میں، میں بھی تمہارے ساتھ انوالو تھا یا یہ کہہ لو کہ محبت کرتا تھا۔ میں آج بھی تمہارے لئے دل میں بہت خاص جذبات رکھتا ہوں اور ہمیشہ رکھوں گا مگر زندگی جذبات کے سہارے نہیں گزاری جا سکتی۔"

وہ رکا۔ امامہ کافی کے کپ سے اٹھتے دھوئیں کے پار اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"تم جب سات آٹھ سال پہلے اپنا گھر چھوڑ رہی تھیں تو میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ اس طرح نہ کرو لیکن تم نے اس معاملے کو اپنی مرضی کے مطابق ہینڈل کیا۔ اپنے پیرنٹس کو مجھ سے شادی کے لئے کنوینس کرنے کے بجائے تم مجھے مجبور کرتی رہیں کہ میں تم سے چھپ کر شادی کر لوں۔ میں ایسا نہیں کر سکا اور نہ ہی یہ مناسب تھا۔ مذہب کی بات اپنی جگہ، مگر مذہب کے ساتھ معاشرہ بھی تو کوئی چیز ہوتا ہے جس میں ہم رہتے ہیں اور جس کی ہمیں پروا کرنی چاہئے۔"

امامہ کو یقین نہیں آیا۔ وہ یہ سب اس شخص کے منہ سے سن رہی تھی جو

"تم تو چلی گئیں مگر تمہارے جانے کے بعد تمہارا اس طرح غائب ہو جانا کتنا بڑا اسکینڈل ثابت ہوا اس کا تمہیں اندازہ نہیں۔ تمہارے پیرنٹس نے پریس میں یہ خبر آنے نہیں دی مگر پورے میڈیکل کالج کو تمہارے اس طرح چلے جانے کا پتا تھا۔ پولیس نے تمہاری بہت ساری فرینڈز اور کلاس فیلوز سے تمہارے بارے میں انویسٹی گیشن کی۔ زینب بھی اس میں شامل تھی۔ خوش قسمتی سے ہم بچ گئے۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں نے اتنے سال محنت کر کے اپنا ایک مقام بنایا ہے۔ میں اتنا بہادر نہیں ہوں کہ میں تم سے شادی کر کے لوگوں کی چہ میگوئیوں کا نشانہ بنوں۔ میرا اٹھنا بیٹھنا ڈاکٹرز کی کمیونٹی میں ہے اور امامہ ہاشم کی میری بیوی کے طور پر واپسی مجھے اسکینڈلائز کر دے گی۔ تم سے شادی کر کے میں لوگوں سے نظریں نہیں چرانا چاہتا۔ تم اتنے سال کہاں رہی ہو، کیسے رہی ہو، یہ بہت اہم سوالات ہیں۔ میرے پیرنٹس کو تمہاری کسی بات پر یقین نہیں آئے گا اور مجھے لوگوں کی نظروں میں اپنا یہ مقام برقرار رکھنا ہے۔ تم بہت اچھی ہو مگر لوگ سمجھتے ہیں کہ تم اچھی لڑکی نہیں ہو اور میں کسی اسکینڈلائزڈ لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی یہ کہے کہ میری بیوی کا کردار اچھا نہیں ہے۔ آئی ہوپ، تم میری پوزیشن کو سمجھ سکتی ہو۔"

کافی کے کپ سے اٹھتا دھواں ختم ہو چکا تھا مگر جلال انصر کا چہرہ ابھی کسی دھوئیں کے پیچھے چھپا نظر آ رہا تھا یا پھر یہ اس کی آنکھوں میں اترنے والی دھند تھی جس نے جلال انصر کو غائب کر دیا تھا۔

کرسی کے دونوں ہتھوں کا سہارا لیتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"ہاں، میں سمجھ سکتی ہوں۔" اس نے اپنے آپ کو کہتے سنا۔ "خدا حافظ۔"

"آئی ایم سوری امامہ!" جلال معذرت کر رہا تھا۔ امامہ نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ جیسے نیند کی حالت میں چلتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئی۔

شام کے سات بج چکے تھے، اندھیرا چھا چکا تھا۔ سڑکوں پر اسٹریٹ لائٹس اور نیون سائن بورڈز روشن تھے۔ سڑک پر بہت زیادہ ٹریفک تھی۔ اس پورے روڈ پر دونوں طرف ڈاکٹرز کے کلینک تھے۔ اسے یاد تھا کسی زمانے میں اس کی بھی خواہش تھی کہ اس کا بھی ایسا ہی کلینک ہوتا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ وہ بھی اپنے نام کے آگے اسی طرح کوالیفیکیشنز کی ایک لمبی لسٹ دیکھنا چاہتی تھی بالکل ویسے ہی جس طرح جلال انصر کے نام کے ساتھ تھیں۔ بالکل ویسے ہی جس طرح اس روڈ پر لگے ہوئے بہت سے ڈاکٹرز کے ناموں کے ساتھ تھی۔ یہ سب ہو سکتا تھا، یہ سب ممکن تھا، اس کے ہاتھ کی مٹھی میں تھا اگر وہ... وہ بہت سال پہلے اپنے گھر سے نہ نکلی ہوتی۔

وہ بہت دیر تک جلال کے ہاسپٹل کے باہر سڑک پر کھڑی خالی الذہنی کی کیفیت میں سڑک پر دوڑتی ٹریفک کو دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہاں سے کہاں جائے اس نے ایک بار پھر مڑ کر ہاسپٹل کے ماتھے پر جگمگاتے الیکٹرک بورڈ پر ڈاکٹر جلال انصر کا نام دیکھا۔

"تم اچھی لڑکی ہو، مگر لوگ تمہیں اچھا نہیں سمجھتے۔"

اسے چند منٹ پہلے کہے ہوئے اس کے الفاظ یاد آئے، وہاں کھڑے اسے پہلی بار پتا چلا کہ اس نے اپنی پوری زندگی یک طرفہ محبت میں گزاری تھی۔ جلال انصر کو اس سے کبھی محبت تھی ہی نہیں۔ نہ ساڑھے آٹھ سال پہلے، نہ ہی اب اس کو صرف امامہ کی ضرورت نہیں تھی، اس کے ساتھ منسلک باقی چیزوں کی بھی ضرورت تھی۔ اس کا لمبا چوڑا فیملی بیک گراؤنڈ سوسائٹی میں اس کے خاندان کا نام اور مرتبہ اس کے خاندان کے کانٹیکٹس۔ اس کے خاندان کی دولت..... جس کے ساتھ منسلک ہو کر وہ ٹاپ لگا کر راتوں رات اپر کلاس میں آ جاتا اور وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہی کہ وہ صرف اس کی محبت میں مبتلا تھا اس کا خیال تھا کہ وہ ایک بار بھی اس کے کردار کے حوالے سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ وہ کم از کم یہ یقین ضرور رکھے گا کہ وہ غلط راستے پر نہیں چل سکتی مگر وہ پھر غلط تھی اس کے نزدیک وہ ایک اسکینڈلائزڈ لڑکی تھی جس کے دفاع میں اپنی فیملی یا دوسرے لوگوں سے کچھ کہنے کے لئے اس کے پاس کوئی لفظ نہیں تھا۔ ساڑھے آٹھ سال پہلے گھر چھوڑتے ہوئے وہ جانتی تھی کہ لوگ اس کے بارے میں بہت کچھ کہیں گے۔ وہ اپنے لئے کانوں بھرا راستہ، زہر اگلتی زبانیں اور طنز کرتی نظریں چن رہی تھی مگر اس نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان لوگوں میں جلال انصر بھی شامل ہو گا۔ زہر اگلتی زبانوں میں ایک زبان اس کی بھی ہو گی۔ وہ زندگی میں کم از کم جلال انصر کو اپنے کردار کے اچھا ہونے کے بارے میں کوئی صفائی یا وضاحت نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ اس کو کوئی صفائی دے ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے لفظوں نے ساڑھے آٹھ سال بعد پہلی بار اسے صحیح معنوں میں حقیقت کے تپتے ہوئے صحرا میں پھینک دیا تھا۔ وہ معاشرے کے لئے ایک outcast بن چکی تھی۔

"تو امامہ ہاشم یہ ہے تمہاری اوقات، ایک اسکینڈلائزڈ اور stigmatized (داغ دار) لڑکی اور تم اپنے آپ کو کیا سمجھے بیٹھی تھیں۔"

وہ فٹ پاتھ پر چلنے لگی۔ ہر بورڈ، ہر نیون سائن کو پڑھتے ہوئے.. وہاں لگے ہوئے بہت سے ڈاکٹروں کے ناموں سے وہ واقف تھی۔ ان میں سے کچھ اس کے کلاس فیلوز تھے۔ کچھ اس سے جونیئر، کچھ اس سے سینئر اور وہ خود کہاں کھڑی تھی کہیں بھی نہیں۔

"تم دیکھنا امامہ! تم کس طرح ذلیل و خوار ہو گی۔ تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا، کچھ بھی نہیں۔"

اس کے کانوں میں ہاشم مبین کی آواز گونجنے لگی تھی۔ اس نے اپنے گالوں پر سیال بہنے کو بہتے

محسوس کیا۔ آس پاس موجود روشنیاں اب اس کی آنکھوں کو اور چندھیانے لگی تھیں۔ جلال انصر برا آدمی نہیں تھا۔ بس وہ، وہ نہیں تھا جو سمجھ کر وہ اس کی طرف گئی تھی۔ کیسا دھوکا تھا جو اس نے کھایا تھا۔ جان بوجھ کر کھلی آنکھوں کے ساتھ، وہ بھی ایک مادہ پرست تھا مکمل مادہ پرست۔ صرف اس کا یہ روپ اس نے پہلی بار دیکھا تھا اور اس کے لئے یہ سب ناقابل یقین تھا۔ وہ برا آدمی نہیں تھا۔ اس کی اپنی اخلاقیات تھیں اور وہ ان کے ساتھ جی رہا تھا۔ امامہ ہاشم کو آج اس نے وہ اخلاقیات بتا دی تھیں۔ اس نے اپنی تضحیک اور تحقیر آٹھ سالوں میں پہلی بار دیکھی تھی اور وہ بھی اس شخص کے ہاتھوں جسے وہ خوبیوں کا مجموعہ سمجھتی رہی تھی اور خوبیوں کے اس مجموعے کی نظروں میں وہ کیا تھی؟ گھر سے بھاگی ہوئی ایک اسکینڈلائزڈ لڑکی۔ آنسوؤں کا ایک سیلاب تھا جو اس کی آنکھوں سے اندر ہا تھا اور اس میں سب کچھ بہہ رہا تھا، سب کچھ اس نے بے رحمی کے ساتھ آنکھوں کو رگڑا۔ اپنی چادر کے ساتھ گیلے چہرے کو خشک کرتے ہوئے ایک رکشے کو روک کر وہ اس میں بیٹھ گئی۔

دروازہ سعیدہ اماں نے کھولا تھا۔ وہ سر جھکائے اس طرح اندر داخل ہوئی کہ اس کے چہرے پر ان کی نظر نہ پڑتی۔

"کہاں تھیں تم امامہ   رات ہو گئی۔ میرا تو دل گھبرا رہا تھا۔ ساتھ والوں کے گھر جانے ہی والی تھی میں کہ کوئی تمہارے آفس جا کر تمہارا پتا کرے۔"

سعیدہ اماں دروازہ بند کر کے تشویش کے عالم میں اس کے پیچھے آئی تھیں۔

"کہیں نہیں اماں   ! بس آفس میں کچھ کام تھا اس لئے دیر ہو گئی۔"

اس نے ان سے چند قدم آگے چلتے ہوئے پیچھے مڑے بغیر ان سے کہا۔

"پہلے تو کبھی تمہیں آفس میں دیر نہیں ہوئی۔ پھر آج کیا ہوگا کہ رات ہو گئی۔ آخر آج کیوں اتنی دیر روکا انہوں نے تمہیں؟" سعیدہ اماں کو اب بھی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

"اس کے بارے میں، میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ آئندہ دیر نہیں ہو گی۔" وہ اسی طرح اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"کھانا گرم کر دوں یا تھوڑی دیر بعد کھاؤ گی؟" انہوں نے اس کے پیچھے آتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں کچھ دیر کے لئے سونا چاہتی ہوں۔"

اس نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"درد کیوں ہو رہا ہے؟ کوئی دوائی دے دوں یا چائے بنا دوں؟" سعیدہ اماں کو اور تشویش لاحق ہوئی۔

"اماں! پلیز مجھے سونے دیں۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہوئی تو میں آپ سے کہہ دوں گی۔"

اس کے سر میں واقعی درد ہو رہا تھا۔ سعیدہ اماں کو شاید اندازہ ہو گیا کہ ان کی تشویش اس وقت اسے بے آرام کر رہی ہے۔

"ٹھیک ہے تم سو جاؤ۔" وہ جانے کے لئے پلٹیں۔

امامہ نے اپنے کمرے کی لائٹ آن نہیں کی، اس نے اسی طرح اندھیرے میں دروازے کو بند کیا اور اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ اپنا کمبل کھینچ کر اس نے سیدھا لیٹتے ہوئے اپنی آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ وہ اس وقت صرف سونا چاہتی تھی۔ وہ کچھ بھی یاد نہیں کرنا چاہتی تھی نہ جلال انصر سے ہونے والی کچھ دیر پہلے کی گفتگو نہ ہی کچھ اور۔   وہ رونا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ اسے نیند کیسے آ گئی یہ وہ نہیں جانتی تھی مگر وہ بہت گہری نیند سوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ اس سے تین قدم آگے کھڑا تھا۔ اتنا قریب کہ وہ ہاتھ بڑھاتی تو اس کا کندھا چھو لیتی۔ وہاں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ اس کے کندھے سے اوپر خانہ کعبہ کے کھلتے ہوئے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ نور کے اس سیلاب کو دیکھ رہی تھی جس نے وہاں موجود ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ خانہ کعبہ کے غلاف پر تحریر آیات کو بآسانی دیکھ سکتی تھی۔ وہ آسمان پر موجود ستاروں کی روشنی کو یک دم بڑھتے محسوس کر سکتی تھی۔

ان میں سے آگے کھڑا شخص تلبیہ پڑھ رہا تھا۔ وہاں گونجنے والی واحد آواز اسی کی آواز تھی۔ خوش الحان آواز   اس نے بے اختیار اپنے آپ کو اس کے پیچھے وہی کلمات دہراتے پایا۔ اسی طرح جس طرح وہ پڑھ رہا تھا، مگر زیرِ لب پھر وہ اپنی آواز اس کی آواز میں ملانے لگی۔ اسی کی طرح مگر زیر لب   پھر اس کی آواز بلند ہونے لگی پھر اس کو احساس ہوا   وہ اپنی آواز اس کی آواز سے بلند نہیں کر پا رہی تھی۔ اس نے کوشش ترک کر دی۔ وہ اس کی آواز میں آواز ملاتی رہی۔

خانہ کعبہ کا دروازہ کھل چکا تھا۔ اس نے اس شخص کو آگے بڑھ کر دروازے کے پاس جا کر کھڑے ہوتے دیکھا۔ اس نے اسے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتے دیکھا۔ وہ دعا کر رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہی پھر اس نے ہاتھ نیچے کر لئے۔ اب وہ نیچے بیٹھ کر زمین پر سجدہ کر رہا تھا، کعبہ کے دروازے کے سامنے۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ اب وہ کھڑا ہو رہا تھا۔ وہ پلٹنے والا تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کی آواز شناسا تھی مگر چہرہ، چہرہ دیکھے بغیر   وہ اب مڑ رہا تھا۔

☆ — ☆ ...... ☆

وہ یک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ چند لمحوں کے لئے اسے لگا وہ وہیں ہو، خانہ کعبہ میں۔ پھر جیسے وہ حقیقت میں واپس آگئی۔ اس نے اٹھ کر کمرے کی لائٹ جلا دی اور پھر بیڈ پر آکر دوبارہ بیٹھ گئی۔ اسے خواب اپنی پوری جزئیات سمیت یاد تھا، یوں جیسے اس نے کوئی فلم دیکھی ہو۔ مگر اس آدمی کا چہرہ وہ اسے نہیں دیکھ سکی تھی۔ اس کے مڑنے سے پہلے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

"خوش الحان آواز، جلال انصر کے سوا کس کی ہو سکتی ہے۔" اس نے سوچا۔

مگر وہ شخص دراز قد تھا۔ جلال انصر سانولا تھا، اس شخص کے احرام میں سے نکلے ہوئے کندھے اور بازوؤں کی رنگت صاف تھی اور اس کی آواز وہ شناسا تھی۔ وہ یہ پہچان نہیں پا رہی تھی کہ وہ آواز جلال کی تھی یا کسی اور کی۔

خواب بہت عجیب تھا مگر اس کے سر کا درد غائب ہو چکا تھا اور وہ حیران کن طور پر پرسکون تھی۔ اس نے اٹھ کر کمرے کی لائٹ آن کی۔ وال کلاک ایک بجا رہا تھا۔ امامہ کو یاد آیا وہ رات کو عشاء کی نماز پڑھے بغیر ہی سو گئی تھی۔ اس نے کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے تھے نہ ہی سونے سے پہلے وضو کیا تھا۔ اس نے کپڑے تبدیل کیے اور اپنے کمرے سے باہر آگئی۔ سعیدہ اماں کے کمرے میں روشنی نہیں تھی۔ وہ سو رہی تھیں۔ پورے گھر میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صحن میں بلب جل رہا تھا۔ ہلکی ہلکی دھند کی موجودگی بھی بلب کی روشنی میں محسوس کی جا سکتی تھی۔ صحن کی دیواروں کے ساتھ چڑھی ہوئی بیلیں، سرخ اینٹوں کی دیواروں کے ساتھ بالکل ساکت تھیں۔ وہ وضو کرنے کے لئے صحن کے دوسری طرف موجود باتھ روم میں جانا چاہتی تھی مگر صحن میں جانے کے بجائے وہ برآمدے کے ستون کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اپنے سویٹر کی آستینوں کو اوپر کرتے ہوئے اس نے اپنی شرٹ کی آستینوں کے بٹن کھولتے ہوئے انہیں اوپر فولڈ کر دیا۔ چند لمحوں کے لئے اسے جھرجھری آئی۔ خنکی بہت زیادہ تھی پھر وہ ان بیلوں کو دیکھنے لگی۔ ایک بار پھر جلال انصر کے ساتھ شام کو ہونے والی ملاقات اسے یاد آ رہی تھی مگر اس بار اس کی باتوں کی گونج اسے اشکبار نہیں کر رہی تھی۔

دستگیری میری تنہائی کی تو نے ہی تو کی
میں تو مر جاتا اگر ساتھ نہ ہوتا تیرا
تہ بہ تہ تیرگیاں ذہن پہ جب ٹوٹتی ہیں
نور ہو جاتا ہے کچھ اور ہویدا تیرا
کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا
اس کی دولت ہے فقط نقش کف پا تیرا

ایک افسردہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ گزرے ہوئے پچھلے ساڑھے آٹھ

سالوں میں یہ آواز اور یہ الفاظ اس کے ذہن سے کبھی معدوم نہیں ہوئے تھے اور پھر اسے کچھ دیر پہلے کے خواب میں سنائی دینے والی وہ دوسری آواز یاد آئی۔

"لبیک اللھم لبیک، لبیک لاشریک لک لبیک، ان الحمد والنعمة لک والملک لا شریک لک."

وہ آواز مانوس اور شناسا تھی مگر جلال انصر کی آواز کے علاوہ وہ اور کسی آواز سے واقف نہیں تھی۔

آنکھیں بند کر کے اس نے خواب میں دیکھے ہوئے اس منظر کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ مقام ملتزم، خانہ کعبہ کا کھلا دروازہ، غلاف کعبہ کی وہ روشن آیات وہ پرسکون، ٹھنڈی معطر رات خانہ کعبہ کے دروازے سے پھوٹتی وہ دودھیا روشنی اور سجدہ کرتا تلبیہ پڑھتا وہ مرد امامہ نے آنکھیں کھول دیں۔

کچھ دیر تک وہ صحن میں اتری دھند میں نظریں جمائے اس آدمی کے بارے میں سوچتی رہی۔

اس آدمی کے برہنہ کندھے کی پشت پر بکھرے ہلکے بالوں میں زخم کا ایک مندمل شدہ نشان تھا۔ امامہ کو حیرت ہو رہی تھی۔ خواب کی اس طرح کی جزئیات اسے پہلے کبھی یاد نہیں رہی تھیں۔ اس نے زندگی میں پہلی بار خانہ کعبہ کو خواب میں دیکھا تھا اور وہیں بیٹھے اسے خواہش ہوئی تھی کہ کاش وہ کبھی اسی طرح مسجد نبوی ﷺ میں روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کھڑی ہو۔ اسی طرح مسجد نبوی ﷺ لوگوں سے خالی ہو۔ وہاں صرف وہ ہو۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکی وہ کتنی دیر وہاں اسی طرح بیٹھی رہی۔ وہ اپنے گردوپیش میں تب لوٹی تھی جب سعیدہ اماں تہجد پڑھنے کے لئے وضو کرنے کی خاطر باہر صحن میں نکلی تھیں۔ امامہ کو وہاں اس وقت دیکھ کر وہ حیران ہوئی تھیں۔

"تمہارے سر کا درد کیسا ہے؟" اس کے پاس کھڑے ہو کر انہوں نے پوچھا۔

"اب تو درد نہیں ہے۔" امامہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"رات کو کھانا کھائے بغیر ہی سو گئی تھیں؟" وہ اس کے پاس برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

وہ خاموش رہی۔ سعیدہ اماں ایک گرم اونی شال اوڑھے ہوئے تھیں۔ امامہ نے ان کے کندھے پر اپنا چہرہ ٹکا دیا۔ اس کے سرد چہرے کو گرم شال سے ایک عجیب سی آسودگی کا احساس ہوا۔

"اب تم شادی کر لو آمنہ!" سعیدہ اماں نے اس سے کہا۔ وہ اسی طرح گرم شال میں اپنا چہرہ چھپائے رہی۔ سعیدہ اماں پہلی بار یہ بات نہیں کہہ رہی تھیں۔

"آپ کر دیں۔" وہ ہمیشہ ان کی اس بات پر خاموشی اختیار کر لیتی تھی۔ کیوں؟ وجہ خود بھی نہیں جانتی تھی لیکن آج پہلی بار وہ خاموش نہیں رہی تھی۔

"تم سچ کہہ رہی ہو؟" سعیدہ اماں اس کی بات پر حیران ہوئی تھیں۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں " آمنہ نے سر ان کے کندھے سے اُٹھالیا۔

"تمہیں کوئی پسند ہے؟" سعیدہ اماں نے اس سے پوچھا۔ وہ سر جھکائے صحن کے فرش کو دیکھ رہی تھی۔

"کوئی مجھے پسند ہے؟ نہیں مجھے کوئی بھی پسند نہیں ہے۔" سعیدہ اماں کو اس کی آواز بھرائی ہوئی لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ کہتیں اس نے ایک بار پھر ان کی شال میں اپنا چہرہ چھپالیا۔

"تمہاری شادی ہو جائے تو میں بھی انگلینڈ چلی جاؤں گی۔"

انہوں نے اس کے سر کو تھپتھپاتے ہوئے کہا اور اس کے سر کو تھپتھپاتے ہوئے ہی انہیں احساس ہوا کہ وہ ان کی شال میں منہ چھپائے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

"آمنہ! آمنہ بیٹا کیا ہوا؟" انہوں نے پریشان ہو کر اس کا چہرہ اُٹھانے کی کوشش کی۔

وہ کامیاب نہیں ہوئیں۔ وہ اسی طرح ان کے ساتھ لگ کر روتی رہی۔

"اللہ کے لئے کچھ تو بتاؤ، کیوں رو رہی ہو؟" وہ دل گرفتہ ہو گئیں۔

"کچھ نہیں...... بس ایسے ہی...... سر میں درد ہو رہا ہے۔" انہوں نے زبردستی اس کا گیلا چہرہ اوپر کیا تھا۔ وہ اب اپنی آستینوں سے چہرہ پونچھتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے سعیدہ اماں سے آنکھیں نہیں ملائی تھیں۔ سعیدہ اماں ہکا بکا سے باتھ روم کی طرف جاتے دیکھتی رہیں۔

سعیدہ اماں اس کی شادی کی بات کرنے والی اکیلی نہیں تھیں۔ اس کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ڈاکٹر سبط علی نے ایک بار پھر اس سے شادی کا ذکر کیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تب اس نے کیوں انکار کر دیا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اب آزاد تھی۔

"مجھے کچھ عرصہ جاب کر لینے دیں اس کے بعد میں شادی کرواں گی۔" اس نے ڈاکٹر سبط علی سے کہا تھا۔ شاید یہ پچھلے کئی سالوں سے ڈاکٹر سبط علی پر مالی طور پر ایک بوجھ بننے کا احساس تھا، جس سے وہ نجات حاصل کرنا چاہتی تھی یا پھر کہیں اس کے لاشعور میں یہ چیز تھی کہ ڈاکٹر سبط علی کو اس کی شادی پر ایک بار پھر اخراجات کرنے پڑیں گے اور وہ یہ چاہتی تھی کہ وہ ان اخراجات کے لئے خود کچھ جمع کرنے کی کوشش کر لے۔ اس نے یہ بات ڈاکٹر سبط علی کو نہیں بتائی تھی مگر اس نے ان سے جاب کی اجازت لے لی تھی۔

شاید وہ ابھی کچھ عرصہ مزید جاب کرتی رہتی، مگر جلال انصر سے اس ملاقات کے بعد وہ ایک تکلیف دہ ذہنی دھچکے سے دوچار ہوئی تھی اور اس نے یک دم سعیدہ اماں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ وہ نہیں جانتی۔ سعیدہ اماں نے ڈاکٹر سبط علی سے اس بات کا ذکر کیا یا نہیں مگر وہ خود ان دنوں مکمل طور پر اس کے لئے رشتے کی تلاش میں سرگرداں تھیں اور اس کوشش کا نتیجہ فہد کی صورت میں نکلا تھا۔

فہد ایک کمپنی میں اچھے عہدے پر کام کر رہا تھا اور اس کی شہرت بھی بہت اچھی تھی۔ فہد کے گھر والے اسے پہلی بار دیکھ کر ہی پسند کر گئے تھے اور اس کے بعد سعیدہ اماں نے ڈاکٹر سبط علی سے اس رشتے کی بات کی۔

ڈاکٹر سبط علی کو کچھ تامل ہوا...... شاید وہ اس کی شادی اب بھی اپنے جاننے والوں میں کرنا چاہتے تھے، مگر سعیدہ اماں کی فہد اور اس کے گھر والوں کی بے پناہ تعریفوں کے بعد اور فہد اور اس کے گھر والوں سے خود ملنے کے بعد انہوں نے سعیدہ اماں کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا، البتہ انہوں نے فہد کے بارے میں بہت چھان بین کروائی تھی اور پھر وہ بھی مطمئن ہو گئے تھے۔

فہد کے گھر والے ایک سال کے اندر شادی کرنا چاہتے تھے لیکن پھر اچانک انہوں نے چند ماہ کے اندر شادی پر اصرار کرنا شروع کر دیا۔ یہ صرف ایک اتفاق ہی تھا کہ ڈاکٹر سبط علی اسی دوران اپنی کچھ مصروفیات کی وجہ سے انگلینڈ میں تھے جب فہد کے گھر والوں کے اصرار پر تاریخ طے کر دی گئی تھی۔ سعیدہ اماں فون پر ان سے مشورہ کرتی رہی تھیں اور ڈاکٹر سبط علی نے انہیں اپنا انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔ وہ فوری طور پر وہاں سے نہیں آ سکتے تھے، البتہ انہوں نے کلثوم آنٹی کو واپس پاکستان بھجوا دیا تھا۔

اس کی شادی کی تیاری کلثوم آنٹی اور مریم نے ہی کی تھی جو راولپنڈی سے کچھ ہفتوں کے لئے اپنی سسرال لاہور آ گئی تھی۔ ڈاکٹر سبط علی نے اس کی شادی کی تاریخ طے ہو جانے کے بعد فون پر اس سے طویل گفتگو کی تھی۔ ان کی تینوں بیٹیوں کی شادی ان کے اپنے خاندان میں ہی ہوئی تھی اور ان کے سسرال میں سے کسی نے بھی جہیز نہیں لیا تھا، مگر ڈاکٹر سبط علی نے تینوں بیٹیوں کے جہیز کے لئے مخصوص کی جانے والی رقم انہیں تحفتاً دے دی تھی۔

"ساڑھے آٹھ سال پہلے جب آپ میرے گھر آئیں تھیں اور میں نے آپ کو اپنی بیٹی کہا تھا تو میں نے آپ کے لئے بھی کچھ رقم رکھ دی تھی۔ وہ رقم آپ کی امانت ہے۔ آپ اسے ویسے لے لیں یا پھر میں مریم اور کلثوم سے کہہ دوں گا کہ وہ آپ کے جہیز کی تیاری پر اسے خرچ کریں۔ سعیدہ آپا کی خواہش تھی کہ شادی ان کے گھر پر ہو ورنہ میں چاہتا تھا کہ یہ شادی میرے گھر پر ہو۔ آپ کے گھر پر " انہوں نے اس سے کہا تھا۔

"مجھے اس بات پر بہت رنج ہے کہ میں اپنی چوتھی بیٹی کی شادی میں شرکت نہیں کر سکوں گا مگر شاید اس میں ہی کوئی بہتری ہے۔ میں پھر بھی آخری وقت تک کوشش کروں گا کہ کسی طرح شادی پر آ جاؤں۔"

وہ ان کی باتوں کے جواب میں بالکل خاموش رہی تھی۔ اس نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ نہ ہی یہ اصرار کیا تھا کہ وہ اپنی شادی پر اپنی رقم خرچ کرے گی اور نہ ہی یہ کہ وہ شادی ان کی رقم سے نہیں کرنا چاہتی۔ اس دن اس کا دل چاہا تھا ان کا ایک اور احسان لینے کو۔ وہ اس پر اتنے احسان کر چکے تھے کہ اب اسے ان احسانوں کی عادت ہونے لگی تھی۔ اسے صرف ان سے ایک گلہ تھا وہ آخر اس کی شادی میں شرکت کیوں

نہیں کر رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

فہد کے گھر والوں کا اصرار تھا کہ شادی سادگی سے ہو اور اس پر کسی کو بھی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ امامہ خود بھی شادی سادگی سے کرنا چاہتی تھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ فہد کے گھر والوں کا سادگی پر اصرار دراصل کچھ اور وجوہات کی بنا پر تھا۔

اس کا نکاح مہندی والی شام کو ہونا تھا، مگر اس شام کو سہ پہر کے قریب فہد کے گھر والوں کی طرف سے یہ اطلاع دی گئی کہ نکاح اگلے دن یعنی شادی والے دن ہی ہوگا۔ تب تک اسے یا سعیدہ اماں کو کوئی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ فہد کے گھر میں کوئی مسئلہ تھا۔ مہندی کی ویسے بھی کوئی لمبی چوڑی تقریب نہیں تھی۔ صرف سعیدہ اماں کے بہت قریبی لوگ تھے یا پھر نزدیکی ہمسائے۔ نکاح کی تقریب کے لئے جس کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا وہ ان لوگوں کو سرو کر دیا گیا۔

شادی کی تقریب بھی سادگی سے گھر پر ہی ہونی تھی۔ چار بجے بارات کو آنا تھا اور چھ بجے کے قریب رخصتی تھی لیکن بارات آنے سے ایک گھنٹہ پہلے فہد کے گھر والوں نے سعیدہ اماں کو فہد کی روپوشی کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے اس رشتے سے معذرت کر لی۔

امامہ کو چار بجے تک اس سارے معاملے کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ فہد کے گھر سے عروسی لباس پہلے بھجوا دیا گیا تھا اور وہ اس وقت وہ لباس پہنے تقریباً تیار تھی جب مریم اس کے کمرے میں چلی آئی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے امامہ کو کپڑے تبدیل کرنے کے لئے کہا۔ اس نے امامہ کو فوری طور پر یہ نہیں بتایا تھا کہ فہد کے گھر والے انکار کر کے جا چکے تھے۔ اس نے امامہ سے صرف یہی کہا کہ فہد کے گھر والوں نے شادی کینسل کر دی ہے اس کے گھر میں کسی قریبی عزیز کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ یہ بتا کر بہت افراتفری میں کمرے سے نکل گئی۔ امامہ نے کپڑے تبدیل کر لئے لیکن اس وقت اس کی چھٹی حس نے اسے اس پریشانی سے آگاہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے مریم کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

کپڑے تبدیل کر کے وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آئی اور باہر موجود لوگوں کے تاثرات نے اس کے تمام شبہات کی تصدیق کر دی تھی۔ وہ سعیدہ اماں کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ کلثوم آنٹی، میمونہ، نورالعین آپا ہمسائے میں رہنے والی چند عورتیں، مریم اور سعیدہ اماں مریم سعیدہ اماں کو پانی پلا رہی تھی۔ وہ بہت نڈھال نظر آ رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے اس کے دل کی دھڑکن رکی۔ انہیں کیا ہوا تھا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی سب کی نظریں اس پر پڑیں۔ میمونہ آپا اس کی طرف تیزی سے بڑھیں۔

"آمنہ! تم باہر آ جاؤ۔" انہوں نے اسے ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔

"اماں کو کیا ہوا ہے؟" وہ ان کی طرف بڑھ گئی۔ کلثوم آنٹی نے کمرے میں موجود لوگوں کو باہر نکالنا شروع کر دیا۔ وہ سعیدہ اماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"انہیں کیا ہوا ہے؟" اس نے بے تابی سے مریم سے پوچھا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ سعیدہ اماں کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ امامہ کو دیکھ رہی تھیں مگر اسے یوں لگا جیسے وہ اس وقت اسے دیکھ نہیں پا رہی تھیں۔ گلاس ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے انہوں نے اسے ساتھ لگا کر رونا شروع کر دیا۔

کمرہ خالی ہو چکا تھا۔ صرف ڈاکٹر سبط علی کی فیملی وہاں پر تھی۔

"کیا ہوا ہے اماں؟ مجھے بتائیں۔" امامہ نے انہیں نرمی سے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"فہد نے اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر گھر سے جا کر کسی اور کے ساتھ شادی کر لی ہے۔" مریم نے دھیمی آواز میں کہا۔ "وہ لوگ کچھ دیر پہلے معذرت کرنے آئے تھے۔ وہ لوگ یہ رشتہ ختم کر گئے ہیں۔"

چند منٹ تک وہ بالکل ساکت رہی تھی۔ خون کی گردش، دل کی دھڑکن، چلتی ہوئی سانس چند سیکنڈز سب کچھ جیسے رک گیا تھا۔"

"کیا میرے ساتھ یہ بھی ہونا تھا؟" اس نے بے اختیار سوچا۔

"کوئی بات نہیں اماں! آپ کیوں رو رہی ہیں؟" اس نے بڑی سہولت سے سعیدہ اماں کے آنسو صاف کئے۔ سب کچھ ایک بار پھر بحال ہو گیا تھا سوائے اس کی رنگت کے وہ فق تھی۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔" سعیدہ اماں کو اس کی باتوں پر اور رونا آیا۔

"یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے میں " امامہ نے انہیں بات مکمل کرنے نہیں دی۔

"اماں! چھوڑیں ناں۔ کوئی بات نہیں، آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ لیٹ جائیں۔ کچھ دیر آرام کر لیں۔" وہ انہیں پرسکون کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں تمہارے دل کی حالت کو سمجھ سکتی ہوں۔ میں تمہارے غم کو جانتی ہوں۔ آمنہ! میری بچی مجھے معاف کر دو۔ یہ سب میری وجہ سے ہی ہوا ہے!" انہیں تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔

"مجھے کوئی غم نہیں ہے اماں! کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے سعیدہ اماں سے کہا۔

سعیدہ اماں یک دم روتے ہوئے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

امامہ کسی سے کوئی بات کئے بغیر ایک بار پھر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس کے بیڈ پر تمام چیزیں اسی طرح پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے انہیں سمیٹنا شروع کر دیا۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس وقت وہاں بیٹھی رو رہی ہوتی مگر وہ غیر معمولی طور پر پرسکون تھی۔

"اگر میں جلال کے نہ ملنے پر صبر کر سکتی ہوں تو یہ تو پھر ایک ایسا شخص تھا جس کے ساتھ میری کوئی جذباتی وابستگی نہیں تھی۔" اس نے اپنے مردی لباس کو تہ کرتے ہوئے سوچا۔

"زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا، یہاں بھی لوگوں کے سامنے نظریں چرا کر اور سر جھکا کر چلنا پڑے گا۔ کچھ باتیں اور بے عزتی برداشت کرنی پڑے گی تو پھر کیا ہوا۔ اس میں میرے لئے نیا کیا ہے۔"

مریم کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے ساتھ چیزیں سمیٹنے لگی۔

"ابو کو فون کر دیا ہے۔" اس نے امامہ کو بتایا۔

وہ پہلی بار کچھ جھنجھلائی۔

"کیوں خوامخواہ تم لوگ انہیں تنگ کر رہے ہو۔ انہیں وہاں سکون سے رہنے دو۔"

"اتنا بڑا حادثہ ہو گیا ہے اور تم—"

اس نے مریم کی بات کاٹ دی۔

"مریم میری زندگی میں اس سے بڑے حادثے ہو چکے ہیں۔ یہ کیا معنی رکھتا ہے۔ مجھے تکلیف سہنے کی عادت ہو چکی ہے۔ تم سعیدہ اماں کو تسلی دو۔ مجھے کچھ نہیں ہوا میں بالکل ٹھیک ہوں اور ابو کو بھی خوامخواہ تنگ نہ کرو۔ وہ وہاں پریشان ہوں گے۔"

مریم کو چیزیں سمیٹتے ہوئے وہ ہدایات دینے لگی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی۔ کلثوم آنٹی، سعیدہ اماں کے ساتھ یک دم اندر آ گئیں۔ امامہ کو ان دونوں کے چہرے بہت عجیب لگے۔ کچھ دیر پہلے کے برعکس وہ دونوں بے حد خوش نظر آ رہی تھیں۔ اس کے کسی سوال سے پہلے کلثوم آنٹی نے اسے سالار کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ وہ دم بخود ان کی باتیں سن رہی تھی۔

"اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو تمہارا نکاح اس سے کر دیا جائے؟" آنٹی نے اس سے پوچھا۔

"سبط علی اسے بہت اچھی طرح جانتے تھے، وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔" وہ اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"اگر ابو اسے جانتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جیسا بہتر سمجھیں کریں۔"

"اس کا ایک دوست تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔" وہ اس مطالبے پر کچھ حیران ہوئی تھی مگر اس نے فرقان سے ملنے سے انکار نہیں کیا۔

"میرے دوست نے آٹھ نو سال پہلے ایک لڑکی سے نکاح کیا تھا۔ اپنی پسند سے۔"

وہ چپ چاپ فرقان کو دیکھتی رہی۔

"وہ آپ سے شادی پر تیار ہے، مگر وہ اس لڑکی کو طلاق دینا نہیں چاہتا۔ کچھ وجوہات کی بنا پر وہ

لڑکی اس کے ساتھ نہیں رہی لیکن وہ اب بھی اسے اپنے گھر میں رکھنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ کو یہ سب بتا دوں تاکہ اگر آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہو تو اس بات کو یہیں ختم کر دیں گے لیکن میں آپ سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ شاید وہ لڑکی اسے کبھی بھی نہ ملے، آٹھ نو سال سے اس کا میرے دوست کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے۔ یہ ایک موہوم سی امید ہے، جس پر وہ اس کا انتظار کر رہا ہے۔ ڈاکٹر سبط علی صاحب آپ کو اپنی بیٹی سمجھتے ہیں اور اس حوالے سے آپ میری بہن کی طرح ہیں۔ اس وقت اس صورت حال سے نکلنے کے لئے یہی بہتر ہے کہ آپ اس سے شادی کر لیں۔ وہ لڑکی اسے کبھی بھی نہیں ملے گی کیونکہ نہ تو وہ اسے پسند کرتی تھی نہ ہی آج تک اس نے اس سے کوئی رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے اور پھر اتنا لمبا عرصہ گزر چکا ہے۔"

وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"دوسری بیوی ...... تو امامہ ہاشم یہ ہے تمہاری وہ تقدیر جو اب تک تم سے پوشیدہ تھی۔" اس نے سوچا۔

"اگر ڈاکٹر سبط علی اس شخص کے بارے میں یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کو میرے لئے منتخب کر رہے ہیں تو ہو سکتا ہے میرے لئے یہی بہتر ہو۔ میں جلال کی بھی تو دوسری بیوی بننے کے لئے تیار تھی، اس سے محبت کرنے کے باوجود اور اس شخص کی بیوی بننے پر مجھے کیا اعتراض ہوگا جس سے مجھے محبت بھی نہیں ہے۔"

اسے ایک بار پھر جلال یاد آیا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ان کی بیوی جب بھی آئے وہ اسے رکھ سکتے ہیں۔ میں بڑی خوشی سے ان کو یہ اجازت دیتی ہوں۔" مدھم آواز میں کسی ملال کے بغیر اس نے فرقان سے کہا۔

پندرہ منٹ بعد اسے پہلا شاک اس وقت لگا تھا جب نکاح خواں نے اس کے سامنے سالار سکندر کا نام لیا تھا۔

"سالار سکندر ولد سکندر عثمان۔" اسے نکاح خواں کے منہ سے نکلنے والے لفظوں سے جیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ نام ایسے نہیں تھے جو ہر شخص کے ہوتے۔

"سالار سکندر...... سکندر عثمان؟ اور پھر اس ترتیب میں کیا یہ شخص زندہ...... ہے—؟"

اس کے سر پر جیسے آسمان آ گرا تھا۔ اس کے چہرے پر چادر کا گھونگھٹ نہ ہوتا تو اس وقت اس کے چہرے کے تاثرات نے سب کو پریشان کر دیا ہوتا۔ نکاح خواں اپنے کلمات دوبارہ دہرا رہا تھا۔

امامہ کا ذہن ماؤف اور دل ڈوب رہا تھا اگر یہ شخص زندہ تھا تو ...... میں تو اب تک اس کے نکاح میں

بار اس نے بڑے شوق سے اپنے ہاتھوں پر نقش و نگار بنوائے تھے نہ صرف ہاتھوں پر بلکہ پیروں پر بھی۔

وہ اپنے پیروں کو دیکھنے لگی۔ شال کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کو اس کے نیچے چھپالیا۔

"اسجد سے جلال جلال سے فہد اور فہد سے سالار ایک شخص کو میں نے رد کیا، دو نے مجھے رد کر دیا اور جو تھا شخص جو میری زندگی میں شامل ہوا وہ سب سے بدترین ہے سالار سکندر۔

اس کے اندر دھواں سا بھر گیا۔ وہ اپنے اسی حلیے کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔ کھلا گریبان۔ گلے میں لٹکتی زنجیر، ربربینڈ میں بندھے بال، چبھتی ہوئی تضحیک آمیز نظریں، دائیں گال پر مذاق اڑاتی مسکراہٹ کے ساتھ پڑنے والا ڈمپل، کلائیوں میں لٹکتے بینڈز اور بریسلیٹ، عورتوں کی تصویروں والی تنگ جینز۔

وہ جیسے اس کی زندگی کے سب سے خوب صورت خواب کی سب سے بھیانک تعبیر بن کر سامنے آیا تھا۔ اس کے دل میں سالار سکندر کے لئے ذرہ برابر عزت نہ تھی۔

"میں نے زندگی میں بہت سی غلطیاں کی ہیں مگر میں اتنی بری نہیں ہوں کہ تمہارے جیسا برا مرد میری زندگی میں آئے۔" اس نے کئی سال پہلے فون پر اس سے کہا تھا۔

"شاید اسی لئے جلال نے بھی تم سے شادی نہیں کی کیونکہ نیک مردوں کے لئے نیک عورتیں ہوتی ہیں، تمہارے جیسی نہیں۔"

سالار نے جواباً کہا تھا۔ امامہ نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔

"چاہے کچھ ہو جائے سالار! میں تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی۔ تم واقعی مر جاتے تو زیادہ اچھا تھا۔" وہ بڑبڑائی تھی۔

اس وقت ایک لمحے کے لئے بھی اسے خیال نہیں آیا تھا کہ سالار سکندر نے کبھی اس پر کوئی احسان کیا تھا۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر سبط علی جس رات پاکستان واپس آئے تھے اس رات امامہ ان کے گھر پر ہی تھی مگر رات کو اس نے ان سے سالار کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ مریم ابھی لاہور میں ہی تھی اس لئے وہ سب آپس میں خوش گپیوں میں مصروف رہے۔

اگلے دن صبح بھی وہ سب اسی طرح اکٹھے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ وہ امامہ کو ان تحائف کے بارے میں بتاتے رہے جو وہ انگلینڈ سے امامہ اور سالار کے لئے لے کر آئے تھے۔ امامہ خاموشی سے سنتی رہی۔

"سالار بھائی کو تو آج افطاری پر بلائیں۔" یہ مریم کی تجویز تھی۔

ڈاکٹر سبط علی نے مریم کے کہنے پر سالار کو فون کیا۔ امامہ تب بھی خاموش رہی۔

وہ دوپہر کو نماز پڑھنے کے لئے باہر جانے لگے تو امامہ ان کے ساتھ باہر پورچ تک آگئی۔

"ابو! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"ابھی؟" ڈاکٹر سبط علی قدرے حیرانی سے بولے۔

"نہیں، آپ نماز پڑھ آئیں پھر واپسی پر۔"

وہ کچھ دیر تشویش سے اسے دیکھتے رہے اور پھر کچھ کہے بغیر باہر چلے گئے۔

☆......☆......☆

"میں سالار سے طلاق لینا چاہتی ہوں۔" وہ مسجد سے واپسی پر اسے لے کر اپنی اسٹڈی میں آگئے تھے اور امامہ نے بلا کسی تمہید یا توقف کے اپنا مطالبہ پیش کر دیا۔

"آمنہ!" وہ دم بخود رہ گئے۔

"میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔" وہ مسلسل فرش پر گھور رہی تھی۔

"آمنہ! آپ کے ساتھ اس کی دوسری شادی ضرور ہے لیکن اس کی پہلی بیوی کا کوئی پتا نہیں ہے۔ فرقان بتا رہا تھا کہ تقریباً نو سال سے ان دونوں میں کوئی رابطہ نہیں ہے اور شادی بھی نہیں، صرف نکاح ہوا تھا۔"

ڈاکٹر سبط علی، اس کے انکار کو پہلی شادی کے ساتھ جوڑ رہے تھے۔

"کون جانتا ہے وہ کہاں ہے، کہاں نہیں۔ نو سال بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔"

"میں اس کی پہلی بیوی کو جانتی ہوں۔" اس نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے کہا۔

"آپ؟" ڈاکٹر سبط علی کو یقین نہیں آیا۔

"وہ میں ہوں۔" اس نے پہلی بار سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

وہ بولنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

"آپ کو یاد ہے نو سال پہلے میں ایک لڑکے کے ساتھ اسلام آباد سے لاہور آئی تھی جس کے بارے میں آپ نے مجھے بعد میں بتایا تھا کہ میری فیملی نے اس کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی ہے۔"

"سالار سکندر....." ڈاکٹر سبط علی نے بے اختیار اس کی بات کاٹی۔

"یہ وہی سالار سکندر ہے؟" امامہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ جیسے شاک میں تھے۔ سالار سکندر سے ان کی فرقان کے توسط سے پہلی ملاقات امامہ کے گھر سے چلے آنے کے چار سال بعد ہوئی تھی اور ان کے ذہن میں کبھی یہ نہیں آیا کہ اس سالار کا امامہ سے کوئی تعلق ہو سکتا تھا۔ چار سال پہلے ملنے والے ایک نام کو وہ چار سال بعد ملنے والے ایک دوسرے شخص کے ساتھ نتھی نہیں کر سکتے تھے اور کر بھی دیتے اگر وہ چار سال پہلے والے سالار سے ہی ملتے مگر وہ جس شخص سے ملے تھے، وہ حافظ قرآن تھا۔ اس

ہوں۔ میرے خدا ... یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر سبط علی اسے کیسے جانتے ہیں۔ اس کے ذہن میں ایک انتشار برپا تھا۔

"آمنہ ... بیٹا! ہاں کہو۔" سعیدہ اماں نے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"سالار سکندر جیسے شخص کے لئے ہاں ...؟"

اس کا دل کسی نے اپنی مٹھی میں لے کر بھینچا ... وہ "ہاں" کے علاوہ اس وقت کچھ اور کہہ ہی نہیں سکتی تھی۔ خوف اور شاک کے عالم میں اس نے کاغذات پر دستخط کئے تھے۔

"کاش کوئی معجزہ ہو۔ یہ وہ سالار سکندر نہ ہو۔ یہ سب ایک اتفاق ہو۔" اس نے اللہ سے دعا کی تھی۔

ان سب لوگوں کے کمرے سے چلے جانے کے بعد مریم نے اس کے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ اس کے چہرے کا رنگ بالکل سفید ہو چکا تھا۔

"کیا ہوا؟" مریم کی تشویش میں اضافہ ہو گیا۔ وہ سمجھ نہیں سکی۔ وہ اس سے کیا کہہ رہی تھی۔ اس کا ذہن کہیں اور تھا۔

"مریم! Just do me a favour!" اس نے مریم کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں نے نکاح کر لیا ہے۔ مگر میں آج رخصتی نہیں چاہتی۔ تم سعیدہ اماں سے کہو کہ وہ آج میری رخصتی نہ کریں۔ پلیز ..."

مریم اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"کیوں؟"

"بس تم اس وقت مجھ سے کچھ نہ پوچھو، کچھ بھی نہیں۔ سعیدہ اماں سے کہو میں ابھی رخصتی نہیں چاہتی۔"

اس کے لہجے میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور تھا کہ مریم اٹھ کر باہر نکل گئی۔ وہ بہت جلد ہی واپس آ گئی۔

"امامہ، رخصتی نہیں ہو رہی ہے۔ سالار بھی رخصتی نہیں چاہتا۔"

امامہ کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کچھ کم ہو گئی۔

"ابو کا فون آنے والا ہے تمہارے لئے۔ وہ تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔"

اس نے امامہ کو مزید اطلاع دی۔ وہ فون سننے کے لئے دوسرے کمرے میں آ گئی۔ انہوں نے کچھ دیر بعد اسے فون کیا تھا۔ وہ اسے مبارکباد دے رہے تھے۔ امامہ کا دل رونے کو چاہا۔

"سالار بہت اچھا انسان ہے۔" وہ کہہ رہے تھے۔ "میری خواہش تھی کہ آپ کی شادی اسی سے ہو مگر چونکہ آپ سعیدہ آپا کے پاس رہ رہی تھیں اس لئے میں نے ان کی خواہش اور انتخاب کو مقدم سمجھا۔"

وہ سانس لینے تک کے قابل نہیں رہی تھی۔

"مجھے یہ علم نہیں تھا کہ سالار نے اس سے پہلے کبھی شادی کی تھی مگر تھوڑی دیر پہلے فرقان نے مجھے اس کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ صرف ضرورتاً کیا جانے والا کوئی نکاح تھا۔ فرقان نے مجھے تفصیل نہیں بتائی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میرے جاننے والوں میں سالار سے اچھا کوئی شخص ہوتا تو اس کے نکاح کے بارے میں جان لینے کے بعد میں آپ کی شادی سالار سے کرنے کے بجائے کہیں اور کرتا لیکن میرے ذہن میں سالار کے علاوہ اور کوئی آیا ہی نہیں۔ آپ خاموش کیوں ہیں آمنہ؟"

انہیں بات کرتے کرتے اس کا خیال آیا۔

"ابو! آپ واپس کب آئیں گے؟"

"میں ایک ہفتے تک آ رہا ہوں۔" ڈاکٹر سبط علی نے کہا۔

"مجھے آپ سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔ مجھے آپ کو بہت کچھ بتانا ہے۔"

"آپ خوش نہیں ہیں؟" ڈاکٹر سبط علی کو اس کے لہجے نے پریشان کیا۔

"آپ پاکستان آ جائیں پھر میں آپ سے بات کروں گی۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

☆ ☆ ☆

وہ رات کو سونے سے پہلے وضو کرنے کے لئے باتھ روم میں گئی۔ وضو کر کے واپس آتے ہوئے اپنے کمرے میں جانے کے بجائے وہ صحن میں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ گھر میں اس وقت کوئی مہمان نہیں تھا۔ وہ اور سعیدہ اماں ہمیشہ کی طرح تنہا تھے۔ سعیدہ اماں تھکاوٹ کی وجہ سے بہت جلد سو گئیں۔ وہ ملازمہ کے ساتھ گھر میں موجود کام نپٹاتی رہی۔ ساڑھے دس بجے کے قریب ملازمہ بھی اپنا کام ختم کر کے سونے کے لئے چلی گئی۔ وہ شادی کے کاموں کی وجہ سے پچھلے کچھ دنوں سے وہیں رہ رہی تھی۔ امامہ، کچن اور اپنے کمرے کے بہت سے چھوٹے چھوٹے کام نپٹاتی رہی۔

وہ جس وقت ان سب کاموں سے فارغ ہوئی اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ وہ بہت تھک چکی تھی مگر سونے سے پہلے وضو کرنے کے بعد صحن سے گزرتے ہوئے یک دم ہی اس کا دل اپنے کمرے میں جانے کو نہیں چاہا۔ وہ وہیں برآمدے میں بیٹھ گئی۔ صحن میں جلنے والی روشنیوں میں اس نے اپنے ہاتھوں اور کلائیوں پر لگی ہوئی مہندی کو دیکھا۔ مہندی بہت اچھی رچی تھی۔ اس کے ہاتھ کہنیوں تک سرخ بیل بوٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس نے کل بہت سالوں کے بعد پہلی بار بڑے شوق سے مہندی لگوائی تھی۔ اسے مہندی بہت پسند تھی۔ تہواروں کے علاوہ بھی وہ اکثر اپنے ہاتھوں پر مہندی لگایا کرتی تھی مگر ساڑھے آٹھ سال پہلے اپنے گھر سے نکل آنے کے بعد اس نے کبھی مہندی نہیں لگائی تھی۔ غیر محسوس طور پر ان تمام چیزوں سے اس کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی مگر ساڑھے آٹھ سال کے بعد پہلی

کے انداز و اطوار اور گفتار میں کہیں اس ذہنی مرض کا عکس نہیں پایا جاتا تھا جس کا حوالہ انہیں امامہ نے کئی بار دیا تھا۔ ان کا دعوٰی کھوکھلا تھا؟ ایک فطری امر تھا یا پھر یہ سب اسی طرح سے" طے کیا گیا تھا۔"

"اور آپ نے نو سال پہلے اس سے شادی کی تھی؟" وہ اب بھی بے یقینی کا شکار تھے۔

"صرف نکاح۔" اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"اور پھر اس نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ ڈاکٹر سبط علی بہت دیر خاموش رہے تھے پھر انہوں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"آپ کو مجھ پر اعتبار کرنا چاہئے تھا آمنہ! میں آپ کی مدد کر سکتا تھا۔"

امامہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، مجھے آپ پر اعتبار کر لینا چاہئے تھا مگر اس وقت میرے لئے یہ بہت مشکل تھا۔ آپ کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ میں اس وقت کس ذہنی کیفیت سے گزر رہی تھی یا پھر شاید میری قسمت میں یہ آزمائش بھی لکھی تھی اسے آنا ہی تھا۔"

وہ بات کرتے کرتے رکی، پھر اس نے نم آنکھوں کے ساتھ سر اٹھا کر ڈاکٹر سبط علی کو دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کی۔

"لیکن اب تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تو آپ طلاق لینے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔"

"نہیں، میں اب اس طلاق میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ آمنہ! میں نے اس سے آپ کی شادی کروائی ہے۔" انہوں نے جیسے اسے یاد دلایا۔

"اسی لئے تو میں آپ سے کہہ رہی ہوں۔ آپ اس سے مجھے طلاق دلوا دیں۔"

"لیکن کیوں، میں کیوں اس سے آپ کو طلاق دلوا دوں؟"

"کیونکہ کیونکہ وہ ایک اچھا آدمی نہیں ہے کیونکہ میں نے اپنی زندگی کو سالار جیسے آدمی کے ساتھ گزارنے کا نہیں سوچا۔ ہم دو مختلف دنیاؤں کے لوگ ہیں۔" وہ بے حد دلبرداشتہ ہو رہی تھی۔

"میں نے کبھی اللہ سے شکایت نہیں کی ابو! میں نے کبھی اللہ سے شکایت نہیں کی مگر اس بار مجھے اللہ سے بہت شکایت ہے۔"

وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

"میں اتنی محبت کرتی ہوں اللہ سے اور دیکھیں اللہ نے میرے ساتھ کیا کیا۔ میرے لئے دنیا کے سب سے برے آدمی کو چنا۔"

وہ اب رو رہی تھی۔

"لڑکیاں اتنا کچھ مانگتی ہیں میں نے تو کچھ بھی نہیں مانگا، صرف ایک "صالح آدمی" مانگا تھا۔

اس نے مجھے وہ تک نہیں دیا۔ کیا اللہ نے مجھے کسی صالح آدمی کے قابل نہیں سمجھا۔" وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔

"امامہ! وہ صالح آدمی ہے۔"

"آپ کیوں اسے صالح آدمی کہتے ہیں؟ وہ صالح آدمی نہیں ہے۔ میں اس کو جانتی ہوں، میں اس کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"میں بھی اس کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"آپ اس کو اتنا نہیں جانتے جتنا میں جانتی ہوں۔ وہ شراب پیتا ہے، وہ نفسیاتی مریض ہے کئی بار خودکشی کی کوشش کر چکا ہے۔ گریبان کھلا چھوڑ کر پھرتا ہے۔ عورت کو دیکھ کر اپنی نظر تک نیچی رکھنا نہیں جانتا اور آپ کہتے ہیں وہ صالح آدمی ہے؟"

"امامہ! میں اس کے ماضی کو نہیں جانتا، میں اس کے حال کو جانتا ہوں۔ وہ ان میں سے کچھ بھی نہیں کرتا جو آپ کہہ رہی ہیں۔"

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایسا کچھ نہیں کرتا۔ وہ جھوٹا اور مکار ہے۔ میں اس کو جانتی ہوں۔"

"وہ ایسا نہیں ہے۔"

"ابو! وہ ایسا ہی ہے۔"

"ہو سکتا ہے اسے واقعی آپ سے محبت ہو۔ وہ آپ کی وجہ سے تبدیل ہو گیا ہو۔"

"مجھے ایسی محبت کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اس کی نظروں سے گھن آتی ہے۔ مجھے اس کے کھلے گریبان سے گھن آتی ہے۔ میں ایسے کسی آدمی کی محبت نہیں چاہتی۔ وہ بدل نہیں سکتا۔ ایسے لوگ کبھی نہیں بدلتے۔ وہ صرف اپنے آپ کو چھپا لیتے ہیں۔"

"نہیں، سالار ایسا کچھ نہیں کر رہا۔"

"ابو! میں سالار جیسے کسی شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ وہ ہر چیز کا مذاق اڑاتا ہے۔ مذہب کا، زندگی کا، عورت کا کیا ہے جسے وہ چٹکیوں میں اڑانا نہیں جانتا۔ جس شخص کے نزدیک میرا اپنے مذہب کو چھوڑ دینا ایک حماقت ہے، جس کے نزدیک مذہب پر بات کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے جو صرف "What is next to ecstasy?" کا مطلب جاننے کے لئے خودکشیاں کرتا پھرتا ہو، جس کے نزدیک زندگی کا مقصد صرف عیش ہے۔ وہ میرے ساتھ محبت کرے بھی تو کیا صرف محبت کی بنیاد پر میں اس کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہوں؟ میں نہیں گزار سکتی۔"

"ساڑھے آٹھ سال سے وہ آپ کے ساتھ قائم ہونے والے اس اتفاقیہ رشتے کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ آپ کو آپ کے تمہارے نظریات اور عقائد کو جانتے ہوئے بھی اور وہ آپ کے انتظار میں

بھی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ آپ اس کے ساتھ رہنے پر تیار ہو جائیں گی۔ کیا ان ساری خواہشوں کے ساتھ اس نے اپنے اندر کچھ تبدیلی نہیں کی ہو گی؟"

"میں نے اس کے ساتھ زندگی نہیں گزارنی۔ میں نے اس کے ساتھ نہیں رہنا۔" وہ اب بھی اپنی بات پر مصر تھی۔ "مجھے حق ہے کہ میں اس شخص کے ساتھ نہ رہوں۔"

"لیکن اللہ یہ کیوں کر رہا ہے کہ اس شخص کو بار بار آپ کے سامنے لا رہا ہے۔ دو دفعہ آپ کا نکاح ہوا اور دونوں دفعہ اسی آدمی سے۔"

وہ ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"میں نے زندگی میں ضرور کوئی گناہ کیا ہو گا، اس لئے میرے ساتھ ایسا ہو رہا ہے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آمنہ! آپ کبھی ضد نہیں کرتی تھیں پھر اب کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" ڈاکٹر سبط علی حیران تھے۔

"آپ مجھے مجبور کریں گے تو میں آپ کی بات مان لوں گی کیونکہ آپ کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ میں تو آپ کی کسی بات کو رد کر ہی نہیں سکتی لیکن آپ اگر یہ کہیں گے کہ میں اپنی مرضی اور خوشی کے ساتھ اس کے ساتھ زندگی گزاروں تو وہ میں کبھی نہیں کر سکوں گی۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ وہ کتنا تعلیم یافتہ ہے، کتنے اچھے عہدے پر کام کر رہا ہے یا مجھے کیا دے سکتا ہے۔ آپ ایک ان پڑھ آدمی سے شادی کر دیتے لیکن وہ اچھا انسان ہوتا تو میں کبھی آپ سے کوئی شکوہ نہیں کرتی لیکن سالار، وہ آنکھوں دیکھی مکھی ہے جس کو میں اپنی خوشی سے نہیں نگل سکتی۔ آپ سالار کے بارے میں وہ جانتے ہیں، جو آپ نے سنا ہے۔ میں اس کے بارے میں جو جانتی ہوں، وہ میں نے دیکھا ہے۔ ہم پندرہ سال ایک دوسرے کے ہمسائے رہے ہیں۔ آپ تو اس کو چند سالوں سے جانتے ہیں۔"

"آمنہ! میں آپ کو مجبور کبھی نہیں کروں گا۔ یہ رشتہ آپ اپنی خوشی سے قائم رکھنا چاہیں گی تو ٹھیک ہے لیکن صرف میرے کہنے پر اسے قائم رکھنا چاہو تو ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ ایک بار سالار سے مل لیں پھر بھی اگر آپ کا یہی مطالبہ ہوا تو میں آپ کی بات مان لوں گا۔"

ڈاکٹر سبط علی بے حد سنجیدہ تھے۔

اسی وقت ملازم نے آ کر سالار کے آنے کی اطلاع دی۔ ڈاکٹر سبط علی نے اپنی گھڑی پر ایک نظر دوڑائی اور ملازم سے کہا۔

"انہیں اندر لے آؤ۔"

"یہاں؟" ملازم حیران ہوا۔

"ہاں، یہیں پر۔" ڈاکٹر سبط علی نے کہا۔

امامہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں ابھی اس طرح اس سے بات نہیں کرنا چاہتی۔"

اس کا اشارہ اپنی متورم آنکھوں اور سرخ چہرے کی طرف تھا۔

"آپ نے ابھی تک اسے دیکھا نہیں ہے۔ آپ اسے دیکھ لیں۔" انہوں نے دھیمے لہجے میں اس سے کہا۔

"یہاں نہیں، میں اندر کمرے میں سے اس کو دیکھ لوں گی۔"

وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ اس نے اسے بند نہیں کیا۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ ادھ کھلے دروازے سے لاؤنج سے آنے والی روشنی اتنی کافی نہیں تھی کہ کمرے کے اندر اچھی طرح سے دیکھا جا سکتا۔ وہ اپنے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

اپنے بیڈ پر بیٹھ کر اس نے اپنی انگلیوں سے اپنی آنکھوں کو مسلا۔ وہ جہاں بیٹھی تھی وہاں سے وہ لاؤنج کو بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ نو سال کے بعد اس نے ادھ کھلے دروازے سے لاؤنج میں اس شخص کو نمودار ہوتے دیکھا جسے وہ ایک طویل عرصہ پہلے مردہ سمجھ چکی تھی جس سے زیادہ نفرت اور گھن اسے کبھی کسی سے محسوس نہیں ہوئی تھی جسے وہ بدترین لوگوں میں سے ایک سمجھتی تھی اور جس کے نکاح میں وہ پچھلے کئی سالوں سے تھی۔

تقدیر کیا اس کے علاوہ کسی اور چیز کو کہتے ہیں؟

اپنی آنکھوں میں اترتی دھند کو اس نے انگلیوں کی پوروں سے صاف کیا۔ ڈاکٹر سبط علی اس سے گلے مل رہے تھے۔ اس کی پشت امامہ کی طرف تھی۔ اس نے معانقہ کرنے سے پہلے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پھول اور ایک پیکٹ سینٹر ٹیبل پر رکھا تھا۔ معانقے کے بعد وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور تب پہلی بار امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔

کھلا گریبان، گلے میں لٹکتی زنجیریں، ہاتھوں میں لٹکتے بینڈز، ربر بینڈ میں بندھے بالوں کی پونی، وہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ کریم کلر کے ایک سادہ شلوار سوٹ پہ واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔

"ہاں ظاہری طور پر بہت بدل گیا ہے۔" اسے دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی یقین نہیں کر سکتا کہ یہ کبھی..... اس کی سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ اب ڈاکٹر سبط علی سے باتیں کر رہا تھا۔ ڈاکٹر سبط علی اسے شادی کی مبارکباد دے رہے تھے۔ وہ وہاں بیٹھی ان دونوں کی آوازیں باسانی سن رہی تھی اور وہ ڈاکٹر سبط علی کے استفسار پر انہیں امامہ کے ساتھ ہونے والے اپنے نکاح کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ اپنے پچھتاوے کا اظہار کر رہا تھا کس طرح اس نے جلال کی شادی کے بارے میں اس سے جھوٹ بولا۔ کس طرح اس نے طلاق کے بارے میں اس سے جھوٹ بولا۔

"میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اتنی تکلیف کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ وہ میرے ذہن سے نکلتی ہی نہیں۔"

وہ شکستہ لہجے میں ڈاکٹر سبط علی کو بتا رہا تھا۔

"بہت عرصے تو میں ابنارمل رہا۔ اس نے مجھ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطے مدد مانگی تھی۔ یہ کہہ کر کہ میں ایک مسلمان ہوں، ختم نبوت پر یقین رکھنے والا مسلمان۔ میں دھوکا نہیں دوں گا اسے اور میری پستی کی انتہا دیکھیں کہ میں نے اسے دھوکا دیا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر محبت کرتی ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر گھر سے نکل آئی اور میں اس کا مذاق اڑاتا رہا، اسے پاگل سمجھتا اور کہتا رہا۔ جس رات میں اسے لاہور چھوڑنے آیا تھا، اس نے مجھ سے راستے میں کہا تھا کہ ایک دن مجھے ہر چیز کی سمجھ آ جائے گی، تب مجھے اپنی اوقات کا پتہ چل جائے گا۔"

وہ عجیب سے انداز میں ہنسا تھا۔

"اس نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ مجھے واقعی ہر چیز کی سمجھ آ گئی۔ اتنے سالوں میں، میں نے اللہ سے اتنی دعا اور توبہ کی ہے کہ "

وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔ امامہ نے اسے سینٹر ٹیبل کے شیشے کے کنارے پر اپنی انگلی پھیرتے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بعض دفعہ مجھے لگتا تھا کہ شاید میری دعا اور توبہ قبول ہو گئی۔" وہ رکا۔

"مگر اس دن میں آمنہ کے ساتھ نکاح کے کاغذات پر دستخط کر رہا تھا تو مجھے اپنی اوقات کا پتا چل گیا۔ میری دعا اور توبہ کچھ بھی قبول نہیں ہوئی۔ ایسا ہوتا تو مجھے امامہ ملتی، آمنہ نہیں۔ خواہش تو اللہ انسان کو وہ دے دیتا ہے کہ معجزوں کے علاوہ کوئی چیز جسے پورا کر ہی نہیں سکتی۔ میری خواہش دیکھیں میں نے اللہ سے کیا مانگا۔ ایک ایسی لڑکی جسے کسی اور سے محبت ہے، وہ جو مجھے اسفل السافلین سمجھتی ہے، جسے میں نو سال سے ڈھونڈ رہا ہوں مگر اس کا کچھ پتہ نہیں ہے۔

اور میں میں خواہش لئے پھر رہا ہوں اس کے ساتھ اپنی زندگی گزارنے کی۔ یوں جیسے وہ مل ہی جائے گی، یوں جیسے وہ مل گئی تو میرے ساتھ رہنے کو تیار ہی ہو جائے گی، یوں جیسے وہ جلال انصر کو بھلا چکی ہو گی۔ ولیوں جیسی اور ولیوں جیسی عبادت کرتا تو شاید اللہ میرے لئے یہ معجزے کر دیتا پر میرے جیسے آدمی کے لئے میری اوقات تو یہ ہے کہ لوگ خانہ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر بخشش مانگتے ہیں۔ میں وہاں کھڑا ہو کر بھی اسے ہی مانگتا رہا۔ شاید اللہ کو یہی برا لگا۔"

امامہ کے جسم سے ایک کرنٹ گزرا تھا۔ ایک جھماکے کی طرح وہ خواب اسے یاد آیا تھا۔

"میرے اللہ" اس نے اپنے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لئے۔ وہ بے یقینی سے سالار کو دیکھ رہی

تھی۔ وہ خواب میں اس شخص کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی۔ "کیا وہ یہ شخص تھا، یہ جو میرے سامنے بیٹھا ہے۔ یہ آدمی ؟" اس نے تب خواب میں اس آدمی کو جلال سمجھا تھا مگر اسے یاد آیا تھا جلال دراز قد نہیں تھا، وہ آدمی دراز قد تھا۔ سالار سکندر دراز قد تھا۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ جلال کی رنگت گندمی تھی۔ اس آدمی کی رنگت صاف تھی۔ سالار سکندر کی رنگت صاف تھی۔ اس نے خواب میں اس آدمی کے کندھے پر ایک تیسری چیز بھی دیکھی تھی۔ وہ تیسری چیز؟

اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنے چہرے کو مکمل طور پر ڈھانپ لیا۔

وہ معجزوں کے نہ ہونے کی باتیں کر رہا تھا اور اندر ڈاکٹر سبط علی خاموش تھے۔ وہ کیوں خاموش تھے۔ یہ صرف وہ اور امامہ جانتے تھے، سالار سکندر نہیں۔ امامہ نے اپنی آنکھیں رگڑیں اور چہرے سے ہاتھ ہٹا دیئے۔ اس نے ایک بار پھر بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اس شخص کو دیکھا۔

نہ وہ ولی تھا، نہ درویش صرف سچے دل سے توبہ کرنے والا ایک شخص تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے اسے پہلی بار احساس ہوا کہ جلال اور اس کے درمیان کیا چیز آ کر کھڑی ہو گئی تھی جس نے اتنے سالوں میں جلال کے لئے اس کی ایک بھی دعا قبول نہیں ہونے دی۔ کون سی چیز آخری وقت میں قبر کی جگہ اس کو لے آئی تھی۔

اس شخص میں کوئی نہ کوئی بات تو ایسی ہو گی کہ اس کی دعائیں قبول ہوئیں، میری نہیں۔ ہر بار مجھے پلٹا کر اسی کی طرف بھیجا گیا۔

اس نے نم آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔ اس نے ڈاکٹر سبط علی کو اسے صالح آدمی کہتے سنا۔ وہ جانتی تھی وہ یہ بات کس کے لئے کہہ رہے تھے۔ وہ سالار کو نہیں بتا رہے تھے۔ وہ امامہ کو بتا رہے تھے۔ وہ اسے صالح قرار نہ بھی دیتے تب بھی وہ اسے صالح ماننے پر مجبور تھی۔

اس کے پاس جو گواہی تھی وہ دنیا کی ہر گواہی سے بڑھ کر تھی۔ اس کے پاس جو ثبوت تھا اس کے بعد اور کسی ثبوت کی ضرورت تھی نہ گنجائش۔ اسے کیا "بتا" دیا گیا تھا، اسے کیا "جتا" دیا گیا تھا۔ وہ جانتی تھی صرف وہی جان سکتی تھی۔

افطاری کے بعد سالار اور ڈاکٹر سبط علی نماز پڑھنے کے لئے چلے گئے۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر کچن میں چلی آئی۔ ان کے آنے سے پہلے اس نے ملازم کے ساتھ مل کر کھانا لگا دیا تھا۔ سالار کی واپسی کھانے کے بعد ہوئی تھی اور اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر سبط علی جس وقت کچن میں آئے، اس وقت امامہ کچن کی میز پر بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اب بھی متورم تھیں مگر اس کا چہرہ پرسکون تھا۔

"میں نے سالار کو آپ کے بارے میں نہیں بتایا لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ اب جلد از جلد اس

سے مل کر بات کر لیں۔"

ڈاکٹر سبط علی نے اس سے کہا۔

"مجھے اس سے کوئی بات نہیں کرنی۔" وہ پانی پیتے ہوئے رُک گئی۔ "اسے اللہ نے میرے لئے منتخب کیا ہے اور میں اللہ کے انتخاب کو رد کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ اس نے کہا ہے کہ وہ تو یہ کر چکا ہے ورنہ بھی کرتا، ویسا ہی ہوتا جیسا پہلے تھا تب بھی میں اس کے پاس چلی جاتی اگر میں جان لیتی کہ اسے اللہ نے میرے لئے منتخب کیا ہے۔"

وہ اب دوبارہ پانی پی رہی تھی۔ "آپ اس سے کہیں وہ مجھے لے جائے۔"

☆ ..... ☆ ..... ☆

سالار جس وقت مغرب کی نماز پڑھ کر آیا تب تک امامہ فرقان کی بیوی کے ساتھ کھانے کی میز لگا چکی تھی۔ فرقان اور سالار کی عدم موجودگی میں اس بار آمنہ اصرار کر کے اس کے ساتھ کام کرنے لگی تھی۔

سالار کے آنے پر وہ اپنے فلیٹ جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ سالار اور امامہ نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں، مجھے بچوں کے ساتھ کھانا کھانا ہے۔ وہ بے چارے انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"آپ انہیں بھی یہیں بلوا لیں۔" سالار نے کہا۔

"نہیں بھئی، میں اس قسم کی فضول حرکت نہیں کر سکتی۔ امامہ تو پھر تمہیں پتا ہے یہاں سے جانے کا نام ہی نہیں لے گی۔" نوشین نے اپنی بیٹی کا نام لیا۔

"سالار بڑا پیار کرتا ہے امامہ کے ساتھ۔"

فرقان کی بیوی نے امامہ سے کہا۔ ایک لمحے کے لئے سالار اور امامہ کی نظریں ملیں پھر سالار برق رفتاری سے مڑ کر ٹیبل پر پڑے گلاس میں جگ سے پانی انڈیلنے لگا۔ نوشین نے حیرانی سے امامہ کے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھا مگر وہ سمجھ نہیں پائیں۔

"تم لوگ کھانا کھاؤ۔ سحری بھی میں ملازم کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔ تم لوگ کچھ تیار مت کرنا۔"

ان کے جانے کے بعد سالار دروازہ بند کر کے واپس آ گیا۔ امامہ کو مخاطب کئے بغیر وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا لیکن اس نے کھانا شروع نہیں کیا۔

امامہ چند لمحے کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر خود بھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھ جانے کے بعد سالار نے اپنے سامنے پڑی پلیٹ میں چاول نکالنا شروع کئے۔ کچھ چاول نکال لینے کے بعد اس نے دائیں ہاتھ سے چاولوں کا ایک چمچہ منہ میں ڈالا۔ چند لمحوں کے لئے امامہ کی نظر اس کے دائیں ہاتھ سے

ہوتی ہوئی اس کے چہرے پر گئی۔ سالار اس کی طرف متوجہ نہیں تھا مگر وہ جانتا تھا وہ کیا دیکھ رہی تھی۔

کھانا بہت خاموشی سے کھایا گیا۔ امامہ کو اس کی خاموشی اب بری طرح چبھنے لگی تھی۔ آخر وہ اس سے بات کیوں نہیں کر رہا تھا؟

"کیا مجھے دیکھ کر اتنا شاک لگا ہے اسے ؟ یا پھر؟"

اسے اپنی بھوک غائب ہوتی محسوس ہوئی۔ اسے اپنی پلیٹ میں موجود کھانا ختم کرنا مشکل لگنے لگا۔

سالار اس کے برعکس بہت اطمینان اور تیز رفتاری سے کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے جس وقت کھانا ختم کیا، اس وقت عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔

امامہ کے کھانا ختم کرنے کا انتظار کئے بغیر وہ میز سے اُٹھ کر اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ امامہ نے اپنی پلیٹ پیچھے سرکا دی۔

وہ میز پر پڑے برتن سمیٹنے لگی جب اس نے سالار کو تبدیل شدہ لباس میں برآمد ہوتے دیکھا۔ ایک بار پھر اسے مخاطب کئے بغیر وہ فلیٹ سے نکل گیا تھا۔ امامہ نے بچے ہوئے کھانے کو فریج میں رکھ دیا۔ برتنوں کو سنک میں رکھنے کے بعد اس نے میز صاف کی اور خود بھی نماز پڑھنے چلی گئی۔

☆ ..... ☆ ..... ☆

وہ عشاء کی نماز کے بعد جس وقت واپس لوٹا اس وقت وہ کچن میں برتن دھونے میں مصروف تھی۔ سالار اپنے پاس موجود چابی سے فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ سالار لاؤنج سے گزرتے ہوئے رُک گیا۔ کچن کے دروازے کی طرف امامہ کی پشت تھی اور وہ سنک کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا دوپٹہ لاؤنج کے صوفے پر پڑا ہوا تھا۔

سالار نے پہلی بار اسے سعیدہ اماں کے ہاں کچھ گھنٹے پہلے دوپٹے کے بغیر دیکھا تھا اور اب وہ ایک بار پھر اسے دوپٹے کے بغیر دیکھ رہا تھا۔

نو سال پہلے وضو کرتے دیکھتے ہوئے اسے پہلی بار امامہ کو اس چادر کے بغیر دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی جو وہ اوڑھے رکھتی تھی۔ نو سال بعد اس کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ اس نے نو سال میں کئی بار اسے اپنے گھر میں "محسوس" کیا تھا مگر آج جب وہ اسے وہاں "دیکھ" رہا تھا تو وہ مبہوت تھا۔ اس کے سیاہ بال ڈھیلے ڈھالے انداز میں جوڑے کی شکل میں لپیٹے گئے تھے اور سفید سوئیٹر کی پشت پر وہ یک دم بہت نمایاں ہو گئے تھے۔

نکاح نامے پر آمنہ مبین ولد ہاشم مبین احمد کو اپنی بیوی کے طور پر تسلیم کرنے کا اقرار کرتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی شک پیدا نہیں ہوا تھا نہ ہی ہاشم مبین احمد کے نام نے اسے چونکایا تھا۔ وہ سعیدہ اماں کی "بیٹی" سے شادی کر رہا تھا۔ اس کا نام امامہ ہاشم بھی ہوتا تب بھی اس کے

وہم و گمان میں بھی یہ کبھی نہیں آتا کہ یہ وہی امامہ تھی، کوئی اور نہیں اور اسے سعیدہ اماں کے صحن میں کھڑا دیکھ کر اسے ایک لمحہ کے لئے بھی شبہ نہیں رہا تھا کہ اس کا اکان کس سے ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تمہیں پتا ہے امامہ! نو سال میں کتنے دن، کتنے گھنٹے، کتنے منٹ ہوتے ہیں؟"

خاموشی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کی آواز میں جسم کو چیچ دینے والی ٹھنڈک تھی۔ امامہ نے ہونٹ بھینچتے ہوئے نل بند کر دیا۔ وہ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اتنا قریب کہ وہ اگر مڑنے کی کوشش کرتی تو اس کا کندھا ضرور اس کے سینے سے ٹکرا جاتا۔ اس نے مڑنے کی کوشش نہیں کی۔

وہ اپنی گردن کی پشت پر اس کے سانس لینے کی مدھم آواز سن سکتی تھی۔ وہ اب اس کے جواب کا منتظر تھا۔ اس کے پاس جواب نہیں تھا۔ سنک کے کناروں پر ہاتھ جمائے وہ نل سے گرتے ہوئے چند آخری قطروں کو دیکھتی رہی۔

"کیا ان سالوں میں ایک بار بھی تم نے میرے بارے میں سوچا؟ سالار کے بارے میں؟"

اس کے سوال مشکل ہوتے جا رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر چپ رہی۔

"What is next to ecstasy?" وہ جواب کا انتظار کئے بغیر کہہ رہا تھا۔

"تم نے کہا تھا pain تم نے ٹھیک کہا تھا It was pain۔"

وہ ایک لمحہ کے لئے رکا۔

"میں یہاں اس گھر میں ہر جگہ تمہیں اتنی بار دیکھ چکا ہوں کہ اب تم میرے سامنے ہو تو مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

امامہ نے سنک کے کناروں کو اور مضبوطی سے تھام لیا۔ ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو روکنے کے لئے وہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

"مجھے لگتا ہے، میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ آنکھیں کھولوں گا تو "

وہ رکا۔ امامہ نے آنکھیں بند کر لیں۔

"تو سب کچھ ہو گا، بس تم نہیں ہو گی۔ آنکھیں بند کروں گا تو "

امامہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے گال بھیگ رہے تھے۔

"تو بھی اس خواب میں دوبارہ نہیں جا پاؤں گا۔ تم وہاں بھی نہیں ہو گی، مجھے تمہیں ہاتھ لگاتے ڈر لگتا ہے۔ ہاتھ بڑھاؤں گا تو سب کچھ تحلیل ہو جائے گا جیسے پانی میں نظر آنے والا عکس۔"

وہ اس کے اتنے قریب تھا کہ ذرا جھکتا تو اس کے ہونٹ اس کے بالوں کو چھو جاتے مگر وہ اسے چھونا نہیں چاہتا تھا۔

"اور تم ہو کون امامہ ؟ آمنہ ؟ میرا وہم ؟ یا پھر کوئی معجزہ؟"

"کیا میں تمہیں یہ بتاؤں کہ مجھے مجھے تم سے "

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ امامہ کی آنکھوں سے نکلنے والا پانی اس کے چہرے کو بھگوتا ہوا اس کی ٹھوڑی سے ٹپک رہا تھا۔ وہ کیوں رکا تھا، وہ نہیں جانتی تھی مگر اسے زندگی میں کبھی خاموشی اتنی بری نہیں لگی تھی جتنی اس وقت لگی تھی۔ وہ بہت دیر خاموش رہا۔ اتنی دیر کہ وہ اسے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو گئی اور تب اسے پتا چلا وہ کیوں خاموش ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ بھی بھیگا ہوا تھا۔

وہ دونوں زندگی میں پہلی بار ایک دوسرے کو اتنے قریب سے دیکھ رہے تھے۔ اتنے قریب سے کہ وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں نظر آنے والے اپنے اپنے عکس کو بھی دیکھ سکتے تھے پھر سالار نے اس سے نظریں چرانے کی کوشش کی تھی۔

وہ اپنے ہاتھ سے اپنے چہرے کو صاف کر رہا تھا۔

"تم مجھ سے اور میں تم سے کیا چھپائیں گے سالار ! سب کچھ تو جانتے ہیں ہم ایک دوسرے کے بارے میں "

امامہ نے مدھم آواز میں کہا۔ سالار نے ہاتھ روک کر سر اٹھایا۔

"میں کچھ نہیں چھپا رہا۔ میں آنسوؤں کو صاف کر رہا ہوں تاکہ تمہیں اچھی طرح دیکھ سکوں۔ تم پھر کسی دھند میں لپٹی ہوئی نظر نہ آؤ۔"

وہ اس کے کان کی لو میں لٹکنے والے ان موتیوں کو دیکھ رہا تھا، جنہیں اس نے بہت سال پہلے بھی دیکھا تھا۔ فرق صرف یہ تھا آج وہ بہت قریب تھے۔ ایک بار ان موتیوں نے اسے بہت رلایا بھی تھا۔ وہ موتی آج بھی ہلا رہے تھے، اپنے ہر ہلکورے کے ساتھ، وہم سے جنبش جنبش سے وہم بنتے ہوئے۔

وہ اپنے کانوں کی لوؤں پر اس کی نظروں کو محسوس کر رہی تھی۔

"میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں کبھی تمہارے اتنے قریب کھڑے ہو کر تم سے بات کر رہا ہوں گا۔"

وہ مسکرایا تھا لیکن نم آنکھوں کے ساتھ امامہ نے اس کے دائیں گال میں چند لمحوں کے لئے ابھرنے والا گڑھا دیکھا۔ مسکراتے ہوئے اس کے صرف ایک گال میں ڈمپل پڑتا تھا، دائیں گال میں اور نو سال پہلے امامہ کو اس ڈمپل سے بھی بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ نو سال کے بعد اس ڈمپل نے پہلی بار عجیب سے انداز میں اسے اپنی طرف کھینچا تھا۔

"میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ میں کبھی تمہارے کان میں موجود ایئر رنگ کو ہاتھ لگاؤں گا اور تم "

وہ اب اس کے دائیں گال میں بھنور بناتے ہوئے موتی کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے روک رہا تھا۔

"اور تم تم مجھے ایک تھپڑ نہیں کھینچ مارو گی۔"

امامہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ سالار کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔ اگلے لمحے وہ کھلے چہرے کے ساتھ بے اختیار ہنسی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔

"تمہیں ابھی بھی وہ تھپڑ یاد ہے۔ وہ ایک reflex action تھا اور کچھ نہیں۔"

امامہ نے ہاتھ کی پشت سے اپنے بھیگے ہوئے گالوں کو صاف کیا۔ وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ ڈمپل ایک بار پھر نمودار ہوا۔ اس نے بہت آہستگی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے ہاتھ تھام لئے۔

"تم جاننا چاہتے ہو کہ میں اتنے سال کہاں رہی، کیا کرتی رہی، میرے بارے میں سب کچھ؟"

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ رہا تھا۔

"میں کچھ جاننا نہیں چاہتا، کچھ بھی نہیں۔ تمہارے لئے اب میرے پاس کوئی اور سوال نہیں ہے۔ میرے لئے کافی ہے کہ تم میرے سامنے کھڑی ہو، میرے سامنے تو ہو۔ میرے جیسا آدمی کسی سے کیا تحقیق کرے گا۔"

امامہ کے ہاتھ سالار کے سینے پر اس کے ہاتھوں کے نیچے دبے تھے۔ پانی نے اس کے ہاتھوں کو سرد کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی وہ کیوں اس کے ہاتھ اپنے سینے پر رکھے ہوئے تھا۔ لاشعوری طور پر وہ اس کے ہاتھوں کی ٹھنڈک ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی بڑا کسی بچے کے سرد ہاتھوں میں حرارت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کے سینے پر ہاتھ رکھے وہ سویٹر کے نیچے سے اس کے دل کی دھڑکن کو محسوس کر سکتی تھی۔ وہ بے ترتیب تھی۔ تیز پرجوش...... کچھ کہتی ہوئی کچھ کہنے کی کوشش کرتی ہوئی اس کے سینے پر ہاتھ رکھے وہ اس وقت اس کے دل تک پہنچی ہوئی تھی، اسے شبہ نہیں تھا۔

وہ شخص اس سے محبت کرتا تھا، کیوں کرتا تھا؟ اس کا جواب سامنے کھڑا ہوا شخص بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے اس شخص سے یہ سوال کیا بھی نہیں تھا۔ سالار کی آنکھیں پرسکون انداز میں بند تھیں نہ بھی ہوتیں تب بھی ان آنکھوں کو دیکھتے ہوئے اب اسے کوئی اُلجھن نہیں ہو رہی تھی۔ ان آنکھوں میں جو کچھ نو سال پہلے تھا اب نہیں تھا۔ جواب تھا وہ نو سال پہلے نہیں تھا۔

"ہم کیا ہیں، ہماری محبتیں کیا ہیں، کیا چاہتے ہیں، کیا پاتے ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی اُترنے لگی تھی۔

"جلال انصر...... اور سالار سکندر ..... خواب سے حقیقت اور حقیقت سے خواب... زندگی کیا اس کے سوا اور کچھ ہے؟"

امامہ نے آہستگی سے اپنے ہاتھ کھینچے۔ سالار نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے اُبھرنے والے تاثر کو صرف وہی پہچان سکتی تھی۔

پریشانی، اضطراب، خوف تینوں میں سے کچھ تھا۔ امامہ نے ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھا پھر سیاہ سویٹر کے گلے سے باہر نکلتے ہوئے سفید کالرز کو دیکھا۔ کچھ کہے بغیر بہت نرمی کے ساتھ اس کی گردن کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے اس نے سالار کے سینے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے پہلی بار سالار کے کولون کی ہلکی سی مہک کو محسوس کیا۔ نو سال پہلے وہ بہت تیز قسم کے پرفیومز استعمال کرتا تھا۔ نو سال بعد......؟

سالار بالکل ساکت تھا۔ یوں جیسے اسے یقین نہیں آیا ہو۔ چند لمحوں کے بعد اس نے بڑی نرمی کے ساتھ امامہ کے گرد اپنے بازو پھیلائے۔

"I am honoured" (یہ میرے لئے اعزاز ہے)۔

امامہ نے اسے مدھم آواز میں کہتے سنا۔ وہ اس کی بند آنکھوں کو نرمی سے چوم رہا تھا۔

☆ ..... ☆ ..... ☆

وہ سالار کے ساتھ خانہ کعبہ کے صحن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سالار اس کے دائیں جانب تھا۔ وہ وہاں ان کی آخری رات تھی۔ وہ پچھلے پندرہ دن سے وہاں تھے۔ کچھ دیر پہلے انہوں نے تہجد ادا کی تھی۔ وہ تہجد کے نوافل کے بعد وہاں سے چلے جایا کرتے تھے۔ آج نہیں گئے، آج وہیں بیٹھے رہے۔ ان کے اور خانہ کعبہ کے دروازے کے درمیان بہت لوگ تھے اور بہت فاصلہ تھا۔ اس کے باوجود وہ دونوں جہاں بیٹھے تھے وہاں سے وہ خانہ کعبہ کے دروازے کو بہت آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔

وہاں بیٹھتے وقت ان دونوں کے ذہن میں ایک ہی خواب تھا۔ وہ اس رات کو اب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ حرم پاک کے فرش پر اس جگہ گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے سالار سورۂ رحمٰن کی تلاوت کر رہا تھا۔ امامہ جان بوجھ کر اس کے برابر میں بیٹھنے کی بجائے بائیں جانب اس کے عقب میں بیٹھ گئی۔ سالار نے تلاوت کرتے ہوئے گردن موڑ کر اسے دیکھا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے اپنے برابر والی جگہ کی طرف اشارہ کیا۔ امامہ اُٹھ کر اس کے برابر بیٹھ گئی۔ سالار نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ اب خانہ کعبہ کے دروازے پر نظر جمائے ہوئے تھا۔

امامہ بھی خانہ کعبہ کو دیکھنے لگی۔ وہ خانہ کعبہ کو دیکھتے ہوئے اس خوش الحان آواز کو سنتی رہی جو اس کے شوہر کی تھی۔ فبای الاء ربکما تکذبان۔

اور تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

"تم جو کچھ کر رہی ہو امامہ! تم اس پر بہت پچھتاؤ گی۔ تمہارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔"

نو سال پہلے ہاشم مبین نے اس کے چہرے پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا تھا۔

"ساری دنیا کی ذلت اور رسوائی، بدنامی اور بھوک تمہارا مقدر بن جائے گی۔"

انہوں نے اس کے چہرے پر ایک اور تھپڑ مارا۔

"تمہارے جیسی لڑکیوں کو اللہ ذلیل و خوار کرتا ہے۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑتا۔"

امامہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"ایک وقت آئے گا جب تم دوبارہ ہماری طرف لوٹو گی۔ منت سماجت کرو گی۔ گڑگڑاؤ گی۔ تب ہم تمہیں دھتکار دیں گے۔ تب تم چیخ چیخ کر اپنے منہ سے اپنے گناہ کی معافی مانگو گی۔ کہو گی کہ میں غلط تھی۔"

امامہ اشکبار آنکھوں سے مسکرائی۔

"میری خواہش ہے بابا!" اس نے زیرِ لب کہا۔ "کہ زندگی میں ایک بار میں آپ کے سامنے آؤں اور آپ کو بتاؤں کہ دیکھ لیجئے، میرے چہرے پر کوئی ذلت، کوئی رسوائی نہیں ہے۔ میرے اللہ اور میرے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میری حفاظت کی۔ مجھے دنیا کے لئے تماشا نہیں بنایا، نہ دنیا میں بنایا ہے نہ ہی آخرت میں میں کسی رسوائی کا سامنا کروں گی اور میں آج اگر یہاں موجود ہوں تو صرف اس لئے کیونکہ میں سیدھے راستے پر ہوں اور یہاں بیٹھ کر میں ایک بار پھر اقرار کرتی ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں۔ ان کے بعد کوئی پیغمبر آیا ہے نہ ہی کبھی آئے گا۔ میں اقرار کرتی ہوں کہ وہی پیرِ کامل ہیں۔ میں اقرار کرتی ہوں کہ ان سے کامل ترین انسان دوسرا کوئی نہیں۔ ان کی نسل میں بھی کوئی ان کے برابر آیا ہے نہ ہی کبھی آئے گا اور میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے آنے والی زندگی میں بھی کبھی اپنے ساتھ شرک کروائے نہ ہی مجھے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برابر کسی کو لا کھڑا کرنے کی جرأت ہو۔ میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ زندگی بھر مجھے سیدھے راستے پر رکھے۔ بے شک میں اس کی کسی نعمت کو نہیں جھٹلا سکتی۔"

سالار نے سورۂ رحمٰن کی تلاوت ختم کر لی تھی۔ چند لمحوں کے لئے وہ رکا پھر سجدے میں چلا گیا۔ سجدے سے اٹھنے کے بعد وہ کھڑا ہوتے ہوئے رک گیا۔ امامہ آنکھیں بند کئے دونوں ہاتھ پھیلائے دعا کر رہی تھی۔ وہ اس کی دعا ختم ہونے کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ امامہ نے دعا ختم کی۔

سالار نے اٹھنا چاہا، وہ اٹھ نہیں سکا۔ امامہ نے بہت نرمی کے ساتھ اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ ناکہ جس سے محبت ہوئی وہ نہیں ملا۔ ایسا کیا ہے کیوں ہوتا ہے؟"

رات کے اس پچھلے پہر نرمی سے اس کا ہاتھ تھامے وہ بھیگی آنکھوں اور مسکراتے چہرے کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

"محبت میں صدق نہ ہو تو محبت نہیں ملتی۔ نو سال پہلے میں نے جب جلال سے محبت کی تو پورے صدق کے ساتھ کی۔ دعائیں، وظیفے، منتیں، کیا تھا جو میں نے نہیں کر چھوڑا مگر وہ مجھے نہیں ملا۔"

وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی۔ سالار کا ہاتھ اس کے ہاتھ کی نرم گرفت میں اس کے گھٹنے پر دھرا تھا۔

"پتا ہے کیوں؟ کیونکہ اس وقت تم بھی مجھ سے محبت کرنے لگے تھے اور تمہاری محبت میں میری محبت سے زیادہ صدق تھا۔"

سالار نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ اس کی ٹھوڑی سے ٹپکنے والے آنسو اب اس کے ہاتھ پر گر رہے تھے۔ سالار نے دوبارہ امامہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"مجھے اب لگتا ہے کہ اللہ نے مجھے بہت پیار سے بنایا تھا۔ وہ مجھے کسی ایسے شخص کو سونپنے پر تیار نہیں تھا جو میری ناقدری کرتا۔ مجھے ضائع کرتا اور جلال، وہ میرے ساتھ یہی سب کچھ کرتا۔ وہ میری قدر کبھی نہ کرتا۔ نو سال میں اللہ نے مجھے ہر حقیقت بتا دی۔ ہر شخص کا اندر اور باہر دکھا دیا اور پھر اس نے مجھے سالار سکندر کو سونپ دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تم وہ شخص ہو جس کی محبت میں صدق ہے۔ تمہارے علاوہ اور کون تھا جو مجھے یہاں لے آتا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا تم نے مجھ سے پاک محبت کی تھی۔"

وہ بے حس و حرکت اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اب اس کے ہاتھ کو نرمی سے چومتے ہوئے باری باری اپنی آنکھوں سے لگا رہی تھی۔

"مجھے تم سے کتنی محبت ہو گی، میں نہیں جانتی۔ دل پر میرا اختیار نہیں ہے مگر میں جتنی زندگی تمہارے ساتھ گزاروں گی تمہاری وفادار اور فرمانبردار رہوں گی۔ یہ میرے اختیار میں ہے۔ میں زندگی کے ہر مشکل مرحلے، ہر آزمائش میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ میں اچھے دنوں میں تمہاری زندگی میں آئی ہوں۔ میں برے دنوں میں بھی تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔" اس نے جتنی نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑا تھا اتنی نرمی سے چھوڑ دیا۔ وہ اب سر جھکائے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو صاف کر رہی تھی۔

سالار کچھ کہے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ خانہ کعبہ کے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ اسے زمین پر اتاری جانے والی صالح اور بہترین عورتوں میں سے ایک بخش دی گئی تھی۔ وہ عورت جس کے لئے نو سال اس نے ہر وقت اور ہر جگہ دعا کی تھی۔

کیا سالار سکندر کے لئے نعمتوں کی کوئی حد رہ گئی تھی اور اب جب وہ عورت اس کے ساتھ تھی تو اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کتنی بھاری ذمہ داری اپنے لئے لے بیٹھا تھا۔ اسے اس عورت کا کفیل بنا دیا گیا تھا جو نیکی اور پارسائی میں اس سے کہیں آگے تھی۔

امامہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سالار نے کچھ کہے بغیر اس کا ہاتھ تھام کر وہاں سے جانے کے لئے قدم

بڑھا دیئے۔ اسے اس عورت کی حفاظت سونپ دی گئی تھی، جس نے اپنے اختیار کی زندگی کو اس کی طرح کسی آلائش اور غلاظت میں نہیں ڈبویا، جس نے اپنی تمام جسمانی اور جذباتی کمزوریوں کے باوجود اپنی روح اور جسم کو اس کی طرح نفس کی بھینٹ نہیں چڑھایا۔ اس کا ہاتھ تھامے قدم بڑھاتے ہوئے اسے زندگی میں پہلی بار پارسائی اور تقویٰ کا مطلب سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ اس سے چند قدم پیچھے تھی۔ وہ حرم پاک میں بیٹھے اور چلتے لوگوں کی قطاروں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔

وہ اپنی پوری زندگی کو جیسے فلم کی کسی اسکرین پر چلتا دیکھ رہا تھا اور اسے بے تحاشا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ گناہوں کی ایک لمبی فہرست کے باوجود اس نے صرف اللہ کا کرم دیکھا تھا اور اس کے باوجود اس وقت کوئی اس سے زیادہ اللہ کے غضب سے خوف نہیں کھا رہا تھا۔ وہ شخص جس کا آئی کیو لیول ۱۵۰+ تھا اور جو فوٹو گرافک میموری رکھتا تھا نو سال میں جان گیا تھا کہ ان دونوں چیزوں کے ساتھ بھی زندگی کے بہت سارے مقامات پر انسان کسی اندھے کی طرح ٹھوکر کھا کر گر سکتا تھا۔ وہ بھی گرا تھا بہت بار...... بہت مقامات پر...... تب اس کا آئی کیو لیول اس کے کام آیا تھا نہ اس کی فوٹو گرافک میموری۔

ساتھ چلتی ہوئی لڑکی وہ دونوں چیزیں نہیں رکھتی تھی۔ اس کی مٹھی میں ہدایت کا ایک ننھا سا جگنو تھا اور وہ اس جگنو سے اُمڈتی روشنی کے سہارے زندگی کے ہر گھپ اندھیرے سے کوئی ٹھوکر کھائے بغیر گزر رہی تھی۔

☆......☆......☆